

عمر بن عبدالعزیز امام ابوحنیفہ امام احمد بن حنبل امام غزالی شیخ عبدالقادر جیلانی صلاح الدین ایوبی

دورِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد اور قیامِ پاکستان سے پہلے کی

اسلامی انقلابی شخصیات

تعارف، کارنامے، ملی خدمات

21

مکتبہ

انجینئر مختار فاروقی

قرآن اکیڈمی

مکتبہ

جھنگ

مولانا محمد الیاس

مولانا محمد علی جوہر

علامہ محمد اقبال

امام ابن تیمیہ

محمود غزنوی

مجدد الف ثانی

شیخ عبدالحق

اورنگزیب عالمگیر

شاہ ولی اللہ

احمد شاہ ابدالی

فتح علی میپوشہید

شاہ اسماعیل شہید

مولانا فضل حق

امداد اللہ مہاجرینی

محمود حسن شیخ الہند

عمر بن عبدالعزیز | امام ابوحنیفہ | امام احمد بن حنبل | امام غزالی | شیخ عبدالقادر جیلانی | صلاح الدین ایوبی

امام ابن تیمیہ

سلسلہ مطبوعات 7

محمود غزنوی

دورِ صحابہؓ کے بعد اور قیامِ پاکستان سے پہلے کی

سیدہ الف ثانی

اسلامی انقلابی شخصیات

21

شیخ عبدالرحمن

تعارف، کارنامے، ملی خدمات

اورنگزیب عالمگیر

مکمل

شاہ ولی اللہ

احمد شاہ ابدالی

شیخ علی بن یوسف

شاہ اسماعیل شہید

مولانا سید علی بن

ابو الیاس محمد بن

محمود حسن شاہ

مولا نا محمد الیاس

انجمن مختار فاروقی

مکتبہ قرآن اکیڈمی جھنگ

لالہ زار کالونی نمبر 2، ٹوبہ روڈ جھنگ
047-7630861
047-7630863

علامہ محمد اقبال | مولا نا محمد علی جوہر | مولا نا محمد الیاس

292-9924

جملہ حقوق بحق انجمن خدام القرآن رجسٹرڈ جھنگ محفوظ ہیں

592

114921

11

21 اسلامی انقلابی شخصیات مکمل

انجینئر مختار حسین فاروقی

مکتبہ قرآن اکیڈمی جھنگ

قرآن اکیڈمی، لالہ زار کالونی نمبر 2، ٹوبہ روڈ، جھنگ صدر

فون: 047-7630861

ای میل: hikmatbaalgha@yahoo.com

ویب سائٹ: www.hikmatbaalgha.com

اگست 2013ء بمطابق رمضان المبارک 1434ھ

500

سلطان باہو پرنٹنگ پریس فوارہ چوک جھنگ صدر

Rs.380.00

نام کتاب

تحریر

ناشر

مقام اشاعت

تاریخ اشاعت

تعداد

مطبع

قیمت

ISBN NO: 978-969-9771-04-0

انشاب

ان مسلمان خواتین و حضرات کی
سعید روحوں کے نام

✽ جنہوں نے گزشتہ ایک صدی میں
احیائے اسلام اور احیائے خلافت

کی کوششوں میں

مال اور وقت کی قربانی دی

گھریار کی قربانی دی

مصائب جھیلے وطن چھوڑا

جان بھی قربان کر دی

اور ہمارے لیے لازوال، انمٹ نقوش چھوڑے

کہ اس قافلے کو اب منزل کے قریب کر دیں اور

✽ جو آج اسی مقصد کے لیے خدا بیزار اور

خدا ناشناس۔ انسان دشمن اور اخلاق دشمن قوتوں

سے نبرد آزما ہیں اور

✽ جو آئندہ بھی اس سنگلاخ راستے پر

نکل کر کھڑے ہونے کا فیصلہ کر لیں گے

۵۹ - ۲۱ - ۲۰۱۳

خانہ

قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ:

إِنَّ اللَّهَ يُبْعَثُ لِهَذِهِ الْأُمَّةِ
عَلَى رَأْسِ كُلِّ مِائَةٍ سَنَةٍ
مَنْ يُجَدِّدُ لَهَا دِينَهَا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

بے شک اللہ تعالیٰ بھیجتا رہے گا اس امت
میں ہر سو سال پر ایسا شخص جو اس کے لیے
اس کے دین میں تجدید کر دے گا

(رواہ ابوداؤد، عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

قریب کتاب

حصہ سوم	حصہ دوم	حصہ اول
215	107	001
حضرت شاہ اسماعیل شہید	سلطان محمود غزنوی ناصر الدین	حضرت عمر بن عبدالعزیز
221	113	21
حضرت مولانا فضل حق خیر آبادی	حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی	امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت
233	123	33
حضرت امداد اللہ مہاجر کی	حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی	امام احمد بن حنبل
245	143	47
حضرت محمود حسن شیخ الہند	حضرت اورنگزیب عالمگیر محی الدین	امام غزالی محمد بن محمد
255	153	59
حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی	حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی	شیخ عبدالقادر جیلانی
271	163	67
حضرت مولانا محمد علی جوہر	حضرت احمد شاہ ابدالی	سلطان صلاح الدین ایوبی
277	175	83
حضرت علامہ محمد اقبال	سلطان فتح علی ٹیپو شہید	امام ابن تیمیہ تقی الدین
289	191	93

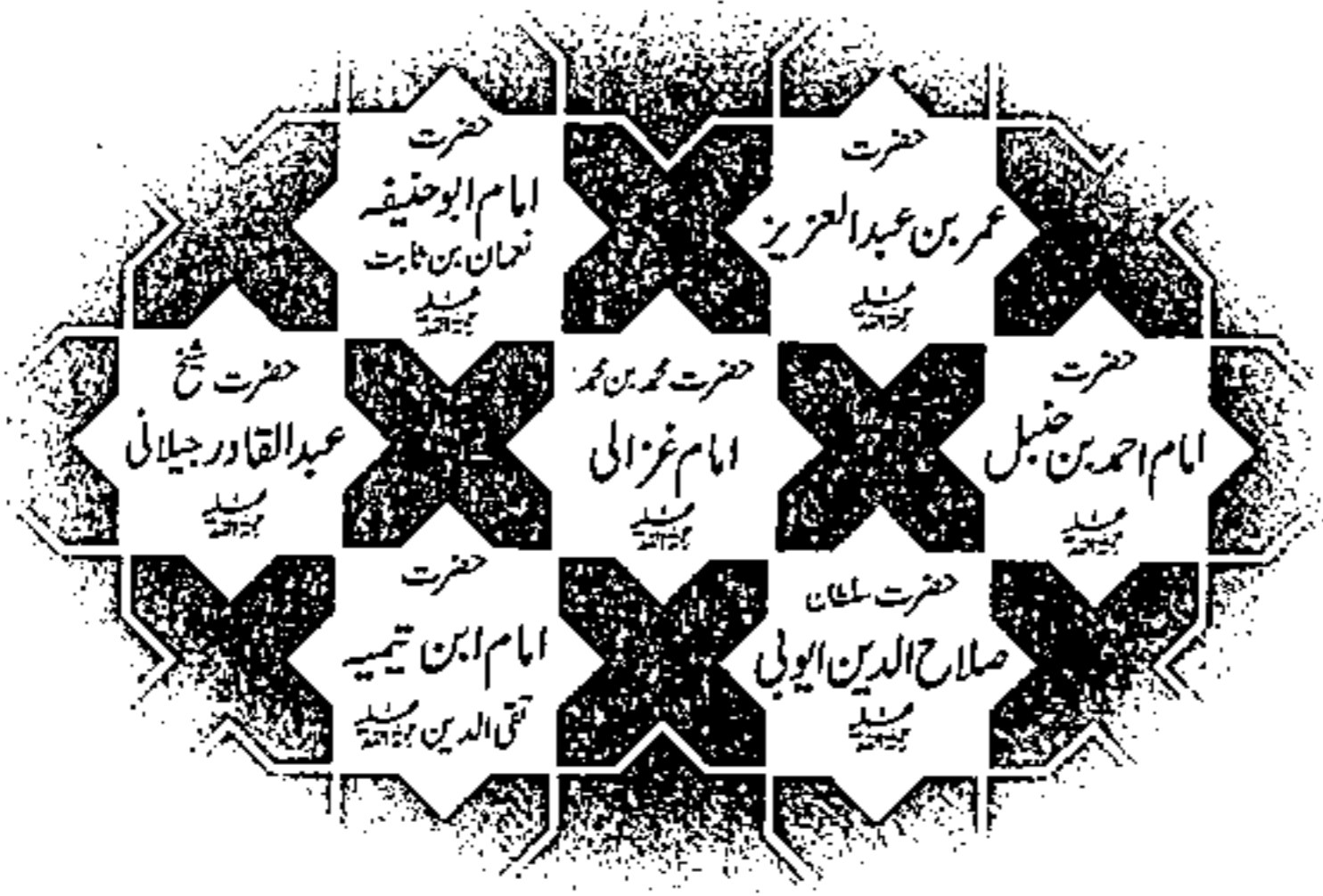
بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

یہ غسازی یہ تیرے پر اسرار بندے
 جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
 دو نیم، ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
 سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
 دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
 عجب چیز ہے لذتِ آشنائی!
 شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن
 نہ مالِ غنیمت، نہ کشورِ کشائی!
 خیابان میں ہے منتظر لالہ کب سے
 قبا چاہیے اس کو خونِ عرب سے!

فرمودہ اقبال

طریق کی اوج
 (انڈس کے میدان جنگ میں)

حصہ اول



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مشمولات

- 1 مقدمہ 6
- 2 حرف آرزو 16
- 3 حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ 21
- 4 حضرت امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت رضی اللہ عنہ 33
- 5 حضرت امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ 47
- 6 حضرت امام غزالی محمد بن محمد رضی اللہ عنہ 59
- 7 حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ 67
- 8 حضرت سلطان صلاح الدین ایوبی رضی اللہ عنہ 83
- 9 حضرت امام ابن تیمیہ رضی اللہ عنہ 93

فرمودہ اقبال

بہ بیانِ طریق

بیانا کارِ ایں امتِ بسازیم
تسارِ زندگی مردانہ بازیم!
چنان نالیم اندر مسحِ بدِ شہر
کہ دل در سینہ ملا گدازیم!

(امت مسلمہ اور ملت کا درد رکھنے والو!) آؤ کہ اس اُمت (کی بھلائی اور
بیداری) کے لیے کام کریں اور جواں مردوں کی طرح (اس کام میں)
سب کچھ جھونک دیں (تاکہ اللہ آخرت میں ہمیں سرخرو کر دے) ہم
مسلمانوں کے عوام و خواص کے سامنے یوں نالہ و فریاد کریں کہ مسلمان
اہل علم کا دل نرم کر دیں (کہ وہ بھی اس کام میں لگ جائیں)

مقدمہ

1 تلاشِ حق اور نامعلوم کو معلوم کرنے کی جستجو انسان کی فطری خواہش ہے اور ہر دور کا انسان اس باب میں اپنے حصے کا کام کرتا آ رہا ہے۔ صدیوں کے اس سفر میں انسان نے بے شمار کامیابیاں حاصل کی ہیں اور آج کا انسان بامِ عروج پر کھڑا ہے۔ بقول علامہ اقبال

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں

یہ ٹوٹا ہوا تارا کہیں مہِ کامل نہ بن جائے

پیچھے مڑ کر نگاہ ڈالیں تو — اگرچہ ہزار سال کی پہلے کی کامیابیاں 'کم تر' اور 'حقیر' محسوس ہوتی ہیں اور پچاس سیڑھیاں چڑھ کر نیچے دیکھنے والے کو ابتدائی سیڑھیاں (STEPS) بہت بے وقعت ہی نظر آتی ہیں مگر غور کرنے سے یہ حقیقت چھپی نہیں رہ سکتی کہ یہی سابقہ کامیابیاں اور ابتدائی سیڑھیاں ہی اس کا باعث بنی ہیں کہ آج ہم اعلیٰ درجے کی کامیابیاں حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں یا اونچے درجے کی سیڑھیوں پر کھڑے اپنی قسمت پر خوش اور نازاں ہیں۔

انفرادی زندگی میں جس طرح انسان بچپن، لڑکپن سے گزر کر جوانی میں قدم رکھتا ہے پھر نفسیاتی بلوغت اور علمی عروج کا دور دیکھتا ہے۔ اسی طرح مجموعی طور پر نسل انسانی بھی بچپن سے بلوغت اور بڑھاپے کا سفر طے کر رہی ہے اور اس سفر کے مختلف مراحل صدیوں پر پھیلے ہوئے ہیں اور اس کا کینوس (CANVAS) بھی بڑا وسیع ہے۔ تجرباتی علوم میں اس 'عمل' کا مشاہدہ باسانی سمجھ میں آ سکتا ہے۔ 'پہلے' کی ایجاد تاریخ انسانی کی ایک شاہکار ایجاد

ہے مگر آج کا نوجوان بادی النظر میں شاید اس بات کو کوئی اہمیت نہ دے۔ اسی طرح لکھنے پڑھنے کے لئے حروف تہجی (ALPHABET) اور اعداد و شمار (NUMBERS) کی ایجاد و اختراع بھی بہت بنیادی کام تھے۔

انہیں تجرباتی علوم کی ترقی کے ساتھ آسمانی وحی اور انبیائے کرام علیہم السلام کی تشریف آوری اور ان کی تعلیمات کی نوعیت (CONTENTS) بھی منسلک ہے۔ جب انسان ہی کو علم سکھانا ہے اور ہدایت دینی ہے تو انسان کے علمی معیار اور صلاحیتوں، ضروریات اور تقاضوں سے صرف نظر کیسے ممکن ہے۔ اس لئے ابتدائی دور کے انبیاء کرام علیہم السلام زبانی 'وحی' لائے کہ انسان نے لکھنا پڑھنا ایجاد ہی نہیں کیا تھا۔ قانون بھی بڑا سادہ تھا کہ ابھی معاشرتی، معاشی اور سیاسی جھمیلے اور جھنجھٹ نہیں تھے۔ پھر انسان نے لکھنا پڑھنا سیکھا کاغذ ایجاد کیا کتابیں بنانا سیکھیں تو اللہ تعالیٰ نے بھی تحریری 'وحی' نازل فرمائی۔ تورات، زبور، انجیل اور قرآن جیسی نادر کتابیں نازل فرما کر انسانیت کا سرخرو سے بلند کر دیا۔ ایجادات کے وسیع ہونے پر تمدنی زندگی کے پھیلاؤ سے مختلف سطحوں پر انسانی بے راہ روی میں اضافہ ہو گیا نئے ابعاد (DIMENSIONS) اور گوشے دریافت ہوئے جس کی ہدایت کے لیے بالآخر تکمیلی اور اتمی شان کے ساتھ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ختم نبوت کے اعلان کے ساتھ مبعوث فرمائے گئے اور قرآن مجید۔ جو مع نوع انسانی را پیامِ آخریں کا مصداق ہے، انسانیت کے لئے اعزاز کا باعث بنا۔ بالفاظ دیگر ختم نبوت کا اعلان اجتماعی انسانی سوچ اور فہم کی بلوغت اور فکری پختگی (MATURITY) کا اعلان تھا کہ قرآن مجید میں جن ابدی اصولوں کا بیان ہے ان کا فہم و ادراک حاصل کر کے ان اصولوں کی بنیاد پر تفصیلی خاکہ اور ڈھانچہ بنا دینا ایک عقل سلیم اور قلب سلیم رکھنے والے انسان کی پہنچ میں ہے۔ ختم نبوت کا اعلان انسان کی اعلیٰ صلاحیتوں اور تخلیقی ذہن کا اعتراف بھی تھا اور اونچے درجے کا اعتماد بھی۔

یہی وجہ ہے کہ اب ختم نبوت کے بعد انسانی رہنمائی کے لئے انسانوں کو انگلی پکڑ کر چلانے کی ضرورت نہیں رہی اور قرآن مجید کے متن میں مضمحل ہدایت کے بعید گوشے بھی انسان (وقت کے ساتھ ساتھ تجرباتی علوم کی روشنی میں) اپنی خداداد صلاحیتوں سے اخذ کرنے اور

آشکارا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ اس اُمت میں ہر صدی کے 'رأس' پر ایک مجدد بھیجتا رہے گا جو دو تین نسلوں میں فکر اسلامی پر خارجی حالات و افکار کی گرد کو اپنی مومنانہ فراست اور مجاہدانہ و انقلابی سرگرمیوں سے جھاڑ کر صاف کر دیا کرے گا۔ یاد رہے کہ کسی بھی 'مجدد' کا کام ہر زمانے کے ظروف احوال سے نکل کر مستقبل میں دو چار عشرے بعد کے حالات کی تیاری کا ہوتا رہا ہے اور ہم عصر لوگوں کی نگاہوں میں وہ 'خرقِ عادت'، انہونی بات یا انقلابی بات ہی شمار کی جاتی رہی ہے اور ان 'خلافِ رسم' اور ROUTINE کے رسوم و رواج کے خلاف اصلاحی اور تعمیری کوششوں کی ہمیشہ مخالفت بھی ہوتی رہی ہے۔ فارسی کے مشہور شاعر نظیری کے بقول

خلافِ رسم دریں عہد ز خرقِ عادت داں
کہ کار ہائے چینیں از شمار بواجبی ست!

(زمانے کی روش کے خلاف خرقِ عادت ہی ہے کہ ایسے کام ہی پہلے معجزات کہلاتے تھے اور حیرانی کا باعث ہوتے تھے)
یا بقول علامہ اقبال

آئین نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

اس مقام پر جدید و قدیم اور حال و مستقبل میں ایک نظریاتی توازن اور تسلسل برقرار رکھنا ایک 'زندہ دل' اور 'مومنانہ نگاہ' کا متقاضی ہے اور اس شان کے افراد کے لئے صرف لفظ 'مجدد' کا جامہ ہی راست آتا ہے۔ یہ اصطلاح اس دور کے تجدد پسند اور متحد دین کے نمایاں شان ہی نہیں ہے۔ اسی قسم کے مسلم زعماء اور مغرب پرست مذہبی و سیاسی رہنماؤں کے لئے علامہ اقبال نے فرمایا تھا:

شیخ او لردِ فرنگی را مرید گرچہ گوید از مقامِ بایزید

لرد انگریزی لفظ 'لارڈ' سے ماخوذ ہے۔

دولت اغیار را رحمت شمرد رقص ہا گردِ کلیسا کرد و مُرد

(آج مسلمانوں کے دینی رہنما بھی مغربی دنیا اور آسائشوں کے مرید ہیں اگرچہ گفتگو میں ایسے لگتا

ہے کہ وہ مقامِ بایزید پر کھڑے ہیں جو دنیاوی ترقی اور مغربی تعلیم کو رحمت گردانتے ہیں اور مغربی تہذیب و ترقی کے دلدادہ ہیں اور اسی میں زندگی گزار دیتے ہیں)

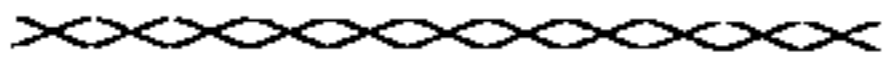
”21 اسلامی انقلابی شخصیات“ نامی اس کتاب میں ہم نے تاریخِ اسلامی کے شاداب گلستان میں سے گلہائے سرسبد یعنی ’مجددین‘ کا تذکرہ کیا جا کر دیا ہے تاکہ قارئین کرام تاریخِ اسلام پر اس پہلو سے بھی نگاہ ڈال سکیں کہ ’مسلمانوں کی تاریخ‘ اور ’مسلمان بادشاہوں کی تاریخ‘ کے ساتھ ساتھ ’حقیقی اسلام‘ یا ’احیائے اسلام‘ کے لئے سرگرم شخصیات نے کیا کیا اور کیسے حالات میں اپنی مساعی جاری رکھی ہیں، اس سفر میں کیا نشیب و فراز آئے ہیں اور آج ہم کہاں کھڑے ہیں؟

’مجددین اُمت‘ کی مساعی کے اس تذکرے کو بیانیہ انداز اور واقعاتی انداز میں کئی اہل قلم نے بیان کیا ہے ان پر ناقدانہ آراء بھی دی ہیں تاہم ہم نے اپنی ناقص رائے میں ’اسلام کی تاریخ‘ پر طائرانہ نگاہ ڈالنے والے حضرات کے لئے کچھ مواد جغرافیائی اور تاریخی پس منظر کے ساتھ بھی یکجا کر دیا ہے تاکہ کام آسان ہو جائے۔

اس ضمن میں ایک بات پیش نظر رہنی چاہیے اور یہ بات ہم نے ان سیمیناروں کے سلسلہ کے آغاز میں بھی واضح کر دی تھی جس کی بنا پر یہ تفصیلات پہلے ماہنامہ حکمت بالغہ جھنگ کے صفحات کی زینت بنیں اور ان شاء اللہ یکے بعد دیگرے تین حصوں میں افادہ عام کے لئے کتابی شکل میں شائع کی جا رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے وسائل دیے تو ان کو یکجا کر کے ایک کتاب کی صورت میں بھی شائع کرنے کی کوشش کریں گے۔ وما النصر الا من عند اللہ العظیم

وہ اہم بات ہے کہ اکیس شخصیات کی یہ فہرست کوئی ’الہامی‘ یا حتمی نہیں ہے بلکہ اپنے ’مزاج‘ اور ذوق کی بنیاد ہم نے ترتیب دی ہے۔ شخصی افتاد طبع اور مسلکی وابستگی سے مبرا ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا لہذا کوئی دوسرا صاحب علم اسی بات کے لئے اگر فہرست مرتب کرے گا تو امکانِ غالب ہے کہ وہ اس فہرست سے یکسر مختلف رہے تاہم اپنی بے نصاعتی، بے علمی اور محدود معلومات کی روشنی میں ’تاریخِ اسلام‘ کے باب میں جو بن پڑا ہے وہ ہدیہ قارئین کر رہے ہیں۔

اگر اس مختصر کاوش سے چند سعید روحوں کے دل میں بھی ماضی کے اس حیاتی عمل کی کوششوں کو جاری رکھنے کا جذبہ اور عزم بیدار ہو جائے اور وہ اپنا 'متاعِ زیست' اس راہ میں لگا دینے پر آمادہ ہو جائیں۔۔۔ تو یہ بارگاہِ خداوندی میں اس کاوش کی قبولیت کا نشان ہوگا اور اللہ تعالیٰ کے لئے یہ بات کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ ع شاہاں چہ عجب گربنوازندگدارا



2

اس کرۂ ارض پر یوں تو آج تک اربوں کی تعداد میں انسان پیدا

ہوئے اور اپنی زندگی کے شب و روز گزار کر رہی ملک عدم ہو گئے تاہم یہ بات

بڑی اہم ہے کہ انسانوں کی عظیم اکثریت صرف اپنی ذات کے لئے زندہ رہی اور وہ نان شبیہ اور ذاتی ضروریات کی فراہمی میں لگن رہ کر زندگی کا وقت پورا کر کے چلے گئے اور ان میں سے اکثر کسی ضابطہ، اصول اور اخلاق و کردار کے کسی معیار مطلوب پر بھی پورے نہیں اتر سکے۔ تاہم قلیل تعداد میں ہر دور میں ایسے لوگ رہے ہیں اور آج میں بھی ہیں جو زندگی صرف کھانے پینے اور عیش و آرام کے لئے نہیں گزارتے بلکہ کسی مشن، جذبے، اعلیٰ اقدار اور دوسروں کی فلاح و بہبود کے لئے جیتے ہیں اور اس کے لئے اپنا سب کچھ نچھاور کر دیتے ہیں حتیٰ کہ بعض تو اس راہ میں جان بھی قربان کر دیتے ہیں ایسے انسان ہی دراصل عظیم لوگ ہیں اور معراجِ انسانیت پر فائز ہیں اور جاننے والے جانتے ہیں کہ حقیقی معنی میں یہی لوگ دانا بھی ہیں اور حکیم بھی، عالم بھی ہیں اور اہل دل بھی اور انہی کا درجہ انسانیت میں بہت اعلیٰ وارفع ہے۔ ع اوگر امی تراست کو داناست ایسے اعلیٰ انسانوں میں سے بھی بلند ترین درجے میں انبیاء کرام علیہم السلام ہیں جو کامل ترین انسان، معصوم عن الخطاء، مامور من اللہ اور واجب الاطاعت تھے۔ ان انبیاء کرام علیہم السلام کی مبارک جماعت میں سے اولوا العزم پیغمبر ہیں اور ان میں سے بھی سب سے افضل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جو خاتم النبیین بھی ہیں اور خاتم المرسلین بھی، کامل بھی ہیں اور اکمل بھی، وہی اب قیامت تک کے انسانوں کے لئے اسوۂ کامل بھی ہیں اور نمونہ اور IDEAL بھی۔

ان کی لائی ہوئی کتاب ”قرآن مجید“ ہدایت اور آسمانی رہنمائی کے ضمن میں

’حرفِ آخر‘ ہے اور خالق ارض و سماء کا پیغام آخریں ہے۔ جناب رسول اکرم ﷺ نے قرآن صرف پہنچایا ہی نہیں بلکہ اس پر عمل کر کے بھی دکھایا ہے اور یوں آپ ’قرآن مجسم‘ ہیں آپ کی ہدایات اور تشریحات اور قرآن کی تفسیر اطاعت رسول کے عنوان سے ایمان کا تقاضا ہے۔

یوں تو انسانی زندگی کے بے شمار گوشے ہیں گھر، خاندان، رشتہ دار، کنبہ، قبیلہ، گلی، محلہ، شہر، کاروبار، معاملات، خوراک، اشیائے ضرورت و صحت، ہسپتال، سکول کالج، امن و امان، چوری ڈاکہ کے واقعات، عدالتیں، بازار، منڈی، کچھریاں، تھانے، الیکشن، سیاست غرض تفصیلات میں جائیں تو بے حد وسیع میدان ہے تاہم ایک تقسیم بڑی بنیادی ہے اور ہر ذہنی سطح کے آدمی کے لئے قابل فہم بھی ہے یعنی۔۔۔۔۔ انفرادی زندگی۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ اجتماعی زندگی۔

مغربی افکار کے زیر اثر آج کے ماحول میں انفرادی زندگی میں انسان کی نشست و برخاست، رہن سہن، فیملی لائف، کھانا پینا، پسند ناپسند، لباس، رشتہ داریاں، دوست، فارغ اوقات کے مشغلے آتے ہیں اور مذہب کے نام سے عقیدہ، عبادت، زندگی موت اور خوشی غمی کی رسومات بھی اسی عنوان کے تحت آتی ہیں۔ جبکہ سماجی اور معاشرتی اقدار، اخلاقی اقدار، معاشی اور اقتصادی قواعد و ضوابط اور پالیسیاں، سیاست حکومت اور سب سے بڑھ کر قانون سازی اور حاکمیت کے تصورات یہ کام اجتماعی زندگی کے دائرہ میں آتے ہیں اور اوپر درج کردہ تفصیل کے مطابق یہ مذہب کی اجارہ داری اور گرفت سے مبرا اور خارج سمجھے جاتے ہیں اور ان ایوانوں میں نہ مذہب پر بحث ہوتی ہے نہ اس کی کوئی مداخلت تسلیم کی جاتی ہے اسے اصطلاحاً سیکولر (SECULAR) اور اس سوچ و فکر اور نظام کو سیکولر ازم (SECULARISM) کہا جاتا ہے۔

گزشتہ دو صدیوں کے مغربی تسلط کے زیر اثر آج یورپی دنیا میں (ماسوائے چند محدود معاشروں کے) یہی سوچ پروان چڑھ کر پختہ ہو چکی ہے، مغرب میں تو اب اس سوچ کے تحت پروان چڑھ کر ایسی دو نسلیں عملی زندگی میں قدم رکھ چکی ہیں جو انسانی اخلاق و کردار اور مذہب کے تحت حلال و حرام کے تصورات کو فرسودہ خیال کرتی ہیں، اباحت پسندی (LIBERALISM) کی قائل ہیں یعنی ہر چیز استعمال کرو یہ حلال و حرام، سچ اور جھوٹ، اخلاق اور کردار (MORALITY) سب پرانے خیالات ہیں۔ اب آج کا امریکی معاشرہ VALUELESS

اور MORALLESS معاشرہ بن چکا ہے یعنی حیوانی معاشرہ جہاں افراد صرف جبلی تقاضوں (ANIMAL INSTINCTS) کے تحت زندگی میں بھاگ دوڑ کرتے نظر آتے ہیں۔

یہ انسانی کمزوری ہے کہ ہر دور میں عام طور پر انسان جس نظام میں زندگی گزار رہا ہوتا ہے اکثر انسان یہ سوچ رکھتے ہیں کہ شاید اس طرز زندگی کے علاوہ کوئی اور طرز زندگی ممکن نہیں ہے اور آج کے ترقی یافتہ ممالک کے شہری تو اپنی اخلاقی گراؤٹ کے باوجود بھی یقین رکھتے ہیں کہ اگر دنیا میں کوئی اور طرز زندگی ہے تو وہ فرسودہ، جاہلانہ اور انسانوں کے لئے نقصان دہ ہے لہذا جلد از جلد لوگوں کو ان جیسا طرز زندگی اختیار کر لینا چاہیے۔ اس سوچ پر مزید ایک تہہ یہ بیٹھتی ہے کہ ان معاشروں کے افراد بشمول آج کے مغربی انسان کے، ان کا یہ دور عروج ہمیشہ رہے گا اور ان کو زوال نہیں ہے اور ان کو جو عیش و آرام میسر ہے وہ کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے۔

یہ عیش و آرام کا تصور ان کی خواہش تو ہو سکتی ہے مگر یہ کائنات عیش پسند اور ظالم و جابر انسانوں نے نہیں بنائی بلکہ ایک حکیم و دانا، قادرِ مطلق، علیم و خبیر ہستی کی تخلیق ہے جس نے سب کچھ با مقصد بنایا ہے اور ہر انسان کو یہ زندگی امتحان و آزمائش کے لئے دی گئی ہے جبکہ اصل زندگی مرنے کے بعد شروع ہوگی جس میں آج کے اعمال کے مطابق سہولیات ملیں گی یا پھر سزا ہوگی۔ وہ معاشرے جو اخلاقی اقدار اور قانون الہی سے آزاد زندگی بسر کرتے ہیں بالآخر اپنے زعم میں مست ہو کر ایسے آگے بڑھتے ہیں کہ آخر کار ان کا مقدر تباہی ہوتا ہے، ایسی تہذیبیں صفحہ ہستی سے مٹ جایا کرتی ہیں۔ مصر، ہندوستان، ایران، یونان، چین غرض دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں سابقہ مقتدر اقوام اور تہذیبوں کے مدفن اور قبرستان موجود نہ ہوں۔ دست قدرت ایسے لوگوں کو ہٹا کر اپنی منشا کے مطابق زندگی گزارنے والے اور دوسروں کو اسی راہ پر چلنے کی دعوت دینے والے لوگوں کو سامنے لے آتا ہے۔

تاریخ انبیاء کرام علیہم السلام ایسے واقعات سے لبریز ہے آسمانی کتابیں بالخصوص قرآن مجید ایسے واقعات سے انسانیت کو عبرت دلاتا ہے اور ہر انسان کو اپنی عاقبت اور موت کے بعد کی زندگی کو سامنے رکھتے ہوئے دنیا میں 'ضمیر' اور 'اعلیٰ کردار' کے مطابق اور 'وحی' آسمانی کے تحت زندگی بسر کرنے کا حکم دیتا ہے۔ یہی انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات تھیں اور انہوں نے خود بھی اور ان کے

مصاحبین، حواری اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی یہی طرز زندگی اختیار کیا تھا۔

یہی کام آج سے 1400 سال قبل جزیرہ نمائے عرب میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اور ان کے ساتھیوں نے سرانجام دیا تھا اور سیکولر طرز زندگی کو روک کر زندگی کے تمام شعبوں کو اللہ تعالیٰ کے احکام اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے ماتحت کر دیا تھا اور انسانوں کو دنیا کے بجائے آخرت کی زندگی کا عاشق بنا دیا تھا۔

اگر آج ہم اپنا موازنہ اسلام سے پہلے کے جاہلی معاشرے سے کریں تو دین و دنیا اور مذہب و سیاست کی تقسیم ہماری زندگی میں بھی ہے اور وہ افراد جو مغرب اور امریکہ کے خلاف سرگرم ہیں ان کی زبان پر بھی دینی مصروفیات اور دنیوی مصروفیات اور دین اور دنیا کے علیحدہ علیحدہ خانے موجود ہیں یہ سیکولر ازم ہی کا زہر ہے جو ہمارے ذہنوں میں سرایت کر چکا ہے۔

ہمارے محبوب پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے دین و دنیا، مذہب و سیاست، انفرادی اور اجتماعی زندگی کو یکجا کر کے اور ان کی دوئی ختم کر کے آسمانی ہدایت کے تابع کر دیا تھا اور یہی بات آج کی اصطلاح میں انقلابی فکر اور یہ کام انقلاب کہلاتا ہے۔ اسی معنی میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سب سے بڑے انقلاب کے داعی اور نقیب تھے اور یوں انہیں پیغمبر انقلاب کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا۔

جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شان یکتائی اور انقلابی شان ایسی ہے کہ دنیا کی معلوم تاریخ میں ان کا کوئی ثانی اور ہم پلہ تو کیا قریب بھی نہیں پہنچا۔ آپ کے لائے ہوئے انقلاب میں کوئی ایک گوشہ نہیں بدلا، صرف سیکولر ازم کی جگہ اسلام نہیں آیا بلکہ اجتماعی زندگی اور انفرادی زندگی کے تمام شعبے اپنی سابقہ ڈگر سے اکھاڑ کر نئی راہ ”اسوۃ حسنہ“ پر ڈال دیے گئے اور اللہ کی ہدایت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے تحت زندگی رواں دواں ہو گئی۔ اس انقلاب کے رد و عمل آنے کے بعد اور آپ کی وفات کے بعد بھی آپ کے ساتھیوں اور تربیت یافتہ لوگوں نے اس انقلاب کو مستحکم کیا اور انقلاب دشمن طاقتوں کا قلع قمع کر کے ایک ایسے معاشرے کی داغ بیل ڈالی جس کے اثرات آج چودہ صدیوں بعد بھی مسلم معاشروں میں پچشم سرد کیے جاسکتے ہیں۔ یہ تھا وہ دور خلافت راشدہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ (11ھ تا 13ھ) حضرت عمر رضی اللہ عنہ (13ھ تا 24ھ) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ

(24ھ تا 35ھ) اور حضرت علی رضی اللہ عنہ (35ھ تا 40ھ)۔

یہ دور خالصتاً آسمانی بادشاہت یا نظامِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا دور تھا جس میں صرف اللہ اور اس کے رسول کے احکام کا لحاظ کیا جاتا تھا۔ اگر تقابل کریں تو مجموعی طور پر معاشرہ کے افراد میں اسلام کے پھیلاؤ اور کثیر تعداد میں لوگوں کے دائرہ اسلام میں داخل ہونے اور اسلامی انقلابی فکر کی پختگی حاصل کرنے اور ابتدائی مراحل میں ہونے کے لحاظ سے دور ابو بکر رضی اللہ عنہ میں خالص للہیت اور اتباعِ رسول کا جو درجہ تھا وہ چوتھے خلیفہ راشد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں برقرار نہ رہ سکا؛ اکابر اور اجل صحابہ رضی اللہ عنہم کا انتقال فرما جانا اپنی جگہ مگر لاکھوں نئے افراد اور سینکڑوں نئی اقوام کا حلقہ بگوش اسلام ہونا اور دشمنان اسلام کی کاسہ لپیوں کا عمل دخل بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

خَيْرُ الْقُرُونِ قَرْنِي (سب سے بہتر میرا زمانہ ہے) یقیناً بلا شک و شبہ سب سے بہتر زمانہ تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ ہے اس کے بعد ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ دورِ خلافت راشدہ ہے اور اس سے بھی ایک قدم نیچے ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ وہ دور ہے جو حضرت حسن اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے دورِ حکومت سے شروع ہوا تھا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ تو صرف چھ ماہ برسرِ اقتدار یعنی مسندِ خلافت پر متمکن رہے یہ تیسرا دور جو لسانِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے مصداق بعد کے ادوار سے بہت بہتر اور خلافت راشدہ کے درمیان ہے یہ بنو امیہ کا دورِ حکومت ہے۔ اس میں سب سے نامور اور سب سے اشرف اور ممتاز اسم گرامی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ہے جن کا دور بیس سال پر محیط ہے اور امن و امان بھی مثالی تھا اور فتوحات کا سلسلہ بھی رواں دواں تھا۔

دورِ بنو امیہ 40ھ سے 132ھ تک 92 سال ہے۔ اس عرصے میں اگرچہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد ولید بن عبد الملک کا دور بھی نمایاں اور ممتاز دور ہے مگر وہ لوگ ابھی زندہ تھے جنہوں نے دورِ صحابہ دیکھا تھا اور وہ آنکھیں ابھی بند نہیں ہوئی تھیں جنہوں نے خلافت راشدہ کے روشن دور کا نظارہ کیا تھا..... اور یہ احساس ان کے لئے 'آپ بیتی' کا درجہ رکھتا تھا لہذا عام مسلمانوں میں بھی یہ احساس پھیلتا چلا گیا کہ مسلمان معاشرہ دورِ خلافت راشدہ جیسی برکات سے محروم ہوتا جا رہا ہے اور اسلام کی مکمل انقلابی تعلیمات، مساوات، عدل و انصاف، عدلِ اجتماعی، کفالت عامہ وغیرہ کا رنگ پھیکا پڑتا جا رہا ہے جس سے خاندانی و گروہی تعصبات، ظلم اور

نا انصافی جیسے رویے جنم لے کر پروان چڑھ رہے تھے۔

یہ وہ وقت ہے کہ جب حضرت محمد ﷺ کی ایک اور پیش گوئی اور مستقبل بینی کی بصیرت باطنی کی صداقت کی چکا چوندر روشنی کے سامنے آنے کا وقت آ گیا اور وہ روشنی اور مثال یعنی ہدایت ظاہر ہو کر رہی جیسے فرمایا تھا رسول اللہ ﷺ نے کہ:

”إِنَّ اللَّهَ يُبْعَثُ فِي هَذِهِ الْأُمَّةِ عَلَى رَأْسِ كُلِّ مِائَةٍ مَنْ يُجَدِّدُ لَهَا دِينَهَا“
 ”اللہ اس امت میں ہر سو سال پر ایسا شخص بھیجتا رہے گا جو اس کے لیے اس کے دین میں تجدید کر دے گا۔“ (رواہ ابوداؤد، عن ابی ہریرۃ)

انسانی تاریخ اور سوشل سائنس کا ادنیٰ طالب بھی جانتا ہے کہ وقت کے ساتھ انسانی رویوں میں اضمحلال اور کمزوری آتی ہے اور نظریات اور اعتقادات کے میدان بھی اس سے خالی نہیں ہیں۔ یہ بات ہمارے محبوب پیغمبر نبی آخر الزمان ﷺ کی نگاہوں سے کیسے اوجھل ہو سکتی تھی اور مزید یہ کہ انسانی طرز عمل کی اتنی بڑی حقیقت سے اپنی امت کو کیسے بے خبر رکھ سکتے تھے چنانچہ اس فرمان رسالت ﷺ میں اس حقیقت کا اعتراف بھی ہے، امت کی تعلیم بھی ہے اور ساتھ ختم نبوت و رسالت کے ضمن میں تدبیر خداوندی کی ایک کڑی کاہمت بڑھانے والا اشارہ بھی ہے کہ اللہ ﷻ اس امت میں ہر سو سال کے عرصے کے اہم حصے پر ایسی شخصیات اٹھاتا رہے گا جو اسی انقلابی فکر کی حامل ہوں گی (انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اسلام کی تعلیمات سے باخبر) اور ایسی شخصیات اپنے دور میں اسلام کے روشن چہرے پر عجمی اثرات اور غیر اسلامی نظریات اور معاشرتی دباؤ کے تحت دینی اقدار کے تحفظ کے ضمن میں سستی، اضمحلال، چشم پوشی اور بد عملی جیسے عوارض کا علاج کر کے امت کے ایک معتد بہ حصے کو اسلام کی انقلابی فکر کی پٹری پر چڑھانے کا کام کریں گے۔

فقط

خاکپائے مجاہدین و غازیان و کارکنانِ غلبہ اسلام

انجینئر مختار فاروقی



حرف آرزو

اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی تائید و نصرت سے قرآن اکیڈمی جھنگ میں سلسلہ دار ماہانہ سیمیناروں میں 20 نامور اسلامی انقلابی شخصیات سے متعلق تقاریر اور خطابات میں پیش کردہ مواد کو یکجا کر کے پیش کیا جا رہا ہے تاکہ یہ قیمتی علمی ورثہ زیادہ سے زیادہ قارئین کے سامنے آسکے اور وسیع پیمانے پر لوگ اس سے استفادہ کر سکیں اس سے جہاں ہماری نئی نسل میں اسلام کی عظمت کا احساس ہوگا اور ان کے نقش قدم پر چلنے کا جذبہ پیدا ہوگا، وہاں کیا عجب کہ ”ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی“ کے مصداق، ہمارے نونہالانِ ملت سے کوئی محمد بن قاسم رضی اللہ عنہ اور کوئی صلاح الدین ایوبی رضی اللہ عنہ بن کر امت کی کشتی کو منزلِ مراد تک پہنچادے۔ یہ 21 شخصیات، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد اور قیام پاکستان سے پہلے کی ہیں جنہوں نے انفرادی اور اجتماعی سطح پر ملت کی بیداری اور اسلام کے احیاء اور غلبے کے لئے کام کیا ہے۔ یاد دہانی کے طور پر سلسلہ سیمینار کے آغاز کے موقع پر لکھا گیا ”حرف آرزو“ اس سلسلہ کے آغاز پر بھی شائع کیا جا رہا ہے تاکہ اس ضمن میں سابقہ کوششوں کے ساتھ ایک ذہنی تسلسل قائم ہو سکے۔

ان اکیس شخصیات کے انتخاب میں جن باتوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے وہ حسب ذیل ہیں:

○ بالعموم ہمارے ہاں محافل سیرت اور مجالس حمد و نعت کے ساتھ ساتھ میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پروگرام بکثرت ہوتے ہیں پھر خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے حالات پر بھی اخبارات وغیرہ میں ایڈیشن شائع ہوتے ہیں، سیمینار، کانفرنس اور مشاعرے منعقد ہوتے ہیں جبکہ تاریخ کی دیگر عظیم شخصیات کا تذکرہ دن بدن کم ہوتا جا رہا ہے لہذا ضرورت ہے کہ ان کی یاد تازہ کی جائے۔

○ ان شخصیات کے انتخاب میں انفرادی ذاتی نیکی اور اعلیٰ مقام کے ساتھ ساتھ

ملتی، اجتماعی اور سیاسی مساعی کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے ورنہ کون انکار کر سکتا ہے کہ تصوف کے لحاظ سے ترتیب میں حضرت جنید بغدادی اور بایزید بسطامی کا اسم گرامی سرفہرست ہوگا، محدثین کے حوالے سے امام بخاری اور امام مسلم کا نام نامی بہت عزت و شرف کا حامل ہے، فقہ میں امام ابوحنیفہ کے ساتھ امام شافعی، امام مالک اور حضرت جعفر صادق کے نام باعث برکت ہوں گے، اسی طرح صرف بادشاہوں کی فہرست ہو تو بہت سے نمایاں روشن ستارے ہیں۔ تاہم یہ فہرست ہمہ گیر شخصیتوں پر مشتمل ہے ہم نے نیک نیتی سے فہرست بنائی ہے تاہم اختلاف کی گنجائش رہے گی جس کا قارئین کو حق حاصل ہے۔

○ اس فہرست میں عالم عرب کے دور سے براعظم پاک و ہند کی طرف آئے ہیں لہذا گزشتہ چار صدیوں کے زعماء ملت جو پاک و ہند سے باہر ہیں وہ اس فہرست سے رہ گئے ہیں۔

اس فہرست سے مقصود صرف یہ ہے کہ ہم سب اپنی تاریخ کے ان روشن ستاروں کے حالات کو پڑھیں اور ان کے کارناموں سے آگہی حاصل کریں؛ اس لئے کہ قوم اور ملت کے لئے تاریخ ایسے ہی ہے جیسے کسی ایک فرد انسانی کے لئے حافظہ، اگر کسی حادثہ میں کسی شخص کا حافظہ خراب ہو جائے تو اس کے کرب اور دکھ کا کوئی سمجھدار آدمی ہی تصور کر سکتا ہے۔ اسی طرح جو قوم یا ملت اپنی تاریخ سے روگردانی کرے یا بھول جائے وہ کٹی پتنگ کی طرح ہے جسے کوئی طالع آزما جہاں چاہے لے جائے۔ یہ سلسلہ قرآن اکیڈمی میں ماہانہ پروگراموں کے طور پر ہوگا اور ان شاء اللہ دو سالوں میں مکمل ہوگا۔

ان محترم شخصیات کا انتخاب آج کے دور کی گروہی تقسیم سے بالاتر ہو کر کیا گیا ہے لہذا اگر ان شخصیات میں کسی ایسی شخصیت کا نام آ گیا ہے جو آپ کے نزدیک نہیں ہونا چاہیے تھا تو درگزر فرمائیں اور اگر کوئی نام آپ کی دانست میں شامل ہونا چاہیے تھا مگر شامل نہیں ہے تو بھی دل بڑا کر کے ہمیں معاف فرمائیں۔

- 1 حضرت عمر بن عبدالعزیز
- 2 امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت
- 3 امام احمد بن حنبل
- 4 امام غزالی محمد بن محمد
- 5 شیخ عبدالقادر جیلانی
- 6 سلطان صلاح الدین ایوبی
- 7 امام ابن تیمیہ تقی الدین
- 8 سلطان محمود غزنوی ناصر الدین
- 9 حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی
- 10 حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی
- 11 حضرت اورنگزیب عالمگیر محی الدین
- 12 حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی
- 13 حضرت احمد شاہ ابدالی
- 14 سلطان فتح علی ٹیپو شہید
- 15 حضرت شاہ اسماعیل شہید
- 16 حضرت مولانا فضل حق خیر آبادی
- 17 حضرت امداد اللہ مہاجرکی
- 18 حضرت محمود حسن شیخ الہند
- 19 حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی
- 20 حضرت مولانا محمد علی جوہر
- 21 حضرت علامہ محمد اقبال

دورِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد سے قیام پاکستان تک کی 21 اسلامی انقلابی شخصیات کے اسمائے گرامی



14	1301-1400AD 700-803AH	1201-1300AD 597-700AH	1101-1200AD 494-597AH	1001-1100AD 391-494AH	901-1000AD 288-391AH	801-900AD 184-288AH	701-800AD 81-184AH	601-700AD 23BH-81AH	501-600AD 126-23BH	اسلام کی تاریخ اسلامی شخصیات
		1258		دور ہونے			750	632 661 661 دور ہونے	571 خلافت راشدہ	حکمران
										علماء
										صوفیاء
										شخصیات حصہ اول

چھٹی تا چودھویں
صدی عیسوی

اسلامی تاریخ کی اہم شخصیات

1

مجدد اول، نامور منصف حکمران،
عمر ثانی، خلیفہ راشد
حضرت

عمر بن عبد العزیز

رحمۃ اللہ علیہ

ولادت : 61ھ / 681ء مدینہ منورہ میں ہوئی۔

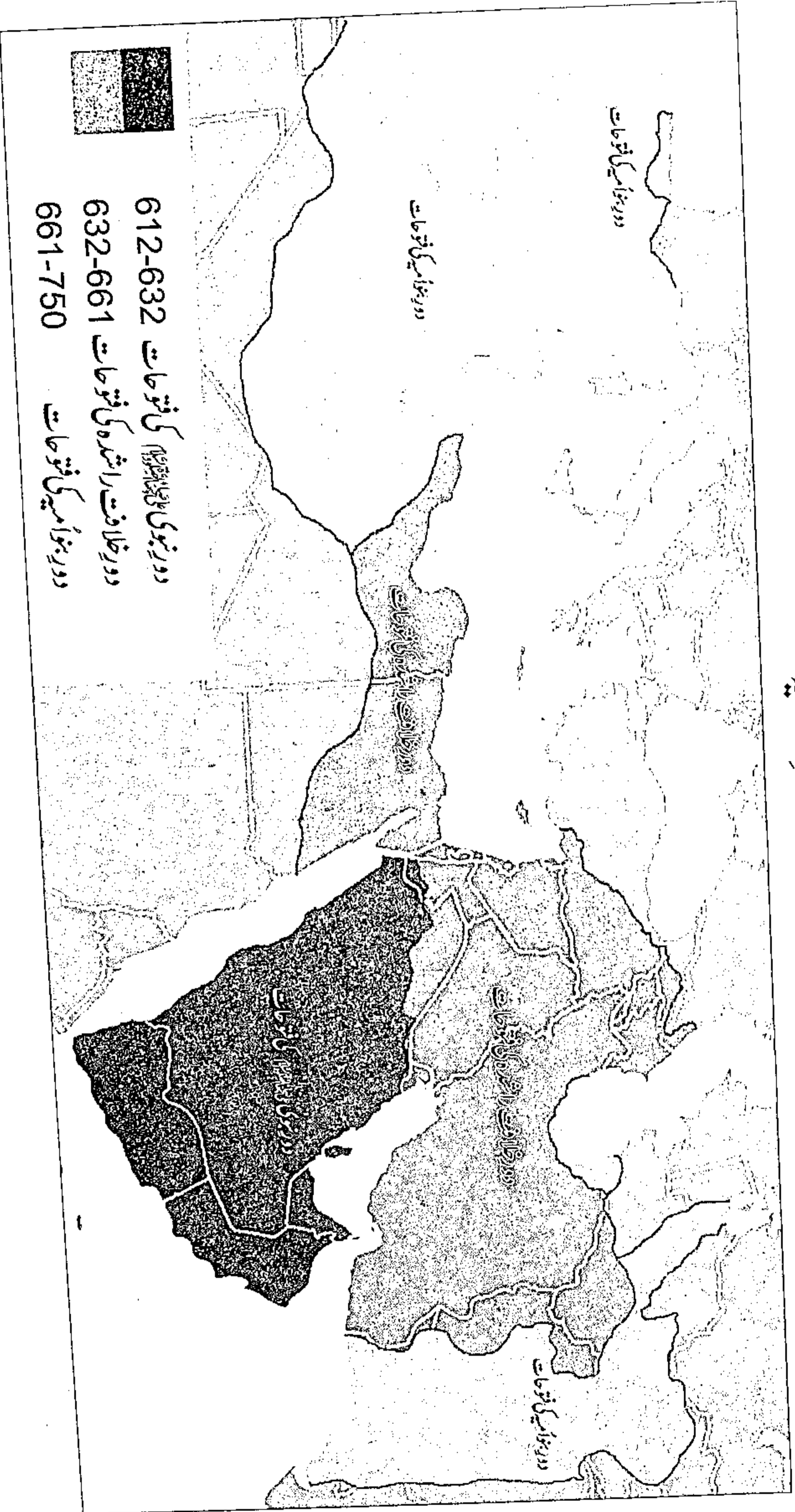
○ 87ھ / 706ء میں حجاز کے گورنر مقرر ہوئے۔

○ 99ھ میں ولی عہد نامزد کیے گئے۔

وفات : رجب 101ھ / فروری 717ء

○ حلب کے قریب دیر سمعان میں مدفون ہیں

سلطنت بنو امیہ



بنو اُمیہ کے چشم و چراغ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد خاندان بنو اُمیہ کے حکمرانوں کے گلدستہ کے سب سے خوشبودار پھول حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ ہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جماعت صحابہ رضی اللہ عنہم کی جس طرح تربیت فرمائی تھی اور دین و دنیا کو، سیاست و مذہب کو اور حکمرانی و رہبانیت کو ایک ایک انسانی پیکر میں یکجا کر دیا تھا صحابہ رضی اللہ عنہم کی تاریخ اس کی تفصیل سے بھری پڑی ہے لیکن بعد کے ادوار میں یہ یکجائی و یک رنگی قائم نہ رہ سکی اور سیرت نبوی کا عکس جمیل دھندلا ہوتا چلا گیا۔ تاہم جماعت تابعین میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ملت کے ہمدرد، خدمت خلق کے پیکر، عدل اجتماعی کے علمبردار اور ایک وسیع سلطنت کے خلیفہ ہونے کے باوصف جس درویشی اور فقر کا نمونہ بن کر جیسے وہ جریدہ عالم کے صفحات پر نقشِ دوام کا منظر پیش کرتا رہے گا۔

آپ کے حالات زندگی و دیگر ملتی و دینی کارنامے مختصراً درج ذیل ہیں:

ذاتی حالات و کوائف

ابو حفص کنیت اور عمر نام تھا۔ باپ کا نام عبدالعزیز اور ماں کا نام اُمّ عاصم تھا، جو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے بیٹے عاصم رضی اللہ عنہ کی بیٹی تھیں یوں حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے پڑنا ناتھے۔

آپ کی ولادت ثقہ روایت کے مطابق 65ھ میں مدینہ میں ہوئی اور آپ کی تربیت آپ کے والد کے زمانہ گورنری میں مصر میں آسودہ حالی کے ماحول میں ہوئی۔ ناز و نعم میں پیدا ہونے والا یہ سلیم الفطرت نوجوان ابتدا ہی سے اعلیٰ انسانی اقدار، امانت، دیانت اور شرافت کا پیکر

ثابت ہوا، فنونِ حرب اور گھڑسواری تو عرب کے خون میں شامل تھی اور وراثت میں ملی تھی ان اعلیٰ اوصاف سے متصف جب یہ مردِ جلیل عملی زندگی میں آیا تو بنو امیہ کے برسرِ اقتدار طبقہ کے عام افراد سے مختلف عادات و اطوار کا انسان ثابت ہوا۔ باپ کی وفات کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کو جہاں اپنی صلاحیتیں منوانے کا موقع ملا وہ مدینہ کی گورنری کا دور ہے۔ جب آپ کو مدینہ کے گورنری کی حیثیت سے تقرری کا موقع آیا تو آپ نے انکار کر دیا اور اس شرط پر راضی ہوئے کہ مجھ سے سابق گورنروں کے نقش قدم پر ظلم اور جبر کی توقع نہ کی جائے۔ ولید نے کہا آپ حق پر عمل کیجیے گا چاہے ہمیں ایک بھی درہم ٹیکس وصول نہ ہو۔ یہاں مدینہ منورہ آ کر آپ نے دیگر رفاہِ عامہ کے کاموں اور خدمتِ خلق کی مصروفیات کے علاوہ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعمیر و توسیع کے کام کی نگرانی کی اور اللہ کے گھر کی تعمیر میں دل و جان سے عملی حصہ لیا۔ اس جذبہٴ خدمت اور عملی دلچسپی کے ساتھ ساتھ حسن انتظام کے جو مظاہر سامنے آئے اس سے ایک طرف عوام میں آپ کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوا تو دوسری طرف دار الحکومت میں آپ کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا گیا۔ خاندانِ خلافت کا حصہ ہونا آپ کو اسلامی ریاست کے انتظامی عہدوں پر لے آیا اور نہ آپ کی ذاتی تربیت جن اصولوں پر ہوئی تھی وہ تو علماء و فضلاء کے ساتھ مسندِ تعلیم و ارشاد تھی تاہم گورنر مدینہ کی حیثیت میں بھی آپ نے علماء و فضلاء سے رابطہ رکھا اور ان سے رہنمائی لیتے رہے اور عوام کی دادرسی کے لیے علماء و فضلاء کے ذریعے سے ہی اطلاعات اور معلومات لینے کا نظام قائم کیے رکھا۔ ان بزرگوں کے فیضِ صحبت سے حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے یہ مقام حاصل کر لیا تھا کہ بڑے بڑے محدثین کو ان کے فضل و کمال کا اعتراف کرنا پڑا علامہ ذہبی رضی اللہ عنہ نے ”تذکرۃ الحفاظ“ میں ان کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

کان اماماً فقیہاً مجتہداً عارفاً بالسنن کبیر الشان ثبناً حجةً حافظاً
 ”وہ بڑے امام، بڑے فقیہ، بڑے مجتہد، حدیث کے بڑے ماہر، بڑی شان والے، معتبر، سند اور حافظ تھے“

بطورِ خلیفہ نامزدگی

اگرچہ تمام خاندان بنو امیہ مہماتِ امور میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ ہی کی

طرف رجوع کرتے تھے لیکن سلیمان بن عبد الملک کو ان پر اس قدر اعتماد تھا کہ گویا ان کو اپنا وزیر بنا لیا تھا اس مصاحبت میں اس عظیم انسان کی جو خوبیاں سلیمان کے سامنے آئیں وہی اس بات کی بنیاد بن گئیں کہ مختلف اختلافات اور رد و کدح کے بعد بالآخر ان کی بطور خلیفہ نامزدگی کا وصیت نامہ سامنے آیا۔

سلیمان بن عبد الملک کے انتقال کے بعد جب حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کی خلافت کا وصیت نامہ پڑھا گیا تو جلد ہی اتفاق ہو گیا کہ ایک اہل شخص کو اس کا حق مل گیا، آپ نے سلیمان کا جنازہ پڑھایا۔ بار خلافت کے تصور سے آپ نہایت متردد اور متفکر ہو گئے چنانچہ ایک استفسار پر آپ نے فرمایا:

”تشویشناک بات یہی ہے کہ مشرق و مغرب میں امت محمدیہ کا کوئی فرد ایسا نہیں ہے جس کا مجھ پر حق نہ ہو اور بغیر مطالبہ و اطلاع اس کا پورا کرنا مجھ پر فرض نہ ہو۔“

بالآخر آپ مسجد میں تشریف لائے اور منبر پر ایک خطبہ ارشاد فرمایا۔

موروثی خلافت نہیں عوامی خلافت

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام تو اعلیٰ خلقت کی حامل اور منفرد شخصیات کے مالک ہوتے ہی تھے پھر ان میں کامل ترین رسول اور کامل ترین نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب اور ساتھی بھی اولادِ آدم میں انفرادیت کے حامل ہیں کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ تھے اور اس فضل و کمال میں بعد کے لوگوں میں سے کوئی بھی ان کا سہیم اور شریک نہیں ہے ان کی خاص تربیت کا نتیجہ ہے کہ دین کے معاملے میں ننگی تلوار اور حق کے معاملے میں عدل و انصاف کے علمبردار تھے۔ ان کے ہاتھ سے کسی کی نامزدگی میں بھی ایک حسن اور لطافت کا پہلو تھا اور حق و انصاف کا دامن بھی ہاتھ سے نہ جاتا تھا مگر دور صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد یہ نامزدگی موروثیت میں تبدیل ہوتی چلی گئی اور اس میں استحقاق اور اہلیت پر نگاہ کم اور عصبیت اور رشتہ داری پر زیادہ ہوتی جا رہی تھی۔ تا آنکہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کا معاملہ سامنے آیا تو پہلے عوامی خطبہ میں آپ نے ارشاد فرمایا:

”لوگو! مجھ پر خلافت کا بار بغیر اس کے کہ مجھ سے رائے لی جاتی یا میں اس کا خواستگار

ہوتا یا عام مسلمانوں سے مشورہ لیا جاتا، ڈال دیا گیا ہے میری بیعت کا جو قلابہ تمہاری گردنوں میں ہے میں خود اس کو نکال لیتا ہوں اب جس کو چاہو خلیفہ مقرر کر لو، یہ موروثی خلافت اور امارت کا انقطاع تھا۔ اس خطبہ کو سن کر سارے مجمع نے باواز بلند کہا: ہم نے آپ کو اپنا خلیفہ منتخب کیا اور آپ کی خلافت پر راضی ہوئے۔ یقیناً اس اجتماع میں وہ بھی تھے جو پہلے آپ کے خلیفہ بنائے جانے پر راضی نہ تھے اور صرف دیکھنے آئے تھے کہ کیا ہوتا ہے؟ اس پر شور و غل ہوا اور مسجد میں ہنگامی حالت کی سی کیفیت پیدا ہو گئی جب سکون ہوا اور لوگ آپ کی خلافت پر مطمئن ہو گئے تو آپ نے اللہ ﷻ کی حمد اور حضرت محمد ﷺ پر صلوة و سلام کہتے ہوئے ایک مفصل تقریر فرمائی جس میں تقویٰ، فکرِ آخرت اور تذکرہ موت کی طرف توجہ دلائی اور پھر فرمایا:

”جو شخص اللہ کی اطاعت کرے گا اس کی اطاعت واجب ہے اور جو شخص اللہ کی نافرمانی کرے گا اس کی اطاعت جائز نہیں۔ جب تک میں اللہ کی اطاعت کروں میری اطاعت کرنا اور اگر میں نافرمانی کروں تو میری اطاعت تم پر لازم نہیں۔“

یوں — موروثی خلافت و حکمرانی سے بات استحقاق اور ”أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمْنَتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا“ کی روح تک جا پہنچی اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں ”حقیقی خلافت“ کے دھندلے نقوش دوبارہ سنوار کر اور عدل و انصاف اور کفالت عامہ کی ذمہ داری پوری کر کے ’خلافت راشدہ‘ کی یاد تازہ کر دی جسے اپنے اور بیگانے سب تسلیم کرتے ہیں حتیٰ کہ ’خوارج‘ نے بھی آپ کی خلافت کو تسلیم کر لیا۔

خلافت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے خدو خال

1 خلافت راشدہ کے نقش قدم پر

آپ نے خلافت کا بار اٹھاتے ہی کئی کام انجام دیے جو سب کے سب نہایت اہم اور واقع ہیں اور ایسے کام وہی شخص کر سکتا ہے جو دل میں خوفِ خدا اور آخرت میں جو ابد ہی کا گہرا احساس رکھتا ہو اور مزید برآں عوامی مسائل اور دکھوں کا ادراک اور ان مسائل کے حل کے لیے

قرآن و سنت اور آثار صحابہ رضی اللہ عنہم سے رجوع کے ساتھ قرآنی حکم کو نوشتہ دیوار سمجھنا ہو نیز خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کو اپنا آئیڈیل سمجھنا ہو۔ چنانچہ طبقات ابن سعد میں ہے کہ آپ نے ایک خط میں اپنے ذہن اور پالیسی کا یوں اظہار فرمایا:

وقد رأيت ان اسير في الناس بسيرة عمر بن الخطاب رضي الله عنه ان قضى الله ذلك واستطعت اليه سبيلا فابعث الي بكتب عمر و قضائه في اهل القبلة و اهل العهد فاني متبع اثره و سائر بسيرته ان شاء الله تعالى (سیرت عمر بن عبدالعزیز)

”میں چاہتا ہوں کہ رعایا کے معاملے میں حضرت عمر بن الخطاب رضي الله عنه کی روش اختیار کروں۔ بشرطیکہ یہ خدا کو منظور ہو اور میں اس پر قادر ہوں۔ آپ میرے پاس حضرت عمر رضي الله عنه کی تحریریں اور ان کے فیصلے جو انہوں نے مسلمانوں اور ذمیوں کے متعلق کیے ہیں، بھیج دیجیے۔ اگر خدا کو منظور ہوگا تو میں ان کے نقش قدم پر چلوں گا“

اگرچہ اس روش کے اختیار کرنے کے لیے آپ کا زمانہ اس قدر ناموزوں تھا کہ نہ 11ھ تا 35ھ کے دور کی عوام تھی اور نہ ارباب اختیار تاہم آپ نے اس کا بیڑا اٹھایا اور نمایاں حد تک اس کا رنامے کو کر دکھایا کہ اپنے پرانے انگشت بدنداں رہ گئے۔

2 اموال معصوبہ کی واپسی

حضرت عمر بن خطاب رضي الله عنه کے کارہائے نمایاں میں عراق کی زمینوں کی فتح پر ان کو مال غنیمت قرار دینے کی بجائے خراجی زمین یعنی STATE LANDS قرار دینا تھا جو اہلیت اور مقاصد کی تکمیل تک عارضی طور پر کسی کو بھی دی جاسکتی تھی۔

مگر انسانی معاشرتی رویے اور انسانی نفسیات تو ہر جگہ کام کرتے ہیں۔ جب زمانہ ’خَيْرُ الْقُرُونِ قَرْنِي‘ سے ’ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ‘ میں داخل ہوا تو فرمان رسالت کے مطابق اگلی نسل میں ماحول وہ نہ رہا۔ جب تاریخ کے بہاؤ میں مزید ’ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ‘ کا دور آیا تو ’خَيْرُ الْقُرُونِ قَرْنِي‘ کے مقابلے اسلامی اقدار، اجتماعی عدل و انصاف اور کفالت عامہ کا تصور مزید دھندلا ہو گیا حضرت عمر بن خطاب رضي الله عنه کے پون صدی بعد جب حضرت عمر بن عبدالعزیز رضي الله عنه کا

دور آیا تو عوام اور ارباب اختیار بعد والوں سے بہت بہتر مگر پہلوں سے پیچھے تھے۔
سرکاری خزانہ اعلیٰ رہائش گاہوں، محلات، آرام و آسائش پر صرف ہونے لگا تھا اور
سرکاری زمین مستقل ذریعہ آمدنی کے طور پر مقتدر طبقہ اپنے اعزہ و اقارب کو جاگیر عطا کر دیتے
تھے تاکہ حکومت مضبوط ہو اور خاندان مفادات کی خاطر ہی سہی جڑا رہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے اس کو کافی پہلے محسوس کر لیا تھا اور اس کے اثرات بد
سے بھی خوب آگاہ تھے۔ لہذا جیسے ہی انہوں نے زمام خلافت سنبھالی اموالِ مغصوبہ اور جاگیریں
ضبط کر کے بیت المال میں جمع کرادیں اور آغاز خود اپنی جاگیر اور گھر کے مال سے کیا۔

یہ بات بنو امیہ کے شہزادوں رئیسوں مقتدر طبقہ کے اعزہ و اقرباء کو سخت ناگوار گزری اور
اس سے وہ مستقبل میں آسودگی کے دور کو اپنے پاؤں کے نیچے سے کھسکتا دیکھ کر تلملا اٹھے اور اس کا
بارہا اور مختلف مقتدر لوگوں کے ذریعے اظہار بھی کیا گیا مگر — قربان جائے اس مرد درویش
حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ پر، جو چٹان بن کر کھڑا رہا اور ان کے اہل بیت اور اولاد پر، کہ وہ بھی
درد کو محسوس کرتے ہوئے اس کو برداشت کیے رہے اور آخرت کے اعلیٰ مراتب پا گئے۔

ع خدارحمت کنند ایں عاشقان پاک طینت را

3 ذمیوں کے حقوق کی ادائیگی

محلوم غیر مسلم اقلیتیں اہل اسلام سے چودہ صدیوں کا میل جول رکھتی ہیں اور اس
معاملے میں اسلام کے اعلیٰ معیار خلافت راشدہ کے مقابلے میں چاہے بعد کے ادوار میں کمی
آتی چلی گئی تاہم ذمیوں کے حقوق کے بارے میں تاریخ اسلام اس قدر روشن، تابناک اور
زریں حروف سے رقم ہے کہ اپنوں سے زیادہ بیگانے اس کے معترف ہیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے چونکہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو اپنا آئیڈیل
قرار دیا تھا؛ لہذا پہلی صدی ہجری کے اختتام تک ذمیوں اور غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق کے بارے
کچھ ناروا باتیں سامنے آئی تھیں حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے ان کی اصلاح فرمائی اور اس
ضمن میں ہر قسم کے ظلم اور امتیاز اور جبر کا یکسر خاتمہ کر دیا جس سے اسلامی ریاست کے طول
وعرض میں عدل و انصاف کے حصول پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

آسمانی ہدایت اور انبیائے کرام علیہم السلام کی تعلیمات میں اللہ کی رضا کے لیے عبادت کے ساتھ اجتماعی سطح پر حکومت کا حصول اور اسلام کا غلبہ ناگزیر ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کے احکام پر کامل طریقے سے عمل ہو سکے۔ اس کامل اور مکمل عمل درآمد کا اہم گوشہ اسلامی ریاست میں رہنے والے ہر شہری کی کفالت ہے چاہے وہ مسلم ہو یا غیر مسلم۔

خلافت راشدہ کے کچھ عرصہ بعد سے یہ تصور دھندلا ہوتے ہوتے برائے نام رہ گیا تھا حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے اس کفالت عامہ کے تصور کو اجاگر کیا اور حکومت کے بیت المال کو جو جاگیروں کی واپسی سے بھر چکا تھا عوام اور بے سہارا لوگوں کی بہبود کے لیے لٹا دیا اور ہر مسلم و غیر مسلم کی کفالت کا انتظام کر دیا۔

یاد رہے کہ اسلام کی تعلیمات میں کفالت عامہ کا یہ تصور بعد کے مسلم حکمرانوں نے قائم نہ رکھا اور عوام کی کفالت کے لیے حاصل شدہ رقوم سے ہمارے جابر و ظالم، عیاش اور فاسق بادشاہ بڑے بڑے محلات اور حرم بنا کر تاج محل قسم کی تعمیرات پر یہ رقم لٹاتے رہے اور عوام کا پیسہ ان کے حقوق کی بازیافت اور ان کی کفالت کے لئے خرچ نہ کرتے۔ اسی بات کی طرف اشارہ کیا تھا جناب علامہ اقبال نے اپنے خطبہ الہ آباد میں کہ :

”میں پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کو متحد ہو کر ایک واحد ریاست کی شکل میں دیکھنا چاہتا ہوں، جس کی اپنی حکومت ہو خواہ سلطنت برطانیہ کے تحت یا اس سے الگ۔ اور مجھے نظر آ رہا ہے کہ یہ متحدہ شمال مغربی مسلم ریاست کم از کم شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے تقدیر مبرم ہے۔“

مزید برآں وہ فرماتے ہیں:

”لہذا میں ہندوستان اور اسلام کے بہترین مفاد میں ایک الگ مسلم ریاست کے بنانے کا مطالبہ کرتا ہوں۔“

اور اس ضمن میں وہ یہ بات کہتے ہیں کہ:

”اسلام کے لئے یہ ایک موقع ہوگا کہ عرب بلوکیٹ کے تحت اس پر جو پردے پڑ گئے

تھے ان سے چھٹکارا حاصل کر سکے اور اپنے قوانین، تعلیمات اور ثقافت کو اپنی اصل روح کے ساتھ روح عصر سے ہم آہنگ کر سکے۔

یہ تصور آج بھی تشنہ تکمیل ہے اگرچہ امت کے خوابوں اور ارمانوں میں یہ بات رچی بسی ہے کہ اسلام کی ایسی تعلیمات سے ہی بالآخر انسانیت کے دکھوں کا مداوا ہو سکتا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد ملک کے مختلف مکاتب فکر کے نامور 31 علماء نے 22 متفقہ نکات پیش کیے تھے کہ یہ ہمارے نزدیک اسلام کا تصور ہے جو پاکستان میں قائم ہونا چاہیے جس میں کفالت عامہ کا تصور سب سے نمایاں تھا۔

یاد رہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسی کفالت عامہ کے تصور سے ماخوذ برطانیہ کا بیروزگاری الاؤنس کا تصور ہے یا امریکی شہری کے لیے امداد (SUBSISTANCE ALLOWANCE) ہے یا شمالی یورپ کے ممالک میں ”عمرالذ“ کے نام سے کفالت عامہ کا وہ تصور رائج ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نام سے ماخوذ ہے۔ یاد رہے کہ اسی کفالت عامہ کے اعلیٰ تصور ہی کی وجہ سے ان SCANDINAVIAN COUNTRIES کی SOCIAL DEMOCRACY اب تک کی انسانی ترقی کی معراج سمجھی جاتی ہے۔ یہ نیرنگی زمانہ ہے کہ یہی ممالک (ڈنمارک وغیرہ) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے گستاخانہ خاکے بنانے میں پیش پیش ہیں۔ اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ڈنمارک وغیرہ نے اسلام کے کفالت عامہ کا تصور چرا کر دنیا میں عزت حاصل کر لی ہے اور اگر حقیقی اسلام پھیل گیا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات عام ہو گئیں تو اسلامی ریاست میں امن و امان، عدل و انصاف، کفالت عامہ اور بے کسوں اور معذوروں کے حقوق کی کس قدر نگہداشت ہوگی وہ تصور سے باہر ہے۔ یہ بات ہم مسلمانوں کے سوچنے کی ہے۔

5 ذاتی ایثار درویش حکمران

آج کا تعلیم یافتہ طبقہ اور مغربی ممالک شاید تصور بھی نہیں کر سکتے کہ حکمرانی اور درویشی اکٹھے ہو سکتے ہیں یا ایک شخصیت میں سما سکتے ہیں اگرچہ طالبان نے افغانستان میں حکمرانی کے دور میں مختصر مدت کے لیے مغرب کی آنکھیں چندھیادی تھیں مگر اہل مغرب نے اپنی طاقت کے نشے میں طالبان کے نظام حکومت کو STUDY کرنے کی بجائے اس حکومت کو ہی ختم کر دیا

لیکن وہ مثال اپنی جگہ ایک اٹل حقیقت تھی۔ بقول علامہ اقبال ع ”عجم ہنوز نہ داند رموز دین ورنہ“ کے مصداق، اگر مغرب خلافت راشدہ کے اصولوں کو عام کرنے میں مسلمانوں کو برداشت کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ مختصر وقت میں انسانی دکھوں کا مداوانہ ہو سکے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے اس ضمن میں بھی لازوال ایثار کر کے مثال قائم کر دی اور اللہ نے ان کو وہ عزت دی کہ وہ عمر ثانی کا لقب پا گئے اور زبان خلق کو نقارہ خدا سمجھیں تو دنیا و آخرت میں بہت اعلیٰ درجات پائیں گے کئی احادیث ان کے اعلیٰ مقام و مرتبہ پر دال ہیں۔

پہلی صدی کے مجدد

اہل علم جانتے ہیں کہ امت مسلمہ میں ختم نبوت کا تصور نہایت بنیادی ہے اور عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس انقطاع نبوت کے بعد امت کی اجتماعی اصلاح کے لیے جو انتظام فرمائے ان میں قرآن مجید کی حفاظت، امت کا گمراہی پر کبھی نہ جمع ہونا اور علماء حق کا ہمیشہ موجود رہنا نمایاں ہیں انہیں میں سے ایک خدائی تدبیر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں یہ ہے:

إِنَّ اللَّهَ يَبْعَثُ فِي هَذِهِ الْأُمَّةِ عَلَى رَأْسِ كُلِّ مِائَةٍ مَنْ يُجَدِّدُ لَهَا دِينَهَا
 ”اللہ اس امت میں ہر سو سال پر ایسا شخص بھیجتا ہے گا جو اس کے لیے اس کے دین
 میں تجدید کر دے گا۔“ (رواہ ابوداؤد، عن ابی ہریرۃ)

چنانچہ اس کے نتیجہ میں مجددین کا ایک سلسلہ ہے جس سے اہل علم و فضل واقف ہیں۔ اس قول فیصل کی روشنی میں نگاہ دوڑائیں تو حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کا دور خلافت 99ھ تا 101ھ ہے جو پہلی صدی ہجری کا اختتام اور دوسری ہجری کا آغاز ہے اور آپ نے اسلام کی اجتماعی سطح پر تعلیمات میں تجدید کا کارنامہ بھی ببا ننگ دہل سرانجام دیا لہذا بلا خوف تردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ پہلی صدی ہجری کے مجدد ہیں حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ۔ اللہ تعالیٰ ان پر بے شمار رحمتیں نازل فرمائے اور کروڑوں سلام بخشے اور ہمارے مقتدر حضرات کو بھی آج کے دور میں ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ع ایس دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

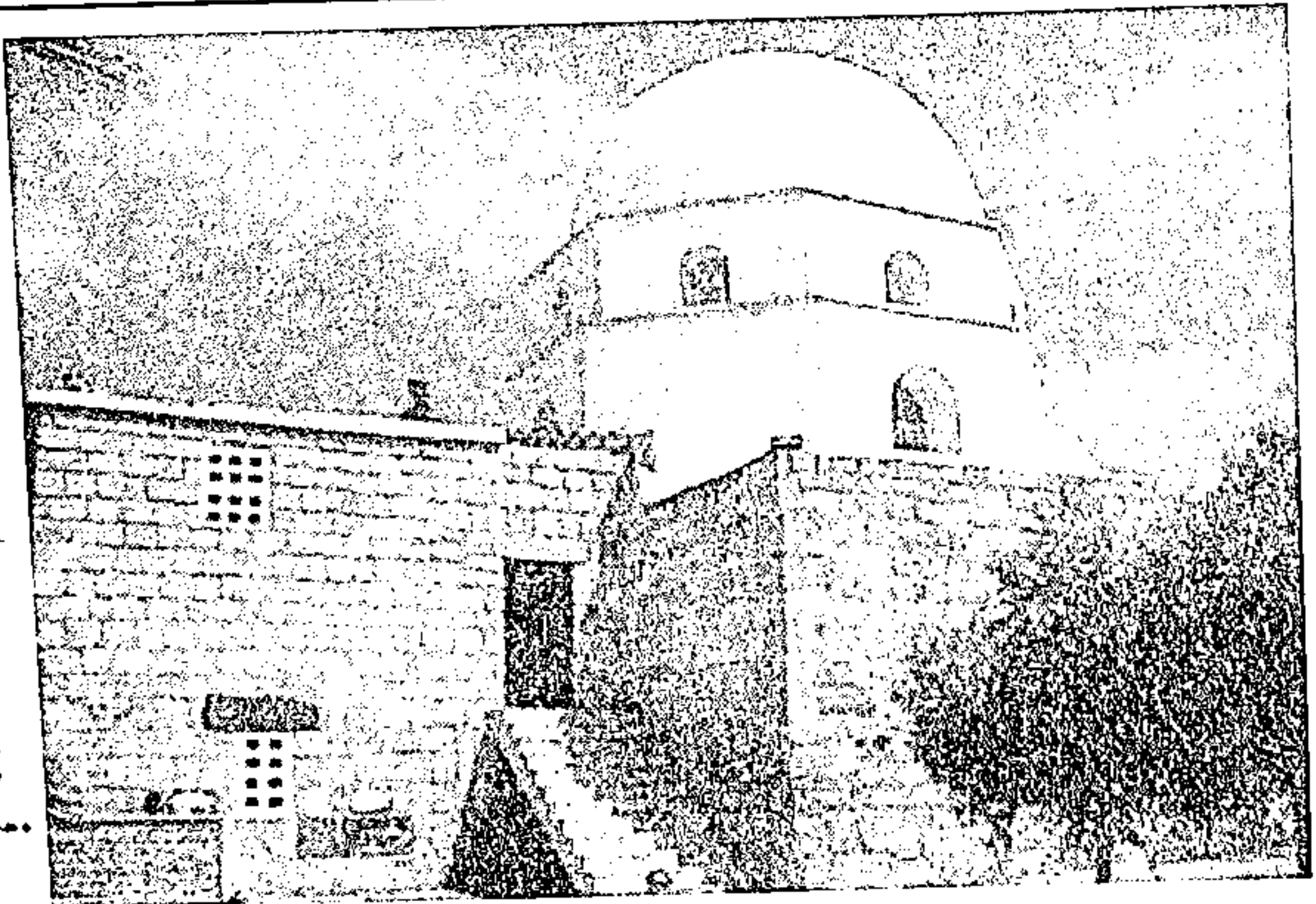


حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے بارے میں رومی بادشاہ کا تبصرہ

حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے انتقال کی خبر جب شاہِ روم نے سنی تو تخت سے اتر کر فرش پر آ بیٹھا، سر سے اپنا تاج اُتار دیا اور اتنا رنجیدہ ہوا جیسے اس کا کوئی اپنا انتقال کر گیا ہو۔ پھر مسلمانوں کے سفیر سے مخاطب ہو کر کہنے لگا:

”مجھے اس کی اچھی عاتوں اور پاک سیرت کی اطلاعات بکثرت ملی ہیں، اگر لوگ مجھ سے کہتے کہ وہ مردوں کو زندہ کر سکتا ہے تو میں مان لیتا، مجھے اس راہب پر تعجب ہوتا ہے، دنیا جس کے پاؤں تلے بچھ گئی مگر اس نے زہد اختیار کر لیا۔“ (عظیم شخصیات کے آخری لمحات، تالیف، خواجہ طاہر محمود کوریجہ)

When the Khalifah died the Roman Emperor is reported to have said: "I should not be the least surprised if a monk renounces the world and busies himself in worship behind closed doors, but I am simply amazed at this man who has a vast empire at his feet but he rejected it and lived the life of a monk..." (www.islamicboard.com)



مدینہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ، در سمرقان (شام)



بے مثال قانون دان، سید الفقہاء، حافظ حدود اللہ

حضرت نعمان بن ثابت

المعروف بہ

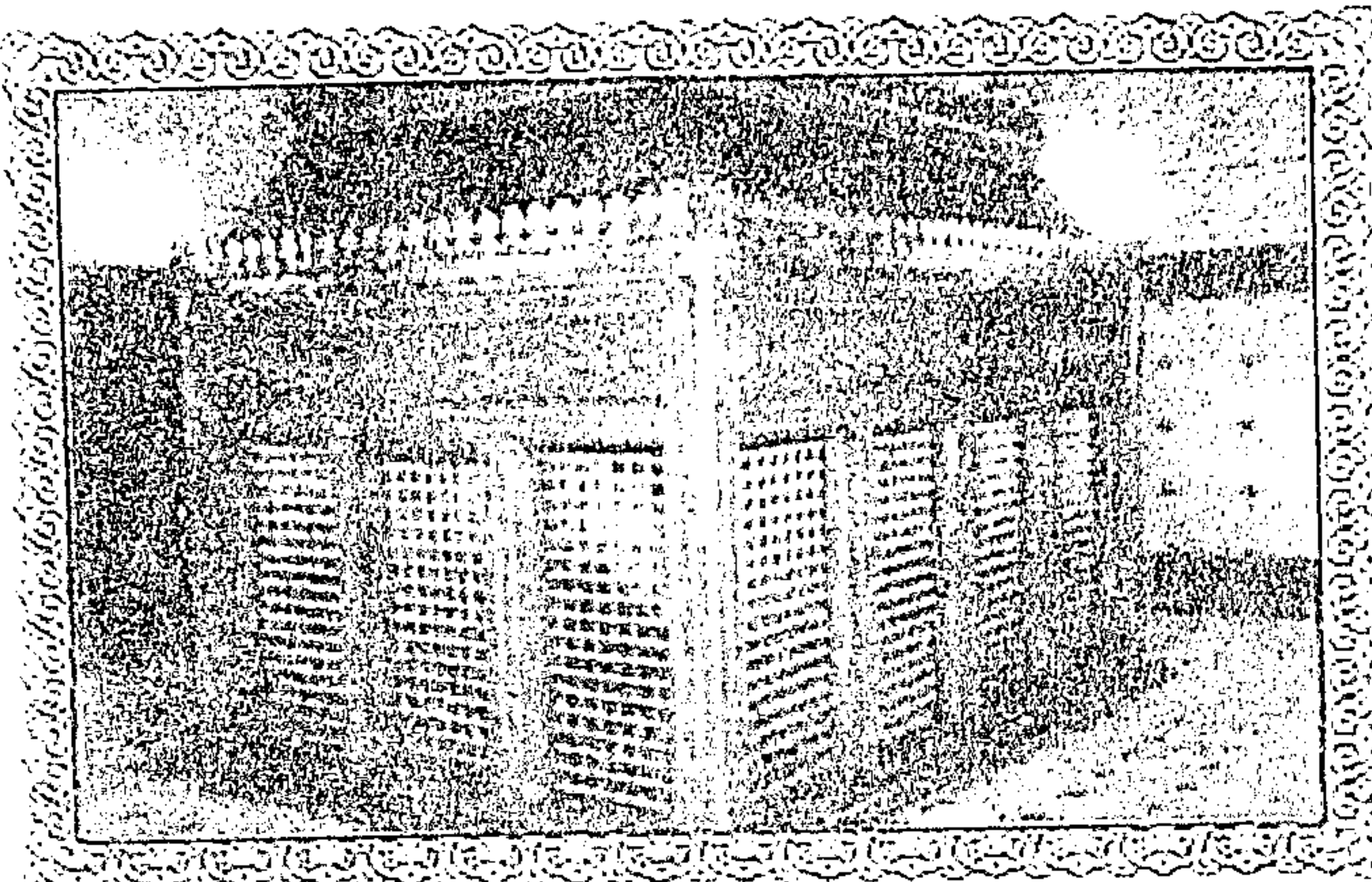
امام ابو حنیفہ

رحمۃ اللہ علیہ

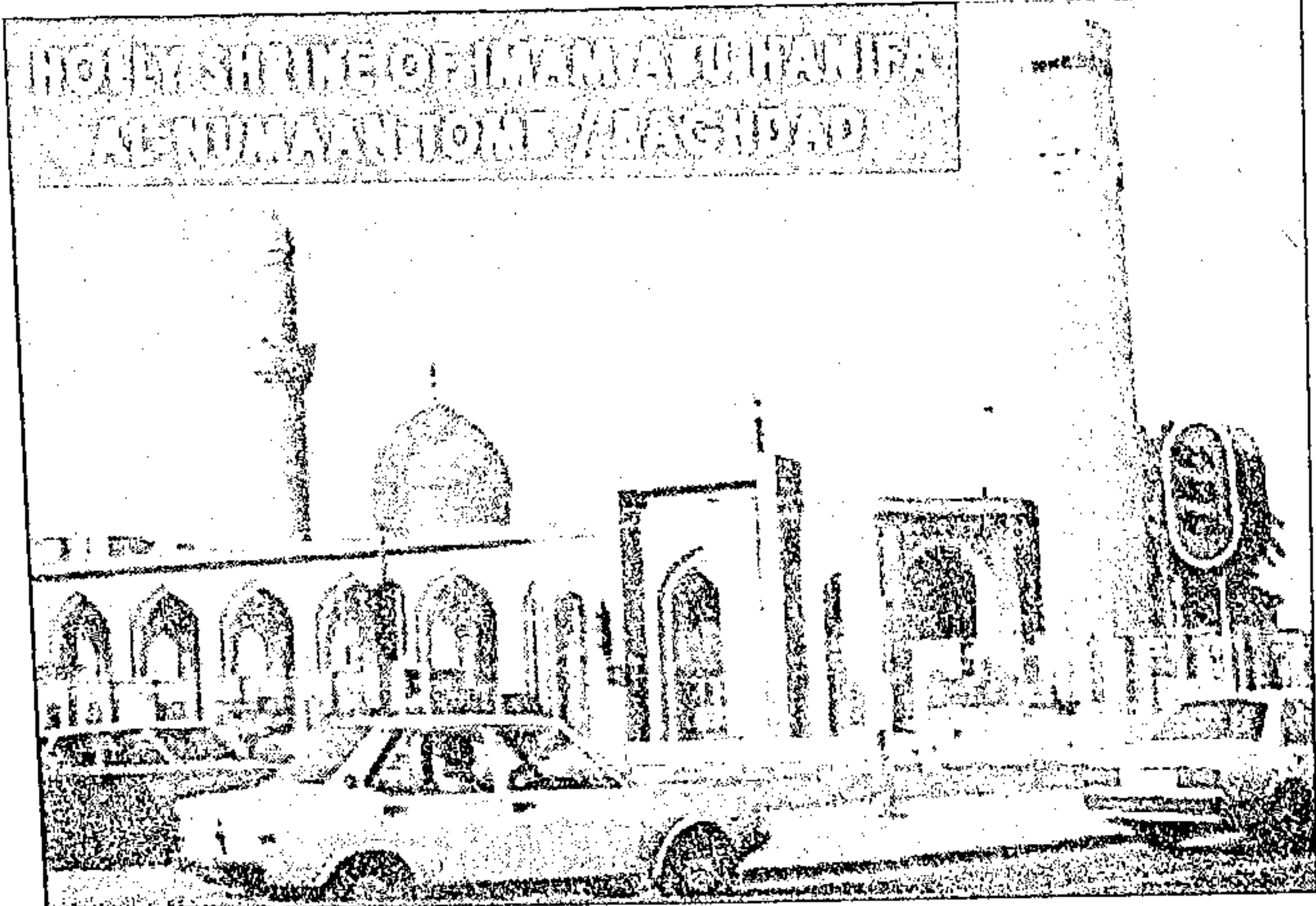
ولادت: 80ھ/699ء

وفات: 150ھ/767ء

- بحالت اسیری بغداد میں فوت ہوئے اور وہیں ان کا مزار ہے۔
- اس مزار پر 459ھ/1066ء میں ایک قبہ تعمیر کیا گیا تھا۔
- جس محلہ میں یہ مقبرہ واقع ہے وہ اب بھی امام اعظم کے نام پر اعظمیہ کہلاتا ہے۔



THE HOLY SHINE OF
HAZRATIMAN ABUHANIFA RAZIALLAH TALA



قرآن و سنت کے محکم دلائل پر مبنی اسلام کا تصور حکومت اور حکمرانوں کے کردار کا پیکر محسوس، خلافت راشدہ کے بابرکت دور میں یکا یک منصف شہود پر آیا اور نگاہوں کو خیرہ کر گیا۔ اس دور میں حکمران درویش صفت اور ”سَيِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُهُمْ“ کی تفسیر تھے اور نظام حکومت ”شُورَى بَيْنَهُمْ“ کے سنہری اصولوں پر قائم تھا معاشرہ کامل مساوات انسانی پر مبنی تھا اور گروہی، لسانی، علاقائی، خاندانی تعصبات سے یکسر پاک تھا، عورت کو معاشرے میں اعلیٰ مقام حاصل تھا اور اس کی عزت و آبرو ہر وقت محفوظ تھی، معاشی و اقتصادی سطح پر محنت کو اس کا صحیح مقام دیا گیا تھا، اَلْكَاسِبُ حَبِيبُ اللّٰهِ کا نعرہ مستانہ زبان زد عام تھا اور مفت خوری، گداگری، غیر حاضر زمینداری، سرداری اور بادشاہتیں (بقول اقبال ”مانگنے والا گدا ہے صدقہ مانگے یا خراج“) غلط سمجھ کر یکسر مٹا دی گئیں تھیں۔ چنانچہ سٹہ، سود، جوا (CHANCE MONEY) شراب نوشی، منشیات، رقص و سرور اور بے لگام لہو و لعب پر پابندی تھی۔ زکوٰۃ اور عشر کے نظام سے کفالت عامہ کا تصور دیا گیا تھا کہ حکومت ہر مسلم اور غیر مسلم شہری کی ضروریات از قسم روٹی، کپڑا، مکان، کم از کم تعلیم اور علاج معالجہ کی کفیل تھی۔ جس سے معاشرے میں امن و سکون اور عدل و انصاف کا دور دورہ تھا نیز احترام جان و مال کا سبق سب کو یاد تھا۔ سیاسی سطح پر حکمرانی اور SOVEREIGNTY اللہ ﷻ کا حق تسلیم کر لیا گیا تھا اور عوام اور حکمران اللہ ﷻ کی نیابت و خلافت کے امین تھے اللہ کے احکام کی تنفیذ تھی۔ عہدے امانت اور اہلیت پر ملتے تھے نہ کہ خاندانی وراثت کے طور پر۔

حضرت محمد ﷺ کی وفات (11ھ) کے 30 سال بعد تک خلافت راشدہ ہے پھر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا 20 سالہ دور ہے بعد ازاں آہستہ آہستہ ان اعلیٰ معیارات میں کمی آتی چلی گئی اور مسلم سوسائٹی اجتماعی معاشرتی اقدار کے حوالے سے خَيْرُ الْقُرُونِ قَرْنِي — ثُمَّ الَّذِينَ

يَلُونَهُمْ — پھر ایک درجہ اور نیچے تُم الَّذِينَ يَلُونَهُمْ کے فرمان رسالت مآب ﷺ کی عملی تفسیر بن گئی۔ اور قوموں کے عروج و زوال کے قانون فطرت کے عین مطابق اور باطنی انسانی داعیات پر ہدایت ربانی کی عمومی گرفت میں کمی ہونے پر برے نتائج کے ظہور کا مظہر۔

ان حالات میں اللہ ﷻ نے حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کو اٹھایا اور انہوں نے اسلام کے انقلابی اصولوں سے جہاں جہاں ضعف و اضمحلال پایا اس کو ٹھیک کرنے کی کوشش کی۔ انہیں کل دو سال کا عرصہ ملا جبکہ معاشرے کے بااثر طبقات کے عمومی حالات بالکل دگرگوں تھے تاہم یہ مرد درویش اور خلیفہ راشد حالات کے سامنے سینہ سپر رہا اور مع ”خوش درخشد و لے شعلہ مستعجل بود“ کے مصداق، تھوڑے عرصہ میں ہی اصول پسندی، ایثار اور قربانی کی ایک مثال ضرور قائم کر گیا۔

معروضی طور پر نگاہ ڈالیں تو باسانی سمجھ میں آ سکتا ہے کہ جو کام انہوں نے اولیت دے کر کیے وہی پہلو حد درجہ بگڑ چکے تھے تبھی انہیں یہ اصلاحی کام سرانجام دینا پڑے، جاگیروں کی واپسی، اموال مغصوبہ کی بیت المال میں جمع کرانے کی مہم، سرکاری عہدوں پر اہلیت کی بنیاد پر تقرری اور خلفائے راشدین بالخصوص حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نقش قدم پر چلنے کی تلقین ایسے اقدامات تھے جن سے ان کا خاندان اور اعزہ و اقارب سب نہ صرف ناراض ہو گئے بلکہ جانی دشمن بن گئے۔ اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ مالی معاملات میں سنگینی کتنی گہری تھی اور یہی وجہ ہے کہ جیسے ہی حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے وفات پائی۔ خاندان بنی امیہ نے بالخصوص اور طبقہ امراء اور آسودہ حال لوگوں نے بالعموم اجتماعی طور پر متحد ہو کر کوشش کر کے حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے اصلاحی اقدامات کو ختم کر دیا اور سابقہ ڈگر پر بیت المال کے ذاتی اغراض کے لئے استعمال اور ناجائز لوٹ مار کا دور دورہ ہو گیا۔

ہر عمل کا ایک رد عمل اتنا ہی زیادہ اور مخالف سمت میں ہوتا ہے اصلاحی اقدامات کا یہ منفی رد عمل بھی اسی طرح زور دار اور ذاتی اغراض کی تکمیل کیلئے تھا جس کا اثر پورے معاشرے پر پڑا اور اسن و امان، عدل و انصاف اور کفالت عامہ کی جگہ طوائف الملوکی اور سیاسی بے چینی نے لے لی۔ دوسری صدی ہجری کی ابتدائی تین دہائیاں وہ ہیں جن میں بنو امیہ کا اقتدار مستحکم نہ رہا اور ہچکولے لکھاتا اور گرتا پڑتا بالآخر 132ھ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے کل 72 سال بعد ختم ہو گیا۔

اوپر درج شدہ تصویر ان حالات کی ہے جن میں تاریخ اسلام کی دوسری نامور شخصیت نے آنکھ کھولی اور بچپن اور جوانی کی عمر گزاری۔

ذاتی حالات و کوائف

نعمان نام، ابوحنیفہ کنیت اور امام اعظم لقب تھا۔ شجرہ نسب یوں ہے: نعمان بن ثابت بن نعمان (زوطی) بن مرزبان۔ پیدائش: کوفہ 80ھ/699ء، وفات 150ھ/767ء۔ آپ عجمی النسل تھے اور آپ کے دادا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں (پہلے پنجاب سے کابل اور پھر) کابل سے کوفہ جا کر مسلمان ہو گئے تھے۔

امام ابوحنیفہ کا بچپن ایک پر آشوب دور تھا۔ حجاج بن یوسف عراق کا حاکم تھا اور مذہبی تصادم اپنے عروج پر تھا۔ عبدالملک اور اس کے بعد ولید کے عہدے داروں میں اکثریت ایسے ہی سفاک اور ظالم قسم کے حکمرانوں کی تھی۔ اس کے بعد سلیمان اور پھر عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے دور میں اسلامی دنیا کو کسی قدر سکون نصیب ہوا۔ ظالم عمال حکومت معزول کر دیے گئے اور مذہبی علوم کی طرف خصوصی توجہ دی گئی۔ امام زہری نے احادیث کا مجموعہ مرتب کیا۔ غرضیکہ امام ابوحنیفہ کے لئے اب وہ موقع آیا کہ آپ تحصیل علم کی طرف مناسب توجہ دے سکیں ان دنوں آپ کو فنی میں ایک قسم کا ریشمی کپڑا بنایا کرتے اور اس کی تجارت کرتے تھے اس کے ساتھ ساتھ آپ حضرت حماد رضی اللہ عنہ (متوفی 120ھ) کے درسوں میں شریک ہوتے تھے۔ یہاں آپ نے علم کلام اور فقہ کی طرف خصوصی توجہ دی۔ حضرت حماد کے انتقال کے بعد کوفہ میں فقہ میں سب سے زیادہ ممتاز حیثیت کے مالک آپ ہی تھے۔

امام اعظم رضی اللہ عنہ نے اگرچہ حضرت حماد رضی اللہ عنہ کے علاوہ اور علماء سے بھی فقہ کی تحصیل کی۔ لیکن وہ اس فن خاص میں حضرت حماد ہی کے تربیت یافتہ ہیں؛ یہی وجہ ہے کہ وہ ان کی بہت تعظیم کرتے تھے۔ اگرچہ فقہ میں امام موصوف نے زیادہ تر ان ہی کا حلقہ درس کافی سمجھا تھا لیکن علم حدیث میں یہ قناعت ممکن نہ تھی۔ یہاں صرف ذہانت اور اجتہاد سے کام نہیں چل سکتا تھا بلکہ درایت کے ساتھ روایت کی ضرورت تھی جہاں تک حدیث کا تعلق ہے اس وقت نہایت پریشان اور غریب المرتبت تھیں یہاں تک کہ بڑے بڑے اساتذہ کو بھی دو چار سو سے زیادہ احادیث یاد نہ

تھیں اور یہ تعداد ضروری مسائل کے حل کے لئے بھی ناکافی تھی۔

علاوہ ازیں طریق روایت میں اس قدر اختلافات پیدا ہو گئے تھے کہ ایک حدیث جب تک متعدد طریقوں سے معلوم نہ ہو، اس کے مفہوم اور تعبیر کا ٹھیک ٹھیک تعین دشوار تھا۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت حماد رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت اور پختگی عمر نے ان ضرورتوں سے اچھی طرح آگاہ کر دیا تھا اس لئے نہایت سعی و اہتمام سے حدیثوں کو بہم پہنچانے پر آپ نے توجہ دی۔ تقریباً کوفہ میں کوئی ایسا محدث باقی نہ تھا جس کے سامنے امام موصوف نے زانوئے تلمذتہ نہ کیا ہو آپ کو ان مختلف اور متعدد درسگاہوں سے اگرچہ احادیث کا بڑا ذخیرہ ہاتھ آیا۔ تاہم تکمیل کی سند حاصل کرنے کے لئے آپ نے حرین شریفین میں جانا ضروری سمجھا جو علوم مذہبی کے اصل اور بڑے مراکز تھے۔

جس زمانے میں امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ مکہ معظمہ پہنچے، درس و تدریس کا بہت زور تھا۔ عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ کا حلقہ درس سب سے زیادہ وسیع اور مستند تھا۔ امام موصوف استفادہ کی خاطر حاضر خدمت ہوئے تو عطاء بن ابی رباح نے آپ سے پوچھا۔ ”تمہارا عقیدہ کیا ہے؟“

”میں اسلاف کو برا نہیں کہتا، گناہگار کو کافر نہیں سمجھتا، قضا و قدر کا قائل ہوں۔“

عطاء بن ابی رباح نے امام موصوف کو اجازت دے دی کچھ عرصے بعد یہ عالم تھا کہ جب وہ حلقہ درس میں جاتے تو عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ آپ کو اپنے پہلو میں جگہ دینے لگے۔

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ جب مدینہ منورہ پہنچے تو آپ سالم رحمۃ اللہ علیہ بن عبداللہ بن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما اور سلیمان سے بھی ملاقی ہوئے۔ آپ نے تحصیل علم کا سلسلہ آخر زندگی تک جاری رکھا۔ آپ اکثر حرین جاتے اور پھر مہینوں وہاں پر قیام کرتے۔

حج کی تقریب پر ممالک اسلامیہ کے ہر گوشے سے بڑے بڑے اہل علم اور صاحبان کمال آ کر جمع ہوتے۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اکثر ان لوگوں سے ملتے اور مستفید ہوتے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ آپ کی شہرت دور دور تک پہنچ چکی تھی۔ یہاں تک کہ ظاہر بینوں نے آپ کو ”قیاس“ مشہور کر دیا تھا ان ہی دنوں آپ کے شاگرد عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے بیروت کا سفر کیا کہ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ سے فن حدیث کی تکمیل کریں جب ان کی ملاقات امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ سے ہوئی تو

انہوں نے عبداللہ ابن مبارک کی زبانی تفصیلات سے آگاہی حاصل کی جس کے بعد امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق ان کی غلط فہمی دور ہوگئی۔ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنی غلطی پر افسوس ہواج کے لیے جب امام اوزاعی مکہ تشریف لے گئے تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات ہوئی۔ اتفاق سے عبداللہ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ بھی وہاں موجود تھے۔ ان کا بیان ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس خوبی سے تقریر کی کہ امام اوزاعی حیران رہ گئے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے جانے کے بعد مجھ سے کہا: ”اس شخص کے کمال نے اس کو لوگوں کا محسود بنا دیا ہے، بلاشبہ میری بدگمانی غلط تھی، جس کا مجھے افسوس ہے۔“ تاریخ شاہد ہے کہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے فن حدیث میں امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ کی شاگردی کی ہے۔ غالباً وہی زمانہ ہے کہ آپ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ کے حلقہ درس میں شامل ہوئے۔

حضرت باقر رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ دوسری بار مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو ایک علمی مکالمہ کے بعد حضرت باقر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی آپ سے متعلق موجود غلط فہمی کو دور کر دیا اور آپ کی علمی حیثیت و وجاہت کا اعتراف کر لیا۔ حضرت باقر رحمۃ اللہ علیہ اس قدر خوش ہوئے کہ اٹھ کر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی پیشانی چوم لی۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ایک مدت تک استفادہ کی غرض سے آپ کی خدمت میں حاضر رہے اور فقہ و حدیث کے متعلق بہت سی نادر باتیں حاصل کیں۔ آپ اس خصوصیت سے مشہور ہیں کہ آپ کے شیوخ حدیث بے شمار تھے۔

آپ نے خاندان بنو امیہ کا زوال بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا اور بنی ہاشم اور بنی عباس کی مشترکہ کوششوں سے سلطنت بنی عباس کی تشکیل بھی آپ کی زندگی میں ہوئی۔

کسی خاندان کی سلطنت کا دور زوال، خونریزی اور طوائف کا دور ہوتا ہے اور کسی دوسرے خاندان کی حکومت کے حصول کے بعد سلطنت کو استحکام دینے کی غرض سے مخالفین کا قتل اور سر اٹھانے والے گروہوں کا استیصال سمیت ممکنہ خطرات کی حامل شخصیات سے گلو خلاصی اس دور کی ناگزیر کارروائیوں کا حصہ ہوتی ہے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ دور اپنی عمر میں مشاہدہ کیے اور اس کی زہرناکیوں سے زخم خوردہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کی اولاد میں سے آپ کے بیٹے حماد اور پوتے اسماعیل نے جو قاضی بصرہ اور قاضی درقہ تھے (متوفی 112ھ)۔

(827ء) فقہ اسلامی میں ممتاز حیثیت حاصل کی۔

شہزادی عہدوں کی پیش کش

بنو اُمیہ کے ایک حاکم مروان حمار کے دور میں آپ کو اعلیٰ عہدہ (صوبائی چیف سیکرٹری) کی پیش کش ہوئی جسے آپ نے کمال بے اعتنائی سے مسترد کر دیا اور دھمکیوں سے بھی بالکل مرعوب نہیں ہوئے۔ اسی طرح دور بنو عباس کے ابتدائی دور میں بھی آپ کو تسلسل کے ساتھ عہدوں کی پیش کشیں کی گئیں مگر آپ کی حقیقت شناس اور دور اندیش طبیعت نے کبھی کوئی پیش کش قبول نہیں فرمائی۔ بقول نظیری

خلاف رسم در این عہد ز خرق عادت داں

کہ کار ہائے چنین از شمار بواجبی ست

چنانچہ خاندان بنو عباس کے دوسرے حکمران ابو جعفر منصور نے آپ کو بلا کر قاضی القضاہ کے عہدے کی پیش کش کی جسے آپ نے رد کر دیا اور کسی رعب اور لالچ میں نہیں آئے حتیٰ کہ آپ کو قید کر دیا گیا اور چار سال کی قید کے دوران ہی ان کا انتقال ہوا اور قید خانے سے ہی جنازہ اٹھا۔

قانون اسلامی کی تشکیل و تحفظ

قانون اسلامی اپنی ٹھوس اور محکم بنیادوں، حکیمانہ اور فطری استدلال، نفسیات انسانی میں موجود مثبت و منفی داعیات کے صحیح ادراک اور ان کے درمیان حسین اعتدال کے تصورات پر مبنی ہے اور اس کی سب سے بڑی اور بنیادی وجہ اس کا خالق ارض و سماء اور فاطر فطرت کی طرف سے ہونے کا حقیقی دعویٰ ہے۔ ثانیاً ”اسلامی قانون“ کے ماخذوں کی حفاظت اور تاریخی طور پر ہر دور میں AVAILABILITY اور اس کا مطالعہ و تلاوت ہے۔ تقابلی طور پر دیکھیں تو دوسرے نظام ہائے قوانین بنیادی طور پر MAN MADE ہیں جس میں فطرتاً دوسرے انسانی گروہوں سے انصاف ناممکن ہے اور ثانیاً ان کا تدریجاً اور نسلاً بعد نسل تشکیل پا کر تکمیل کے مراحل کرنا ہے۔

قانون اسلامی (جسے عرف عام میں فقہ یا فقہ اسلامی سے بھی موسوم کیا جاتا ہے اور یہی

زیادہ عام ہے) کے ماخذ چار بتائے جاتے ہیں:

- ① قرآن مجید
- ② سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم (حدیث)

ان چار ماخذ میں سے بنیادی ماخذ قرآن مجید و سنت رسول ﷺ ہی ہیں۔ قیاس تو ہوگا ہی اپنے دور میں جب کوئی مسئلہ درپیش ہو جبکہ اجماع کا معاملہ دور صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد ایک نادر الوقوع واقع ہوگا اس کے لئے کسی رائے کو قبول عام حاصل ہونا کسی محنت اور تدبیر سے زیادہ اس کے داخلی اور فطری پہلوؤں پر منحصر ہے۔ لہذا — قانون اسلامی کے تحفظ کے لئے قرآن مجید اور سنت رسول ﷺ کا تحفظ از بس ضروری تھا اب بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔

مزید غور کریں تو قرآن مجید کا معاملہ بہت مختلف ہے اور اس کی حفاظت کا معاملہ بھی طے شدہ ہے اس لئے کہ اس کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لی ہے چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ (9-15)

”بے شک یہ نصیحت (کتاب) ہمیں نے اتاری ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں“

اس خدائی تدبیر کے کچھ اسباب بھی سامنے ہیں اور ان کا تسلسل ضروری ہے تاہم اس کی حفاظت کے اسباب ختم نبوت کے خدائی فیصلے کے لازمی نتائج ہیں۔ جو لازمی اور لا بدی تھے اور تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو دوست اور دشمن سب مانتے ہیں کہ قرآن مجید اسلام دشمن لوگوں کی سر توڑ کوششوں کے باوجود ماضی میں بھی محفوظ رہا ہے اور ان شاء اللہ آئندہ بھی ایسی ناپاک جسارتوں کی دست برد سے محفوظ رہے گا۔

قانون اسلامی کے تحفظ کے لئے اصل مسئلہ سنت رسول ﷺ کا تحفظ تھا۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے تک اس پر کئی ادوار گزرے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

1۔ عہد نبوت ﷺ

2۔ عہد خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم

3۔ عہد صغار صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رضی اللہ عنہم

حالات اب اس تیسرے دور سے چوتھے دور میں داخل ہو گئے تھے۔ جس میں صغار صحابہ رضی اللہ عنہم بھی وفات پا چکے تھے۔ اسلامی سلطنت بہت وسیع ہو چکی تھی اور اس کے اطراف و

اکناف میں قانون اسلامی پر عمل درآمد کے لئے اس کی تدوین کی ضرورت کا احساس ہونے لگا تھا اس لئے دوسری صدی ہجری بالخصوص اشتغال بالفقہ الاسلامی کا دور ہے۔

قانون اسلامی کی تدوین پر گفتگو کرتے ہوئے ایک عملی پہلو جس کو عام طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے وہ نظام عدل میں ایک منصف اور جج (یا قاضی) کے لئے کسی موجود قضیہ کے لئے کم سے کم وقت میں انصاف کو ملحوظ رکھتے ہوئے فیصلہ تک پہنچانا ہے۔ نہ ہر منصف کے پاس یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ اصولوں سے استنباط کر کے اور قیاس کر کے موجود قضیہ پر اطلاق کر سکے اور نہ ہی ہر مسئلے میں وقت اور موقع میسر آتا ہے۔

عہد نبوت میں قاضی حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ جیسے تھے، وسائل سادہ تھے اور مقدمات کم۔ ان حالات میں وہ اصولوں سے استنباط کر کے جلد فیصلے تک پہنچ جاتے تھے جب تک اسلامی سلطنت وسیع نہیں ہوئی تھی اہل علم و فضل اور باصلاحیت قاضی یہ فیصلے کرتے رہے اور اس سے نظائر اور عملی مسائل کے سلسلے میں اسلامی قانون کو عملی شکل دی جاتی رہی۔ دور خلافت راشدہ میں بھی صحابہ رضی اللہ عنہم کی کثیر تعداد موجود تھی اور پھر تبلیغ دین کی غرض سے بھی صحابہ مدینہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بلادِ شام و کوفہ میں آباد ہو گئے تھے کہ لوگ مقامی سطح پر ہی ان سے استفادہ کر سکیں۔

تیسرا دور صحابہ رضی اللہ عنہم اور صحابہ کرام کے ممتاز اور لائق شاگردوں کا ہے اور اس میں اسلامی سلطنت کی وسعت کے ساتھ ساتھ اہل علم و فضل کی بھی کثیر تعداد اسلامی سلطنت کے طول و عرض میں ہر جگہ موجود تھی۔ تاہم عہد نبوت کے ایک صدی بعد حالات اس طرح آگے بڑھ رہے تھے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے مزاجوں کے فرق کے ساتھ اب ان کے شاگردوں اور پھر ان کے شاگردوں میں ممکن تھا کہ اختلاف رائے کی وجہ سے قانون اسلامی کی تشریح قابل قبول اور قابل درگزر حدوں سے نکل جائے یہی دور ہے جس میں اسلامی حکومت میں شام، کوفہ، مصر، مدینہ میں مختلف شخصیتیں اپنے اپنے مزاج اور ذوق کے مطابق کام کر رہی ہیں لوگ انہیں کا احترام کرتے ہیں اور انہی کے بتائے قانون اسلامی کی تشریح تسلیم کرتے ہیں جس سے قانون اسلامی کی تشریحات میں بعد پیدا ہو رہا تھا اور دشمنوں کو بھی موقع مل رہا تھا کہ وہ ان اختلافات سے فائدہ اٹھا کر شام، کوفہ، مدینہ میں

اختلاف کو ہوا دے کر اس میں من مانی باتیں داخل کر سکیں۔ ان شارحین قانون اسلامی اور فقہائے امت کے آپس میں ملنے کے لئے ایک موقع حج اور عمرے کے اسفار تھے یہاں لوگ دور دراز سے آتے اور مہینوں قیام کر کے تبادلہ خیالات کرتے اپنے معلومات و تجربات SHARE کرتے اساتذہ سے قانون اسلامی کی اہم بنیاد ”حدیث“ کا علم حاصل کرتے اور واپس لوٹ جاتے۔

تاہم یہ ذریعہ جامع و مانع نہیں تھا اور نہ دشمنان اسلام کی شرارتوں سے محفوظ۔ چنانچہ حدیثوں کے گھڑنے اور متن حدیث میں ملاوٹ تدلیس جیسی باتیں اسی دور میں شروع ہو چکی تھیں۔ اس دور کے مخلص درد مند اور باصلاحیت لوگوں کے سامنے دو مسئلے بہت اہم تھے: پہلا یہ کہ حفاظت حدیث، یعنی حدیثوں کو جمع کیا جائے ان کی چھان پھٹک کرنے کے صحیح اور غیر صحیح، اصلی اور موضوع کی پہچان کی جائے اور اس کے اصول وضع کیے جائیں اور اس کو کتابوں میں محفوظ کر دیا جائے۔ دوسرا یہ کہ۔۔۔ اسلامی قانون جو کہ بلاد اسلامیہ کے ایک صدی کے تعامل اور عدالتی فیصلوں کے نظائر میں ابتدائی مراحل سے گزر چکا تھا اس کو مزید نکھار کر اور چھان پھٹک کر کے مدون کر دیا جائے جو کہ ایک منصف اور قاضی کی ضرورت ہے۔ تاکہ نظام عدل محکم بنیادوں پر استوار اور رواں دواں رہے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے دور میں اگرچہ پہلے کام پر بھی کافی توجہ ہو چکی تھی اور لوگ احادیث کے جمع کرنے اور کتابوں کی شکل دینے میں مصروف ہو چکے تھے تاہم یہ کام کئی نسلوں میں پایہ تکمیل کو پہنچنے والا تھا۔ جبکہ خلافت راشدہ کی صحت مند روایات اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے دور کے اثرات ابھی فضا میں چھائے ہوئے تھے تاہم دور بنو امیہ کے آخری عشروں کی بے امنی و بدسکونی اور باہمی خانہ جنگی سے یہ امر قرین قیاس تھا کہ اسلامی روایات اور قانون محفوظ نہ رہ سکے۔ لہذا بہت سے اصحاب علم و فضل اسلامی قانون کی تدوین اور حفاظت کو اولیت دے کر اس میں مشغول ہو گئے ان اصحاب علم و فضل میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ان کے اساتذہ اور ان کے ساتھ کام کرنے والے افراد کی جماعت کے علاوہ اور بہت سی شخصیات اور جماعتیں تھی جو کام کر رہی تھیں۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس ضمن میں جس قدر واقع کام کیا ہے اور جس منظم انداز سے کیا ہے اسلامی قانون کی تدوین میں اس سے زیادہ کام غیر سرکاری سطح پر کوئی اور نہیں ہو سکا۔

(فتاویٰ عالمگیری کی تدوین سرکاری سطح پر حکومت کے زیر انتظام ہوئی ہے) اسلامی قانون کے اس طرح مدون ہو جانے سے اب قانون زبانی نہیں رہا اور نہ ہر منصف اور جج کے پاس وسیع امکان کہ وہ پیش آمدہ قضیہ میں جو چاہے فیصلہ کر دے اور اس طرح بلاد اسلامیہ میں انتشار کا سبب بن جائے بلکہ ترتیب وار اور شق وار تدوین کے بعد بہت چھوٹا سا دائرہ تھا جس میں قاضی کو معروضی حالات میں جرم کی نوعیت، مجرم کے حالات پس منظر اور عرف کا لحاظ رکھنا تھا۔ جس سے عباسی دور کے ابتداء میں ہی بلاد اسلامیہ کے طول و عرض قانون کی یکسانیت پیدا ہو گئی اور فیصلوں کے اجراء اور تنفیذ میں ذاتیات اور پسندنا پسند کا عنصر تقریباً ختم ہو گیا اور وسیع سلطنت کے شایان شان قانون اسلامی مدون شکل میں میسر آ گیا۔

قانون اسلامی کی اس تدوین اور حفاظت کا نتیجہ ہے کہ اس شعبے میں دشمنوں کی دراندازی کے امکانات ختم ہو گئے اور آج بھی اسلامی قانون ایک جاندار زندہ اور قابل عمل نظام قانون کے طور پر موجود ہے اور دوسرے تمام نظام ہائے قوانین کے مقابلے میں کھڑا ہو سکتا ہے۔ (اگرچہ خود داخلی طور پر اسلام کی تعلیمات کے مطابق دور حاضر کے مسائل پر غور کرنے اور اس کو UPDATE کرنے کی ضرورت ہے)۔

جبکہ حدیث کی حفاظت کا دوسرا میدان جو احادیث کو جمع کرنا اور اس کو کتابوں میں محفوظ کرنا تھا اس میں چونکہ ڈیڑھ صدی گزر گئی (امام بخاری وفات 256ھ - 870ء، امام مسلم وفات 261ھ - 875ء، امام ترمذی 279ھ - 892ء، امام ابوداؤد 204ھ - 819ء) اس لئے دشمنان اسلام کو احادیث کے ذخیرہ میں موضوع احادیث کے داخل کرنے اور اس کے انبار لگا دینے کا موقع مل گیا اس کے علاوہ کتابوں کے متن کی تبدیلی و کمی بیشی اور روایات کا اضافہ کرنے کا موقع مل گیا جس سے صحیح احادیث کی تلاش میں اہل علم کو کہیں زیادہ محنت و مشقت سے کام لینا پڑا۔

ایمانی کیفیات کی حفاظت کے لئے فتنوں کا سدباب، عقائد کی تدوین

دین اسلام میں اللہ تعالیٰ اور اس کے آخری پیغمبر حضرت محمد ﷺ کی تعلیمات کے مطابق اسلام کلمہ شہادت کی ادائیگی اور نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے اہتمام کا نام ہے جبکہ اس کے ساتھ دل میں اللہ کا یقین اس کی کتابوں، فرشتوں، قیامت کے دن، وحی، پیغمبروں ﷺ کا یقین ہو تو ایمانی

کیفیات ہیں اور آخرت میں کامیابی کا انحصار اسلام کے ساتھ ان ایمانی کیفیات پر بھی ہے۔ یہ ایمانی کیفیات چونکہ چھپی ہوئی اور دل میں ہوتی ہیں لہذا اس کے بارے غلط فہمی میں مبتلا ہو جانا یا کسی دوسرے مسلمان کو غلط فہمی میں ڈال دینا فتنہ پرور لوگوں کے لئے آسان ہے۔

دشمنانِ اسلام کے لئے یہ راستہ ہمیشہ سے پسندیدہ راستہ رہا ہے اور اس راستے میں بے شمار لوگ مسلمان کہلاتے ہوئے بھی شاید اسلام کی حقیقت اور ایمان سے دور چلے جاتے ہیں۔ دور صحابہ رضی اللہ عنہم میں ہی خوارج کا فتنہ ایک زور دار فتنہ تھا جس نے ایک وقت میں بلادِ اسلامیہ میں افراتفری کی کیفیت پیدا کر دی تھی اور اس کے بعد بھی اسی نوعیت کی علمی مویشگافیاں ہر دور میں پہلے سے کہیں بڑھ کر سامنے آتی رہی ہیں۔ ان حالات میں ایمانی کیفیات کو عام آدمی کی پہچان کے لئے الفاظ میں معین شکل دینے کا کام نہایت ضروری اور ناگزیر تھا اس دور میں اس کی شدید ضرورت کا احساس آپ کی دور رس نگاہ کو بروقت ہوا ہے اور اللہ ﷻ نے اس مردِ جلیل کو بروقت خبردار کر دیا اور عقائد کے مدون کرنے اور باقاعدہ عبارت بنا کر کتابوں میں لکھ دینے کا کام آپ کے دور میں شروع ہوا اور نہایت زور شور سے ہوا اور بالآخر مدون ہو کر امت کے اطمینان کا باعث بنا جس سے لاکھوں کروڑوں لوگ ایمان سے محروم ہونے سے بچ گئے۔ یہ کام عقائد کے عنوان سے ہوا اور تاریخ میں محفوظ ہے اور آج بھی اتنا ہی کارآمد جتنا پہلے تھا

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے جو خدمت قانونِ اسلامی کی تدوین میں کی وہ بے مثال ہے اس طرح امت اس میدان میں فتنوں اور گمراہی سے محفوظ ہوگئی انہیں کے شاگرد امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے چونکہ عباسی خلفاء کے ہاں قاضی القضاہ کا عہدہ قبول کر لیا تھا جس سے انہیں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مدون قانونِ اسلامی کو سرکاری طور پر رائج کرنے کا موقع مل گیا اور اس طرح دورِ بنی عباس میں عدالتی نظام میں یکسانیت، تسلسل، فیصلوں میں ہم آہنگی اور عدل و انصاف کی فوری فراہمی جیسی خوبیاں پیدا ہو گئیں اور عدالتی نظام کی یہ خوبیاں کسی قوم اور سلطنت کی بقا اور درازی عمر کا سبب ہوتی ہیں سرکاری عہدوں کے ساتھ ہر سطح پر کچھ پابندیاں اور حدود و قیود ہوتی ہیں اور اصلاً کسی سلطنت کے عہدے دار اس جاری نظام کے محافظ (CUSTODIAN) ہوتے ہیں لہذا وہ عہدے کے

3

محدث کبیر، مرد حق، بانی فقہ حنبلی

حضرت

امام احمد بن حنبل

رحمۃ اللہ علیہ

ولادت: 164/780ء

وفات: 240/855ء

مدفن: قبرستان باب حرب بغداد

امام احمد بن حنبل

لَا تُقَلِّدُنِي وَلَا تُقَلِّدْ مَا لِكَا وَلَا الشَّافِعِيَّ
وَلَا الْأَوْزَاعِيَّ وَلَا الثَّوْرِيَّ وَخُذْ مِنْ حَيْثُ أَخَذُوا

نہ میری تقلید کرو اور نہ مالک، شافعی، اوزاعی اور ثوری (جیسے ائمہ)
کی تقلید کرو۔ بلکہ جہاں سے انہوں نے دین لیا ہے تم بھی وہاں
(یعنی کتاب سنت) سے دین حاصل کرو۔ (ایقانہم اولی الابصار ص: 113)

دین کے معاملے میں لوگوں کی تقلید کرنا انسان کی کم فہمی کی علامت
ہے۔ (اعلام التوحید لابن قیم شرح: ج: 2 ص: 178)

ولادت: 164ھ طائے ولادت: بغداد مسلمی: بغداد ولادت: 241ھ و توفیق: بغداد

دراصل 20 نامور شخصیات پر سیمیناروں کا سلسلہ قرآن اکیڈمی جھنگ میں جاری رہا اور بعد ازاں ان شخصیات کے بارے میں حاصل شدہ معلومات کو قارئین کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ اس سلسلہ میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ اور حضرت امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے بعد امام غزالی رضی اللہ عنہ کا تذکرہ تھا مگر امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ اور امام غزالی رضی اللہ عنہ کے درمیان زمانی فصل زیادہ ہے جس سے درمیانی عرصہ کے حالات پوری طرح دائرہ تحریر میں نہیں آسکتے تھے؛ اس لیے حکمت بالغہ میں اور اب اس کتاب میں بھی حضرت امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ کے حالات کو شامل اشاعت کیا جا رہا ہے۔

دورِ بنی عباس کے ابتدائی عرصہ میں وسعت قلبی اور علم دوستی کی پالیسی سے فائدہ اٹھا کر دشمنانِ اسلام نے یونان، عیسائیت، ایران اور ہندوستان کے ملحدانہ اور فاسد نظریات پر مبنی کتب کے تراجم کر کے اسلامی دنیا میں نظریاتی ہیجان پیدا کر دیا تھا جس سے اسلام کے مابعد الطبیعیاتی حقائق پر کامل ایمان کو ٹھیس پہنچی اور عمل میں اضمحلال آ گیا۔ دورِ نبوت سے دُوری کے باعث بے عملی اور نئے علاقوں کے نو مسلم افراد کی پوری طرح دینی تربیت کے فقدان سے ان میں بھی وہ جذبہ اور ایمانی کیفیات پیدا نہ ہو سکیں جو مطلوب تھیں۔ یونانی فلاسفہ بالخصوص ارسطو، افلاطون وغیرہ کے فاسد خیالات نے علمی حلقوں میں زہر پھیلا دیا جس سے اسلام کے مابعد الطبیعیاتی تصورات کے بارے میں مختلف آراء اور فرقے پیدا ہو گئے۔ بنیادی طور پر قرآن کی حتمیت اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی قطعیت کے بارے میں بہت سے لوگ راہِ حق سے دور ہوتے چلے گئے جن کو بجا طور پر 'معتزلہ' کہا گیا۔

اس معرکہ خیز و شر میں الفاظ کی جنگ کا ایک موقع ایسا آیا کہ قرآن کے بارے

مامون الرشید نے معتزلہ کے غلط موقف کو سرکاری موقف قرار دیا اور مخالفین کو دارورسن تک پہنچانے کا اہتمام کر دیا اس موقع پر بہت سے اہل حق میدانِ عمل میں آئے اور اپنے اپنے حصے کا کام کیا مگر مردِ حق امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے دربار شاہی میں کھڑے ہو کر اس موقف کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اگرچہ انہیں جھکانے کے لئے تشدد اور بربریت کا ہر حربہ استعمال کیا گیا مگر وہ مردِ حق ڈٹا رہا۔ تا آنکہ آنے والے حکمرانوں نے اس موقف کو بدل کر اہل سنت کا موقف کہ قرآن مجید — کلام اللہ ہے اور ابدی ہدایت ہے، کو دوبارہ سرکاری موقف بنا دیا اس طرح امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اس الحاد اور بے دینی کے سیلاب کے آگے بند باندھ دیا۔

چنانچہ ہم معذرت کے ساتھ امام ابو محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرے سے پہلے اضافی طور پر حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ کر رہے ہیں۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز

چراغِ مصطفویٰ سے شرارِ بولہبی!

کے مصداق — یوں تو خیر و شر کی کشاکش اور پنچہ آزمائی سے کوئی دور بھی خالی نہیں رہا تاہم محسنِ انسانیت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے بعد سے شر کی قوتوں نے جیسے متحد ہو کر 'اہل خیر' کو دبانے کی بھرپور کوششیں کی ہیں تاریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ بدر و خندق کے معرکوں سے لے کر جنگِ یمامہ تک اور شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ سے لے کر سانحہ کربلا تک اہل شر اور دشمنانِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کو نقصان پہنچانے کے لئے ہر حربہ استعمال کیا اور کوئی موقع نہیں چھوڑا جہاں اہل اسلام کا نقصان نہ کیا ہو۔

دورِ بنو امیہ کے آخری سالوں میں جو بدامنی اور داخلی خلفشار مسلمان اُمت کے حصے میں آیا اور اسلامی حکومت کے طول و عرض میں جس طرح کے انتقامی جذبات نے شدت اختیار کی وہ بنو امیہ کی حکومت کے خاتمے (132ھ / 750ء) کے بعد بھی ٹھنڈے نہیں پڑے بلکہ دورِ بنو عباس کا پہلا حکمران اتنا ظالم اور سفاک ثابت ہوا اور اس نے خونِ مسلم کی ایسی ارزانی کردی اور انتقامی جذبات کی تسکین کی کہ اس کی مثال نہیں ملتی اس ظلم اور بربریت کے نتیجے میں

عباسی سلطنت کو استحکام تو مل گیا اور دشمنوں کے خاتمے کے نتیجے میں سازشوں کا امکان نہ رہا مگر اسلام کی کشتی میں کئی جگہ ”سوراخ“ ہو گئے اور مختلف عجمی نظریات اور خیالات نے ”فکر اسلامی“ پر یلغار کر دی۔

ع ”گرچہ پیر ہے آدم جو ان ہیں لات و منات“

کے مصرعے پر غور فرمائیں تو آپ بھی اس بات سے اتفاق کریں گے کہ حق کے علمبردار سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا شکار ہو کر تاریخ کے دھند لکوں میں نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں جبکہ اہل شر منتشر ہونے کے باوجود موقع ملتے ہی دوبارہ منظم ہو جاتے ہیں یا صحیح یہ ہوگا کہ کہا جائے کہ وہ منتشر ہو کر بھی منظم رہتے ہیں اور اپنے لئے دراندازی کے مواقع پیدا کرتے رہتے ہیں اور ان کی تلاش میں رہتے ہیں۔

پہلی صدی ہجری اور دوسری صدی ہجری میں جس طرح دشمنانِ اسلام نے مسلمانوں کے سیاسی استحکام کو نقصان پہنچایا اور بعد ازاں بنو عباس کے ابتدائی دور میں ”سفاح“ کے کارناموں سے حکومت کے مخالفین تہ تیغ کر دیے گئے اور سلطنت کے تسلسل کے لئے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی محنت سے تیار کردہ فقہ حنفی کو ملکی قانون کا درجہ دے دیا گیا۔ جس سے ملک میں عدل و انصاف کی فراہمی کی راہ نکل آئی اور امت کی اجتماعی خواہش کہ شریعت اسلامی کا نفاذ ہو، بھی پوری ہو گئی۔

بنو عباس کی حکومت کے استحکام کے بعد دشمنانِ اسلام نے فکری سطح پر اسلام کے ایمانیات اور الہیات کے میدان میں رخنہ ڈالنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ یہی دور ہے جب بنو عباس کے دور میں اسلامی فتوحات کا سلسلہ توڑک گیا گویا ”جہاد“ کا جذبہ تو ٹھنڈا ہی نہیں پڑا حکومتی سطح پر ختم ہو گیا۔ اس دور میں سارا زور ملک کے نظم و نسق کو چلانے اور امن و امان کو برقرار رکھنے پر صرف ہوا۔

اس پرسکون ماحول میں دوسرے علاقوں اور زبانوں سے مختلف مذاہب کی کتابوں کے ترجمے عربی زبان میں ہوئے، یونانی زبان سے ارسطو اور افلاطون کی کتابوں کے تراجم ہوئے، عیسائی اور یہودی کتابوں اور تورات و انجیل کی تفسیروں کے ترجمے ہوئے۔ ہندوستانی مذہبی کتابوں اور دیگر عجمی خیالات کا رطب و یابس بھی اس دور میں اسلامی ذہن کو پراگندہ کرنے کے

لئے جمع کر دیا گیا۔

معاشی خوشحالی، جذبہ جہاد کے شل ہونے، دورِ نبوت سے دو صدیوں کے بعد، اسلامی روح کے مضمحل ہونے اور غیر اسلامی نظریات کے اس سیلاب کے نتیجے میں عالم اسلام میں نظریات کی ایک جنگ چھڑ گئی۔ اہل شر اور دشمنانِ اسلام نے اب سیاسی میدان کی بجائے مناظرے اور علم کا میدان منتخب کر لیا۔ اس جنگ کا غیر رسمی آغاز تو پہلی صدی کے اواخر میں ہی غیر مسلموں سے میل جول اور ان کے خیالات و نظریات کے ساتھ INTERACTION سے ہی ہو چکا تھا مگر دوسری صدی کے اختتام اور تیسری صدی کے آغاز میں یہ کشاکش باقاعدہ لفظی جنگ کی شکل اختیار کر چکی تھی۔

اسلام کے دشمنوں کی فہرست میں یہود، مشرکین، نصاریٰ اور دیگر باطل اور ملحدانہ خیالات و نظریات کے حامل لوگ ہیں۔ قرآن مجید میں یہود و مشرکین کو اسلام کے سب سے بڑے دشمن قرار دیا گیا ہے۔ ان دونوں میں سے بھی ”یہود“ سب سے آگے ہیں۔ (5-82) یہود کبھی اسلام کے سامنے آ کر دشمنی نہیں کرتے اس لئے کہ وہ مذہبی بحث میں کامیاب نہیں ہو سکتے وہ ہمیشہ ملحد اور بے دین گروہوں سے اہل اسلام کو لڑا کر خود موقع کی تلاش میں رہتے ہیں اور فوائد سمیٹنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ دوسری صدی ہجری کے اس سیاسی معرکہ میں بھی یہود نے نصاریٰ کو آگے رکھا اور فکری سطح پر یونانی فکر و فلسفہ کو فروغ دے کر اور بڑھا چڑھا کر پیش کیا اور اہل اسلام کو دفاعی پوزیشن پر لاکھڑا کیا۔

دورِ نبوت سے بعد کے باعث مسلم معاشرہ بے عملی کا شکار ہو چکا تھا اور بے عمل آدمی اپنی بے عملی کو چھپانے کے لئے عقلی دلائل کا سہارا لیتا ہے کہ بات سمجھ میں نہیں آرہی سمجھانے والا مبلغ بھی مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ سامع اور ”مدعو“ کو مطمئن کر سکے۔ مزید برآں اگر سامع غیر اسلامی اور ملحدانہ خیالات سے متاثر ہو چکا ہو جیسا کہ دورِ بنو عباس میں افلاطون اور ارسطو کے خیالات عام ہوتے جا رہے تھے تو معاملہ الجھ جاتا ہے اور افہام و تفہیم کی بجائے بحث و تمجیح اور بحث برائے بحث کا راستہ کھل جاتا ہے۔

دورِ بنو عباس میں یہی کچھ ہوا اور اُمتِ مسلمہ کا بے عمل اور ذہین عنصر اس طرف کھینچتا

چلا گیا تا آنکہ گمراہی اور عقلیت پرستی کے کئی SHADES وجود میں آگئے اور بے شمار فرقے پیدا ہو گئے اور مختلف ناموں سے پہچانے جانے لگے۔

اس گمراہی کا ایک عمومی عنوان ”وحی“ کے مقابلے میں ”عقل“ یا عقلیت پرستی تھا جس میں سارا زور دلائل پر تھا اور فطرتِ انسانی کے بدیہی حقائق اور ماورائے عقل حقائق کو نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ (یہ امر قارئین کے لئے نہایت دلچسپی کا باعث ہوگا کہ بعد کے ادوار میں بھی جب عقلیت پرستی نے زور پکڑا تو سوچ کے یہی پیمانے سامنے لائے گئے اور اس کی بنیاد پر اللہ، وحی، رسالت فرشتے غرض مذہب کی ہر بنیاد کو گرا دینا اس طرزِ فکر کا طرہ امتیاز ٹھہرا۔ دورِ حاضر میں گزشتہ تین صدیوں سے مغرب میں یہ جنگ جاری ہے اور اب یہ جنگ پھیل کر عالمگیر ہو چکی ہے اور اب علمی درسگاہوں سے نکل کر میڈیا کا موضوع بن چکی ہے اور اس کے پیچھے مغرب کی بے پناہ ترقی اور وسائل ہیں لہذا جنگ کی آگ کی طرح ان نظریات کو فروغ مل رہا ہے۔)

عقلیت پرستی کے تحت دوسری صدی ہجری میں جو باتیں موضوعِ بحث بنیں وہ ذاتِ باری تعالیٰ، صفاتِ باری تعالیٰ، وجودِ حقیقی، امکانی وجود، واجب الوجود، وحی، رسالت، فرشتے، تخلیق کائنات، انسان، حقیقتِ انسان، موت، جنت دوزخ وغیرہ غرض اسلام کی تعلیمات کی ہر چیز موضوعِ بحث بن کر اپنی حقانیت اور حتمیت سے محروم ہوتی چلی گئی اور اہل علم اس سے مرعوب ہو کر گھائل ہوتے چلے گئے۔

اللہ تعالیٰ کی اس کائنات میں چند اہل قوانین میں سے یہ بھی ہے کہ ”توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسم سامری“ نیز۔۔۔ ہر فرعون نے راموسی۔ اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر اسلام کے دفاع اور احقاقِ حق کے لئے جن ہستیوں کو اٹھایا اور ان سے اسلام کے فروغ کا کام لیا ان کی طویل فہرست میں ایک نمایاں نام امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ بھی ہے۔

ہارون الرشید علم دوست حکمران تھا مگر اس کی سادگی کی آڑ میں یونان، یورپ اور ہندوستان کے ملحدانہ نظریات عربی میں ترجمہ ہو کر عالم اسلام میں آگئے اور عقلیت پرستی کو فروغ ہوا اس دور میں دین سے انحراف کرنے والے اس طبقہ کو ”معتزلہ“ کا ایک مجموعی نام دیا گیا یعنی جو لوگ راہِ حق اور راہِ اعتدال سے خود ہٹ چکے ہیں وہ اعتزال کا شکار ہو کر خود معتزلہ ہو گئے ہیں۔ ان

میں مختلف SHADES تھے مگر بنیادی گمراہی ایک ہی تھی وحی آسمانی کی تشریحات میں سنت کی بجائے اپنی عقل کو فیصلہ کن حیثیت دے دینا جبکہ اہل سنت اور اہل حق کی راہ یہ تھی وہ قرآن پاک کی وہی تشریح معتبر سمجھتے تھے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ذریعے احادیث کی روشنی میں ہم تک پہنچی ہے۔

لہذا اسی دور میں معتزلہ کے زیر اثر اور معاشرے کی ضرورت کے مطابق حدیثوں کو بھی گھڑا گیا اور ”موضوعات“ کا انبار لگ گیا۔ تاہم علمائے حق نے احادیث جمع کرنے کا بیڑا اٹھایا اور رطب و یابس کے اس ذخیرہ سے کھرا کھوٹا الگ کر دیا اور احادیث کے مجموعے ترتیب پاگئے چنانچہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کاوش یہ بھی فرمائی ہے کہ احادیث کو مسائل کی ترتیب سے لکھنے کی بجائے مجموعی طور پر راویان یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ناموں کی حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب احادیث کو جمع کر دیا یوں کسی صحابی کی مرویات کو ایک نظر میں دیکھا جاسکتا ہے۔

دوسرا بڑا کام امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا مسئلہ ”خلق القرآن“ کے سلسلے میں حکمران مامون الرشید کے دربار میں اپنے موقف پر ڈٹ جانا ہے۔

ہوایوں کہ ہارون الرشید پر اعتزال اور عقلیت پرستی کا زیادہ اثر ہوا گیا تھا یا وقت کے ساتھ دینی اثرات میں کمی آرہی تھی اور ہر آنے والی نسل پچھلی نسل کے مقابلے میں دینی علم اور ایمانی کیفیات کے اعتبار سے کمزور ہو رہی تھی۔ مامون الرشید نے اقتدار سنبھالا تو اس نے معتزلہ کی سرکاری حمایت شروع کر دی اور اعتزال کے نظریات کو سرکاری مذہب قرار دے دیا۔ اس فیصلے سے اسلامی مقبوضات کے طول و عرض میں اباحت پرستی، آزاد خیالی، سنت سے اعراض اور روشن خیالی کی فضا ہموار ہونے لگی۔

دراصل اس سارے کھیل میں درپردہ عناصر بالخصوص یہود نے گل کھلائے اور اس تیر سے اسلامی تعلیمات کے ماخذ اول قرآن مجید کو نشانہ بنایا اور معتزلہ کو استعمال کیا۔ ان کا موقف یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ خالق ہے اور اس نے ہر چیز پیدا کی ہے لہذا اس نے قرآن مجید کو بھی پیدا کیا ہے۔ ہر مخلوق پرانی بوسیدہ اور ازکار رفتہ ہو جاتی ہے لہذا اب دو صدیوں کے بعد قرآن بھی پرانا ہو چکا ہے حالات بدل چکے ہیں لہذا اب قرآنی ہدایت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات ناکافی ہیں لہذا اب نئے حالات میں اہل دانش کو اپنے لئے خود راستے نکالنے چاہئیں گویا آزاد خیالی اور سیکولر ازم کی طرف

سفر شروع ہو جانا چاہیے (اس فکر کے عام ہونے سے معاشرے کی مطلقاً رہنمائی کا اختیار اہل دانش کے پاس آ جاتا ہے جنہیں پیسے کے بل بوتے پر خرید کر پس پردہ عناصر اپنی مرضی کرتے ہیں اور دراصل یہ اختیار یہود کے ہاتھوں میں پہنچ جاتا ہے جیسا کہ بعد میں یورپ میں ہوا۔)

مامون الرشید دانستہ یا نادانستہ اس سازش میں شریک ہو گیا اور معتزلہ کے بے بنیاد اور من گھڑت موقف کے مخالفین اہل حق پر ظلم و تشدد کا دروازہ کھول دیا اور اہل حق قید کر دیے گئے ظلم و ستم کا نشانہ بنائے گئے اور بہت سے علماء کو جبراً اس کا قائل کیا گیا اور بعض کو روپے اور عہدے کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا یا گیا۔

ہزاروں اہل حق نے اس سرکاری موقف کو رد کر دیا اور صدائے احتجاج بلند کی اس طبقہ کی اہل حق کے سرخیل تھے حضرت امام بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ، جو مامون الرشید کے سامنے ڈٹ گئے اور سرکاری موقف ماننے سے انکار کر دیا اور قرآن مجید کو ”کلامِ الہی“ کہہ کر اس کے مخلوق یا غیر مخلوق کا فلسفہ ہوا میں اڑا دیا۔

سرکاری سطح پر ظلم و تشدد کے نتیجے میں آپ قید و بند کی صعوبتیں اور اذیتیں سہتے رہے مگر قرآن مجید کے تاقیام قیامت ہدایت اور ابدی ہدایت ہونے کے موقف سے سرمونہ ہٹے۔ اس سے عوام میں ان کی عزت اور نیک نامی کو خوب شہرہ ہوا اور آپ عوام کے دلوں کی آراء بن گئے۔ مامون الرشید کے بعد دوسرے حکمرانوں نے بھی کوششیں کی مگر آپ حق پر ڈٹے رہے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کو اتنا مارا گیا اور پیٹا گیا کہ اگر ہاتھی کو بھی مارا جاتا تو چیخ اٹھتا مگر آپ نے یہ ساری صعوبتیں خندہ پیشانی سے برداشت کر لیں۔ پھر اگلے حکمران المتوکل کے دور میں اس سرکاری موقف کو بے ہودہ قرار دے کر ترک کر دیا گیا اور اہل سنت کے موقف کو سرکاری موقف قرار دیا گیا تو آپ کو قید و بند سے آزادی ملی آپ کو انعامات سے نوازنے — کی کوشش کی گئی مگر آپ نے کسی قسم کا انعام و اکرام لینے سے گریز کیا اور ناپسند فرمایا۔

آپ کی بے پناہ ہمت اور چٹان کی طرح حق پر ڈٹ جانے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے امت کو ایک بڑی گمراہی سے بچالیا اور یوں یہود اور اسلام دشمنان کی ایک اور سازش ناکام ہو گئی۔ جس سے دشمنانِ اسلام کو اس محاذ پر صدیوں سر اٹھانے کی ہمت نہیں ہوئی اور انہوں نے دل کا

کینہ اور بغض نکالنے کے لئے اور میدان منتخب کر لئے۔

مسند احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی صورت میں احادیث کو جمع کرنا، ساری زندگی حق کا ساتھ دینا اور خلق قرآن کے مسئلے پر ”کلامِ الہی“ کے موقف کو بلند کر کے (قرآن کے ابدی ہدایت ہونے) اس پر قائم رہنا آپ کے کارناموں میں نمایاں ہیں۔

ذاتی حالات و کوائف

نام، احمد۔ والد کا نام، محمد۔ شجرہ نسب یوں ہے: احمد بن محمد بن حنبل بن ہلال۔
پیدائش: 164ھ / 780ء بغداد، وفات: 240ھ / 855ء۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نسلاً عرب تھے اور بنو شیبان کی ایک شاخ سے تعلق رکھتے تھے خاندان کی سکونت پہلے بصرہ میں تھی مگر آپ کے دادا حنبل بن ہلال مرد شہر چلے گئے وہاں سے آپ کے والد محمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ بغداد چلے گئے آپ وہیں پیدا ہوئے۔ آپ نے لغت، فقہ اور حدیث کی ابتدائی تعلیم یہیں حاصل کی، بعد ازاں عراق، حجاز، یمن اور شام کے سفر کیے تاہم آپ کا زیادہ تر قیام بصرہ میں رہا پانچ بار حج بھی کیا۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے اساتذہ میں قاضی ابو یوسف، سفیان بن عیینہ، عبدالرحمن بن مہدی اور واقع بن جراح رحمۃ اللہ علیہ زیادہ اہم ہیں۔ بقول ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ علم فقہ میں آپ نے زیادہ تر دبستان سے تحصیل علم کیا۔

جب مامون الرشید نے معتزلہ کی حمایت کا اعلان کیا تو امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے دور ابتلاء کا آغاز ہوا۔ آپ نے مامون کی سختیوں کے برعکس خلق قرآن کے نظریہ کو ماننے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ انہیں گرفتار کر کے پابہ زنجیر مامون کی طرف روانہ کر دیا گیا جو اس وقت طرطوس میں مقیم تھا ابھی آپ راستے ہی میں تھے کہ مامون کا انتقال ہو گیا چنانچہ آپ کو واپس بغداد کے قید خانے میں بھیج دیا گیا۔ اگرچہ نیا خلیفہ لمعتصم اس سزا کو ختم کرنا چاہتا تھا مگر سرکاری عمال کے خوف اور مشوروں کی بنا پر وہ ایسا نہ کر سکا۔ ایک بار دوبارہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کو خلیفہ لمعتصم کے سامنے پیش کیا گیا جہاں آپ نے دوبارہ خلق قرآن کے عقیدے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا چنانچہ آپ کو بری طرح زد و کوب کیا گیا تاہم آپ کو زندان سے رہائی مل گئی اور آپ اپنے گھر چلے گئے جس کے

بعدا لمعتصم کے سارے عہد میں گوشہ نشین رہے اور درس و تدریس سے احتراز کرتے رہے۔

232ھ/847ء میں جب متوکل برسر اقتدار آیا اور معتزلہ کا دور ختم ہوا اور سُنی مذہب

سرکاری طور پر دوبارہ اختیار کر لیا گیا تو امام احمد بن حنبل نے بھی درس و تدریس دوبارہ شروع کیا۔ کہا جاتا ہے کہ آپ پر ظلم و ستم کروانے والوں میں ایک معتزلی قاضی احمد بن داؤد بھی تھا جسے اب معزول کر دیا گیا۔ 237ھ/852ء میں متوکل نے آپ کو سامرا میں طلب کیا تا کہ آپ سے ترویج سنت اسلام کے لئے مدد لے سکے۔ سامرا پہنچنے پر حاجب نے آپ کی بڑی آؤ بھگت کی اور ایٹاخ کے برتکلف محل میں ٹھہرایا۔ شہزادہ المعتز سے بھی ملاقات ہوئی مگر آپ کی عمر اور صحت کے پیش نظر آپ سے کوئی خدمت نہ لی جاسکی کچھ عرصہ یہاں قیام کرنے کے بعد آپ بغداد چلے آئے جہاں 75 برس کی عمر میں وفات پائی اور شہیدوں کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی دو منکوحہ بیویوں سے ایک ایک بیٹا صالح اور عبداللہ پیدا ہوئے اور ایک لونڈی کے بطن سے چھ بچے پیدا ہوئے۔ آپ کی تعلیمات کا زیادہ تر حصہ صالح سے منقول ہے، جو بغداد میں 203ھ/818ء میں پیدا ہوئے اور 266ھ/879ء میں فوت ہوئے اور آپ کے ادبی کام کا زیادہ تر حصہ عبداللہ کے واسطے سے ہم تک پہنچا ہے جو بغداد میں 213ھ/828ء کو پیدا ہوئے اور 260ھ/903ء میں فوت ہوئے۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی حیثیت ایک مجتہد کی ہے جنہوں نے بقول ابن تیمیہ احادیث و اخبار کے انبار میں سے اپنا مسلک خود تلاش کیا اور اپنی ذاتی رائے کے ساتھ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا صحیح مفہوم سمجھا اور ان سے پیدا شدہ نتائج کا استخراج کیا۔

عقائد، اخلاق اور فقہ ہر قسم کے مسائل میں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے رجوع کیا جاتا تھا اور آپ اپنے فتویٰ پوچھنے والوں کو تنبیہ کرتے تھے کہ وہ ان کے افکار کو مدون کرنے سے پرہیز کریں۔ حنبلی مذہب کے ایک بڑے شارح امام ابن تیمیہ تھے چنانچہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی زیادہ تر تعلیمات کا ماخذ انہی کی تحریریں ہیں جن کے زیر اثر بعد میں کئی تحریکیں بھی اٹھیں ہیں۔

خوشا رسی بہ خاک و خون غلطیدن

خدا رحمت کند ایس عاشقانِ پاک طینت را



حجۃ الاسلام حضرت

محمد بن محمد

امام غزالی

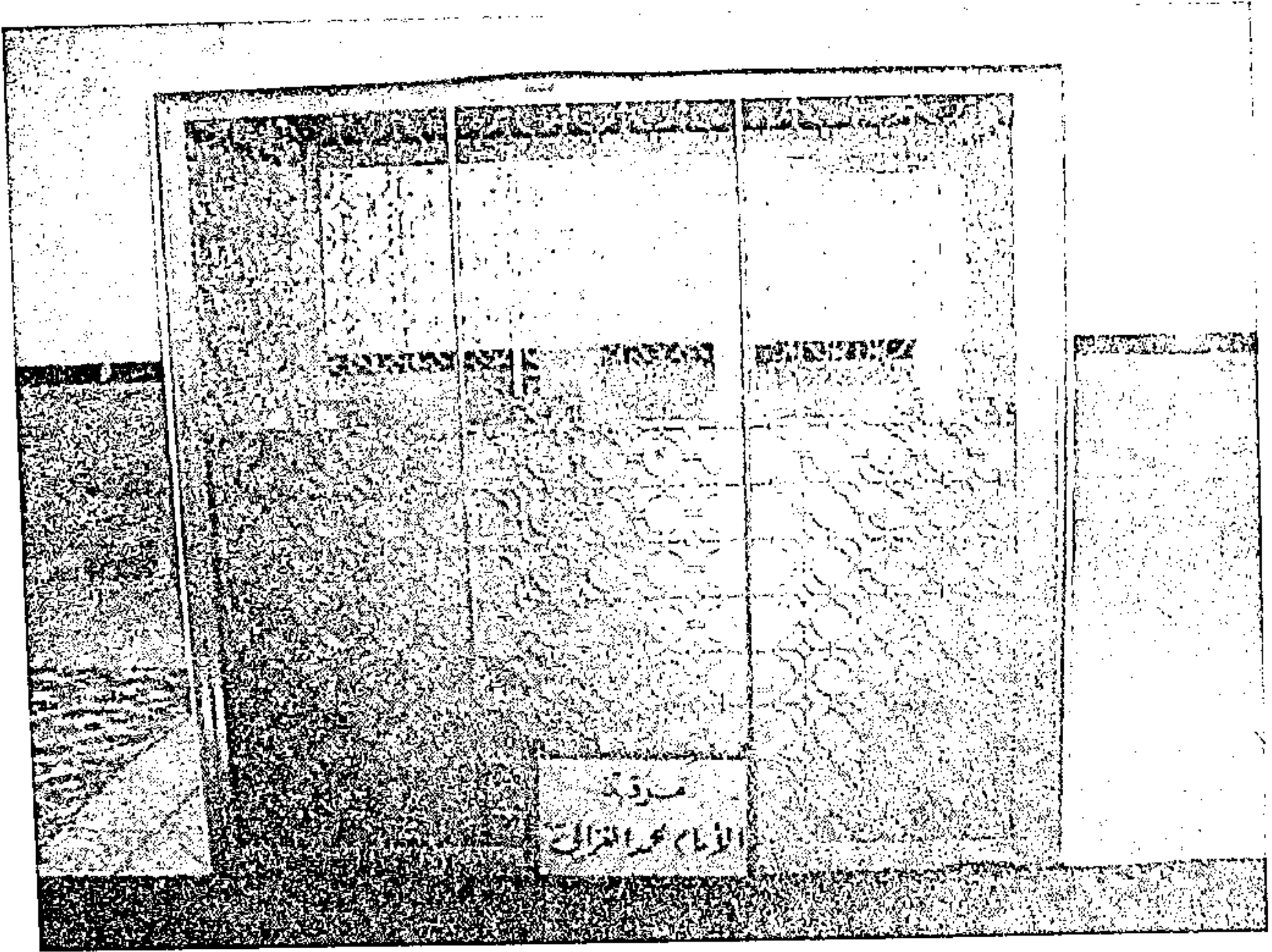
ولادت : 445ھ / 1059ء بمقام طوس

○ 484ھ میں دارالعلوم نظامیہ بغداد کے اعلیٰ افسر مقرر ہوئے

جس کے بعد امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کو بڑی علمی شہر حاصل ہوئی۔

وفات : 505ھ / 1111ء

مدفن : طوس (صوبہ خراسان)



مدفن: حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ، طوس (خراسان)

آپ کا زمانہ پانچویں صدی ہجری ہے جو سن عیسوی کے اعتبار سے گیارہویں صدی کا آخری حصہ اور بارہویں صدی کا ابتدائی حصہ بنتا ہے۔ یہ دور ہے جس میں دورِ بنو عباس کے حکمران بہت کمزور ہو گئے تھے اور سلطنت زوال کا شکار تھی اور بہت کمزور ہو گئی تھی۔

دورِ بنو عباس کا آغاز 132ھ اور 750ء سے ہوتا ہے۔ ابتدائی 115 سال انتہائی شاندار اور دنیاوی اعتبار سے رعب و دبدبہ اور آسودگی اور خوشحالی کے ہیں، دنیا میں اس جیسی کوئی اور حکومت نہیں تھی۔ پھر 200 سال شکست و ریخت اور باہمی رنجشوں کے ہیں اس کے بعد دورِ زوال ہے اور علاقائی طاقتوں کی مرکز سے علیحدگی اور دشمنوں کے ہاتھوں کھلونا بن کر اسلام کو نقصان پہنچانے کے ہیں تا آنکہ 1258ء میں یہ سلطنت سیاسی طور پر بھی ختم ہو گئی۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کو دورِ زوال کا عرصہ دیکھنا پڑا اور سیاسی طور پر مسلمان سلطنت عباسیہ کی وسعت کے باوجود اتنے کمزور تھے کہ 1097ء میں پورا مسیحی یورپ صلیبی جنگوں کا آغاز کر کے بیت المقدس مسلمانوں سے چھین چکا تھا اور پھر تقریباً ایک صدی بعد 1190ء میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے صلیبوں کا مقابلہ کر کے مسلمانوں کو بیت المقدس واپس دلایا ہے۔

دوسری صدی ہجری میں جب یونان، ایران اور ہندوستان کے فلسفیوں کی کتابیں عربی میں ترجمہ ہوئیں اور اسلام کی تعلیمات کو بھی عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کا رواج چل نکلا تو اسلام کی تمام تعلیمات اور مابعد الطبیعیاتی تصورات کے بارے میں شکوک و شبہات جنم لینے لگے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات، فرشتے، وحی، قرآن، جنت دوزخ، برزخ ہر چیز کے بارے میں عوام میں بے یقینی کی کیفیت عام ہوتی چلی گئی۔ اہل حق اور علماء صادقین کی طرف سے اس سلسلے میں جو دفاعی کوششیں کی گئیں جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے اس امت کے ایک بڑے حصے کا ایمان

بچالیا۔ یہ دفاعی کوششیں درج ذیل امور پر مشتمل ہیں:

- 1- اسلامی عقائد کا دفاع۔
- 2- اسلامی قانون اور شریعت کا دفاع۔
- 3- قرآن مجید کے متن کا دفاع۔
- 4- احادیث رسول ﷺ کی حفاظت اور دفاع۔
- 5- احادیث رسول ﷺ میں صحیح و غلط کی چھانٹی۔
- 6- اسلامی عقائد کو اہل عقل کے سامنے پیش کرنے اور اہل عقل (معتزلہ یا عقلیت پرستی) کے لئے ایک طرز استدلال نے جنم لیا اور ہوتے ہوتے راسخ ہو گیا یہ فن اور علم ”علم الکلام“ تھا۔
- 7- اسلامی حکومت کی حمایت اور استحکام۔
- 8- اسلامی احکام کی تبلیغ و ترویج کے لئے اداروں اور مدارس کا قیام۔
- 9- اسلامی تعلیمات کی حفاظت اور فروغ کے لئے تصنیف و تالیف کا سلسلہ۔
- 10- اسلام کی تعلیمات کو ظاہر پرستی سے بچانے کے لئے اور خلوص و اخلاص سے ماہل کرنے کے لئے تصوف کے سلسلوں کا آغاز اور ان کی ترویج۔

اسی دوران میں اسلام دشمن قوتوں نے اسلام کو نقصان پہنچانے اور اس قرآن اور آخری شریعت کو دنیا سے غائب کرنے کے لئے بے شمار جتن کیے اور کوششیں کیں جن میں سے کچھ اقدامات درج ذیل ہیں:

- (I) یونانی، ایرانی اور ہندوستانی فلسفہ کو عام کرنا۔
- (II) اسلام کے بنیادی عقائد کو موضوع بحث بنانا اور عوام کو عقل کے استعمال اور عقلیت پرستی کا قائل کر کے ہر چیز کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کا عادی بنانا تاکہ اسلام کی اساسات پر ان کا یقین و ایمان اٹھ جائے گا اور وہ مسلمان ہوتے ہوئے بھی مسلمان نہیں رہیں گے۔
- (III) ان فلسفیانہ بحثوں کا آغاز اور اسلام کو عقل کے خلاف ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگانا۔
- (IV) اس رخ پر پروان چڑھنے والے ذہین افراد کی حوصلہ افزائی اور مالی سرپرستی۔

- (V) ایسی سرگرمیوں کی مالی سرپرستی اور اس کے فروغ میں ہر ممکن تعاون۔
- (VI) اسلام اور مسلمانوں کی حکومت کو سیاسی طور پر کمزور کرنے کے لیے مرکز گریز قوتوں کی تشکیل اور ان کی حوصلہ افزائی۔ فاطمی حکومت 909ھ - 1171ء۔
- (VII) عالم اسلام سے باہر قوتوں کو مجتمع کر کے اسلامی حکومت پر حملہ کی ترغیب اور اس کی مدد تاکہ اس کو ختم کیا جاسکے۔ گیارہویں صدی کے اواخر میں صلیبی جنگوں کا آغاز اور اس کی سرپرستی جس سے بیت المقدس مسلمانوں کے ہاتھوں سے جاتا رہا۔
- (IX) متکلمین اور باطنیہ فرقوں کا فروغ اور تصوف کے حلقوں میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش۔

(X) اسلامی عقائد، عبادات اور تاریخ کو مستقل طور پر مشکوک بنانے کے لئے حدیث کی کتب میں تدلیس، مشاہیر اسلام کی کتابوں میں فرضی اضافے اور تاریخ و تصوف کی کتابوں میں من گھڑت عبارات کا اضافہ۔ تاکہ باہمی چپقلش اور عدم اعتماد کی صورت پیدا ہو جائے۔ اس میں پریس کی عدم موجودگی میں ہاتھ سے کتابیں لکھنے کے فن نے اس سلسلے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ احادیث کے ضمن میں فرضی اور من گھڑت حدیثوں کی بھرمار کر دی گئی تاکہ حق و باطل میں تمیز مشکل ہو جائے۔

ان حالات میں متکلمین اور فلاسفہ کے بے شمار SHADES سامنے آ گئے اور متکلمین میں ہزاروں افراد پیدا ہوئے ہیں جن میں چند افراد نے اسلام کی بہت زیادہ خدمت کی اور ان کا نام رہتی دنیا تک یاد رہے گا۔ ان میں سے اہم شخصیت یہی حضرت امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ اس دور میں فلاسفہ میں بھی کئی ہستیاں پیدا ہوئیں جو خلوص اور اخلاص کے باوجود صرف فلسفہ کے میدان کی وجہ سے مسلمانوں میں مشہور تو ہوئیں تاہم عوامی سطح پر دلوں کی دھڑکن نہ بن سکیں۔ ان مشاہیر عالم ہستیوں میں ابوالنصر فارابی 870ء - 990ء (ایران)، ابن سینا 980ء - 1037ء (بخارا) ابن رشد 1126ء - 1198ء (اندلس) عمر خیام 1039ء - 1131ء (ایران) بہت نمایاں ہیں۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے فلسفیانہ نظریات کے خلاف خوب جہاد کیا اور تہامہ الفلاسفہ کے نام سے کتاب لکھی۔ اسلام کے عقائد اور اصلاحی خیالات کو مدون کر کے عام کیا۔ اسلام کی بنیادی تعلیمات کے تحفظ اور فروغ کے لئے رات دن ایک کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی علمی زندگی کے 40 سالوں میں ان کی تصنیفات 16 صفحات روزانہ کے حساب سے ہیں جو بہت بڑی خدمت ہے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی زندگی ہی میں بڑی شہرت دے دی تھی اور مسلمانوں کی آنکھوں کا تارا بن گئے تھے۔ احیاء العلوم اور کیمیائے سعادت ان کی شہرہ آفاق تصانیف ہیں۔

بعد کے مسلمانوں میں جو خیالات تاریخ، ادب، تصوف اور فلسفہ کے بارے میں عام ہوئے وہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے ہی تجویز کردہ اور پروان چڑھائے ہوئے ہیں۔ بقول نظیری

خلاف رسم دریں عہد ز خرق عادت داں
کہ کارہائے چین از شمار بواجبی ست!

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے کارنامے

امام صاحب نے امت مسلمہ کی زبوں حالی کو دیکھ کر اور فلسفہ و منطق میں عمومی دلچسپی کی وجہ سے مسلمانوں کی فکری پس ماندگی کے تناظر میں جو کام کیا اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری کیا وہ بہت قابل قدر ہے۔ تہافتہ الفلاسفہ، احیاء العلوم اور کیمیائے سعادت جیسی شہرہ آفاق تصانیف آپ کے تجدیدی کارناموں کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے شاگردوں کی محنت سے مسلمانوں میں ایک عمومی بیداری پیدا ہوئی اور اسلامی افکار کے تحفظ کی راہ ہموار ہو گئی چنانچہ بعد کی چھ سات صدیوں میں عالم اسلام میں مسلمانوں کے جو مذہبی افکار عام ہوئے وہ سب امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ ہی کے مدون کردہ ہیں چنانچہ اخلاق، عقائد، معاشرت، حقیقت، تصوف، تفسیر، کلام ہر شعبہ میں ان کی اصلاحی اور تجدیدی مساعی کا عمل دخل نمایاں ہے۔

چنانچہ تاریخ اسلام کے ادبی طالب علم کی حیثیت سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مسلمانوں کے پہلے عروج و زوال (عربوں کے ذریعے) کے بعد دوسرے عروج کے فاتح امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ چنانچہ ترکوں میں سلطنت عثمانیہ، شمالی افریقہ اور ہندوستان کی مسلمان حکومتوں پر

ان کے بڑے گہرے اثرات ہیں۔

ذاتی حالات و کوائف

نام محمد، لقب حجۃ الاسلام، پیدائش 445ھ/1059ء صوبہ خراسان کے شہر طوس میں۔ وفات 505ھ/1111ء۔ امام صاحب کے والد روئی کا کاروبار کرتے تھے اس مناسبت سے ان کا خاندان ”غزالی“ کہلایا۔ روئی کا تنے والے کو عربی میں ’غزالی‘ کہتے ہیں۔ امام صاحب کے والد خود تو تعلیم یافتہ نہ تھے لیکن اپنے بیٹوں کو تعلیم دلانے کا بہت شوق تھا اس لیے مرتے وقت اپنے دونوں بیٹے ایک بزرگ کے سپرد کیے کہ ان دونوں بھائیوں کو تعلیم دلوادو۔

اساتذہ

امام صاحب کے اساتذہ میں ابواسحاق شیرازی، حافظ عمر بن الحسن طوسی، امام ابو نصر اسماعیلی اور ابو احمد اسفرائینی رحمہم اللہ ہیں۔ ابواسحاق شیرازی جب تک حیات رہے اس وقت تک نیشاپور میں ان کے پاس پڑھتے رہے ان کے انتقال کے بعد نیشاپور سے اس شان کے ساتھ نکلے کہ تمام ممالک اسلامیہ میں ان کا کوئی ہمسر نہ تھا اس وقت ان کی عمر 28 برس تھی۔

نیشاپور سے آپ نظام الملک طوسی کے دربار میں پہنچے آپ کی علمی شہرت کی بنا پر نظام الملک نے بڑی تعظیم کی اور علمی مناظروں کا اہتمام کیا، مناظروں میں امام صاحب ہی غالب رہتے۔ اس پر آپ کی بڑی شہرت ہوئی اور نظام نے انہیں مدرسہ نظامیہ کا اعلیٰ افسر مقرر کر دیا اس وقت عمر 34 برس تھی اتنی عمر میں یہ منصب امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ سے پہلے کسی کو بھی حاصل نہیں ہوا تھا۔ جب آپ نے مدرسہ نظامیہ کی مسند تدریس سنبھالی تو تھورے عرصہ میں علم و فضل کی دھاک بیٹھ گئی حتیٰ کہ سلطنت کے اہم امور بھی آپ کی شرکت کے بغیر انجام نہیں پاتے تھے۔ خلیفہ مستنصر باللہ نہایت علم دوست اور قدردان ہونے کی بنا پر امام صاحب کی حد درجہ قدر کرتا تھا جب فرقہ باطنیہ نے زور پکڑا تو اس نے امام صاحب سے اس کے رد میں کتاب لکھنے کی درخواست کی، اس کتاب کا نام بھی انہوں نے ”مستنصر رکھا۔“

اس وقت چار فرقے مشہور تھے مُتکلمین، باطنیہ، فلاسفہ اور صوفیہ۔ امام صاحب نے ان سب فرقوں کے علوم و عقائد کی تحقیقات شروع کیں، قدماء کی ساری تصانیف پڑھ ڈالیں۔

448ھ سے آپ نے صوفیانہ طرز زندگی اختیار کر لیا اور دمشق پہنچ کر مجاہدہ ریاضت شروع کر دی۔ مراقبہ وغیرہ کے ساتھ ساتھ جامع اُموی میں درس بھی دیتے رہے۔ دو برس بعد بیت المقدس زیارت کے لیے گئے زیارت کے بعد حج کے ارادہ سے مصر اور اسکندریہ سے ہوتے ہوئے مکہ پہنچے۔ حج کے بعد عہد کر لیا کہ کسی بادشاہ کے دربار میں نہ جاؤں گا نہ ہی عطیہ قبول کروں گا اور نہ ہی مناظرہ کروں گا چنانچہ مرتے دم تک اس عہد پر قائم رہے۔ امام صاحب نے احیاء العلوم اسی سفر میں تصنیف فرمائی۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ تقریباً بیس سال کے تھے کہ تصنیف و تالیف کا شغل اختیار کر لیا درس و تدریس ہمیشہ جاری رکھی، ان کے تلامذہ کی تعداد کسی وقت بھی ڈیڑھ سو سے کم نہیں رہی۔ تصوف کے مشاغل کے علاوہ دور دور سے فتاویٰ آتے ان کا جواب الگ دیتے اس کے باوجود آپ نے سینکڑوں کتابیں لکھیں۔ چند مشہور تصانیف درج ذیل ہیں:

تصانیف

- | | | |
|--------------------|---------------------|-------------------------------|
| 1- ویط | 2- بسیط | 3- خاصۃ الرسائل |
| 4- تحصیل الماخذ | 5- شفاء العلیل | 6- مفصل الخلاف فی اصول القیاس |
| 7- معیار العلم | 8- محکم النظر | 9- میزان العمل |
| 10- مقاصد الفلاسفہ | 11- تہافتہ الفلاسفہ | 12- منقذ |
| 13- الجام التوام | 14- احیاء العلوم | 15- کیمیائے سعادت |
| 16- مشکورۃ الانوار | 17- منہاج العابدین | |



5

شیخ المشائخ، ولی کامل

حضرت

عبدالقادر جیلانی

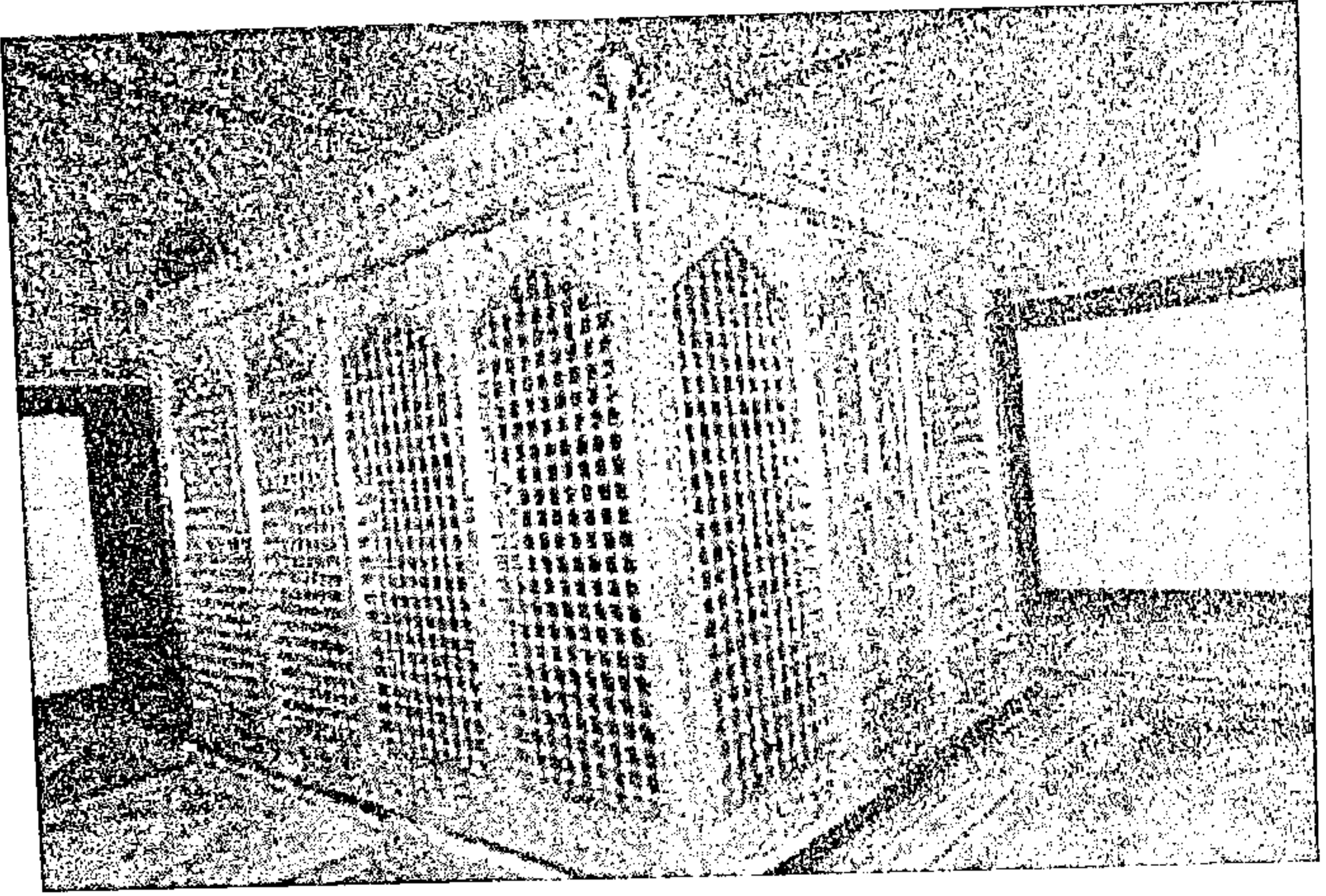
رحمۃ اللہ علیہ

ولادت: 1077ء / 470ھ جیلان

○ عوامی وعظ و نصیحت کا آغاز 512ھ

○ سفر ملتان 1128ء

وفات: 1162ء / 561ھ بغداد



مدن: حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ، بغداد

شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ جو عوام میں ”پیرانِ پیر“ کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ کی ولادت 1077ء/470ھ میں اور وفات 1162ء/561ھ میں ہوئی۔ آپ بحیرہ کیسپین کے جنوبی علاقے جیلان میں پیدا ہوئے، جوانی کے بعد زیادہ وقت بغداد میں گزارا۔

آپ زمانی اعتبار سے بھی امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ سے پہلے کے ہیں نیز آپ کا مقام و مرتبہ اور زندگی بھر کی مساعی بھی متکلمین اور اصحابِ طاہر کے درمیان بیچ کی راہ کی ہیں۔ فکری اور نظری لحاظ سے آپ کا مقام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے افکار کی دو انتہاؤں کے درمیان موافقت کا ہے آپ نے اس فکری خلیج کو پاٹنے (BRIDGE کرنے) کی کوشش فرمائی ہے۔ گیارہویں صدی عیسوی میں جو فکری دھارے اُمتِ مسلمہ کے پیکر میں جاری تھے ان کا SYNTHESIS یا نقطۂ اتصال جس شخصیت کے روپ میں ڈھل کر دنیا کی نگاہوں کے سامنے آیا اس شخصیت کا اسم مبارک شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے پیروکار تو آپ کی شخصیت کے آج بھی قدردان ہیں مگر امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے پرستار شیخ جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ کرنا بھی مناسب نہیں سمجھتے اگرچہ مسلکِ شیخ جیلانی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔

آپ کے دور میں ایک طرف عجمی فلسفیانہ نظریات بالخصوص یونانی فلاسفہ کا چرچا عروج پر تھا اور اسلام کی طرف سے صفِ اول میں متکلمین کا گروہ مردانہ وار ان کا مقابلہ کر رہا تھا اور اسلامی عقائد اور ایمانی کیفیات اور اثرات کے علاوہ اسلامی روایات اور ثقافت کے تحفظ کا بھی ضامن تھا۔ اس جدوجہد میں دوسری انتہاء پر اصحابِ طاہر تھے جن کے طبقہ متقدمین میں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ تھے اور بعد میں یکے بعد دیگرے کئی اصحابِ علم و فضل میدان میں اپنے جوہر دکھاتے رہے۔ اس طبقہ میں آخری اور بلند ترین مقام میں امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ یا ان کے شاگرد

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ ہیں۔

اس نظریاتی اور فکری کشاکش کے نتیجے میں اگرچہ مسلمانوں کا مجموعی عمل کے اعتبار سے گراف نیچے سے نیچے ہی گرتا رہتا رہا تاہم اس کا ایک فائدہ ہوا کہ قرآن مجید اور احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے تحفظ کا بندوبست ہو گیا جس سے آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے ہدایت کے بنیادی ماخذ زمانے کی دستبرد اور دشمنوں کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رہ گئے۔

شیخ موصوف علیہ الرحمہ کے زمانے میں اوپر درج خارجی حالات کے علاوہ چند اور باتوں کا ذکر ناگزیر ہے تاکہ اس ماحول کے پس منظر (SCENARIO) میں آپ کے اصلاحی اور تجدیدی کارناموں نیز امت مسلمہ کی بیداری کے لئے آپ کی کوششوں کی اہمیت و افادیت کا اندازہ ہو سکے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کے زمانے یعنی گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی کے جن چند خاص تاریخی اور انسانی عوامل کا تذکرہ ضروری ہے، وہ درج ذیل ہیں:

مسلمانوں کی اچھا نئی زندگی نہیں اور عسکر کی اور ان کے لئے بوجھ کا نتیجہ

یہ بات ہمارے ایمان کا جزو ہے کہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات بنیادی طور پر ایک ہی تھیں البتہ سابقہ انبیاء علیہم السلام کی مساعی چونکہ وقتی تھیں اور اپنے اپنے علاقے اور قوم میں تھیں پھر ابتدا میں وسائل آمد و رفت بھی ناپید تھے مزید براں نبوت و وحی کا سلسلہ جاری تھا، اضمحلال اور بے عملی پر اللہ تعالیٰ نیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث فرما دیتے تھے اور یوں اسلام کی تعلیمات کا تسلسل قائم رہتا تھا تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ کے تحت نبی آخر الزمان حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور ان کو رحمت للعالمین بنا دیا۔ اپنے زمانے میں بھی وہ کل روئے ارضی کے لئے نبی تھے اور تا قیام قیامت بنی نوع انسان کی طرف بھی نبی ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کئی اعتبار سے منفرد ہیں اور آپ کا دور مبارک نوع انسانی کے بلوغ کا زمانہ اور دور جدید کا افتتاحی دور ہے۔ لہذا آپ کی تعلیمات کی وسعت بھی زیادہ ہے اور زمانی تسلسل بھی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی (اور تمام انبیاء علیہم السلام کی) تعلیمات کا خلاصہ چند جملوں میں

بیان کیا جائے جس میں آپ کی ذاتی زندگی کی درخشاں مثالیں، غارِ حرا سے ہجرت تک کے مراحل، ہجرت سے میثاقِ مدینہ، بدر و اُحد، خندق کے معرکے — صلح حدیبیہ، خیبر اور فتح مکہ کی کامراناں — پھر حنین، موتہ اور تبوک کے مراحل — نیز اسلام کی تعلیمات کا عملی نمونہ اور — نفاذِ حدود اللہ کا مرحلہ سب کی سب اس میں سما جائیں — وہ یہ ہے کہ:

○ آپ ﷺ نے تاریخ انسانی کی عمومی سوچ یعنی انفرادی زندگی اور اجتماعی زندگی کے فرق کو مٹا کر زندگی کے تمام شعبوں کو ایک وحدت قرار دے دیا اور اس مجموعے کو اللہ تعالیٰ اور اس کی شریعت و تعلیمات یا قرآن و سنت کے تابع کر دیا کہ زندگی کا کوئی گوشہ (WALK OF LIFE) اس سے مستثنیٰ نہ رہا۔ یہ آپ ﷺ کی انقلابی شان تھی اور ختم نبوت کے نتیجے میں انفرادیت — اور منفرد ہونے کے تقاضوں کا عملی نمونہ تھا، تاریخ میں اجتماعی سطح پر اور وسیع پیمانے پر یہ کام پہلی مرتبہ ہوا تھا۔ اس جدوجہد اور جہاد کے نتیجے میں سیرت و کردار کے لحاظ سے اہل ایمان (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) میں سے ایسی شخصیات اٹھیں کہ تاریخ انسانی میں ان کی مثال ملنا مشکل ہے اور بعض واقعات ایسے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم انسان نہیں کوئی SUPER MAN مخلوق لگتے ہیں اور ”مَا هَذَا بَشَرًا إِنْ هَذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ“ (یہ انسان نہیں ہے یہ تو کوئی معزز فرشتہ ہے) والا معاملہ محسوس ہوتا ہے۔

○ آپ ﷺ نے صحابہ کرام کی تربیت کر کے ایسی کندن شخصیات تیار کیں تھیں جو جامع الصفات اور کامل شخصیات تھیں جس کا تذکرہ سورۃ فتح کے آخری رکوع میں ہے کہ آپ ﷺ نے ان کو ”رات کا راہب“ اور ”دن کا مجاہد“ بنا دیا تھا۔

اس بات کو UNBELIEVABLE سمجھ کر ایرانیوں کے سپہ سالار نے اعتراف کیا تھا کہ یہ عام انسان نہیں ہیں۔ دنیا نے پہلے راہب بھی دیکھے تھے اور فوجی بھی۔ مگر وہ راہب بھی اور فوجی بھی 24 گھنٹے کے راہب اور فوجی ہوتے تھے راہب دن کا بھی راہب ہے اور رات کا بھی راہب اس کے شب و روز اسی کے گرد گھومتے ہیں۔ اور — فوجی 24 گھنٹے کے فوجی تھے وہ دن میں فوجی کی ذمہ داریاں ادا کرتے تھے اور رات کو عیاشی کرتے تھے اور شراب اور بدکاری کے بغیر رہ نہیں سکتے تھے۔

ہمارے پیغمبر ﷺ کا کارنامہ یہ تھا اور انقلابی شان اور انقلابی تربیت یہ تھی کہ آپ نے جو ”اصحاب“ اور اہل ایمان دنیا کے سامنے پیش کیے وہ ”رات کے راہب“ اور ”دن کے مجاہد“ تھے۔ ایک ہی انسان ہے وہ رات کو مصیٰٹی پر کھڑا اور ہا ہے سجدہ ریز ہے اور وہی شخص دن کو تلوار سنبھال کر گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھا جہاد کر رہا ہے۔

یہ منظر دنیا نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا؛ اسی لیے ایرانی فوج کیا ساری غیر مسلم دنیا پریشان تھی کہ ان کا مقابلہ مشکل ہے اور اس کی گواہی ایرانی سپہ سالار رستم نے یہ کہہ کر دی تھی کہ ”ہم رہبان باللیل و فرسان بالنہار“ (وہ رات کے راہب اور دن کے شاہسوار ہیں) یا۔۔۔ ع ”در کف جام شریعت در کفے سندان عشق“ ایک ہاتھ میں قرآن اور ایک ہاتھ میں تلوار کی حامل شخصیات تھیں جو حضرت محمد ﷺ نے تیار کی تھیں۔ تاہم حالات کے دباؤ اور قانون خداوندی اور فطرت انسانی کے عوامل کے تحت وہی کچھ ہوا۔۔۔ جسے رسول اللہ ﷺ نے خود فرمایا تھا:

خَيْرُ الْقُرُونِ قَرْنِي — ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ — ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ

یعنی میرے دور نبوت سے بعد کی وجہ سے ہر آنے والی نسل پہلی نسل سے علم و عمل میں نیچے ہوگی۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ خلافت راشدہ کے صرف ایک سو سال بعد یعنی تین نسلوں کے گزرنے پر مسلمانوں میں سیرت و کردار اور علم و عمل کے لحاظ سے زوال آتا چلا گیا۔

پہلی تقسیم یہ ہوئی کہ خلافت وراثت کے طور پر باپ سے بیٹے کو منتقل ہونا شروع ہوئی اور دین سے دُوری کے باعث حکمران سیاسی اعتبار سے منہ زور اور ناقابل اصلاح ہوتے چلے گئے علمائے حق حکمرانوں کو وعظ و نصیحت کرتے تھے اور توجہ دلاتے تھے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوتے تھے لہذا سیاسی حکمرانوں، بادشاہوں یا نام نہاد خلفاء کا طبقہ وجود میں آ گیا جو ہر طرح کی بے راہ روی، لوٹ مار جائز و ناجائز دولت کمانے کو و طیرہ بنا لیتے تھے۔ دوسری طرف اہل حق اور علماء حق تھے جو دین پر اپنی حد تک عمل کرتے تھے مگر اس کے نفاذ کی قوت سے محروم تھے وہ قوت نافذہ حکمرانوں کے پاس تھی جو اپنی عیاشی کے لئے اسلامی قوانین کا کلی نفاذ اپنے لیے موت سمجھتے تھے۔

○ پھر اس طبقہ علماء حق میں دو طرح کے لوگ نمایاں ہو گئے۔ ایک وہ جو علم کے پڑھنے پڑھانے میں نمایاں تھے اور دوسرے جو علم کے حصول کے ساتھ باطنی ایمانی کیفیات، نیت

کی درستی، اصلاح باطن اور خلوص و اخلاص کا اہتمام بھی کرتے تھے۔ یہ علماء اور صوفیاء کے دو علیحدہ رنگ کے لوگ معاشرے میں جگہ بنا کر عوام کی نگاہوں میں آچکے تھے۔ ان تینوں طبقات میں عام انسانی کمزوریوں کی بنیاد پر مخلص بھی تھے حق کے علمبردار بھی تھے اور دنیا پرست اور موقع پرست بھی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ انہیں حکمرانوں میں سے اٹھے اور خلیفہ راشد اور عمر ثانی کہلائے تاہم دور نبوت سے بعد کی بنا پر ان تینوں طبقات میں اہل حق کم سے کم اور دنیا پرستوں کی نسبت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ حضرت عبداللہ ابن مبارک رضی اللہ عنہ دوسری صدی کے بزرگ ہیں صاحب علم بھی ہیں صاحب سیف بھی ہیں ان کا مشہور شعر اپنے دور کے حالات کا مرثیہ ہے۔

وَهَلْ أَفْسَدَ الدِّينَ إِلَّا الْمُلُوكُ

وَ أَحْبَبَ أَسْوَأَ وَرُهْبَانَهَا

”بادشاہوں، علماء سُوء اور راہبوں کے سوا، دین میں فساد اور کسی نے پیدا نہیں کیا“

گویا — حکمرانوں میں غاصب ظالم دنیا پرست حاکم، علماء میں موقع پرست فتویٰ فروش سرکاری درباری علماء کا طبقہ اور صوفیاء میں نام نہاد صوفی اور لوگوں سے نذرانے وصول کرنے والے لوگ — بھی عام ہو رہے تھے۔ یہ حالات خلافت راشدہ (11ھ - 40ھ) کے صرف ایک صدی بعد (140ھ) دور بنو امیہ کا اختتام اور دور بنو عباس کے آغاز کی چند ہائیوں میں واضح اور نمایاں ہو چکے تھے۔

○ عوام کو لوٹنے والے تین طبقات کی تثلیث حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی دنیا میں اپنی گرفت مضبوط رکھتی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد میں غیر مسلم تو کیا خود مسلمانوں میں یہ طبقات عوام کو لوٹنے میں مشغول رہے اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے (ماسوائے چند تاریخی استثناءات کے جو شاذ کے حکم میں ہیں)۔

اس دوسری صدی میں اصلاحی کاموں کے لیے اہل حق علماء و صوفیاء نے کام شروع کیا ہے اور اسلام پر ہر چہا طرف سے اپنوں اور غیروں کی ہر یلغار کو اپنے سینوں پر روکا ہے اور جانوں پر کھیل کر اور ہر مصیبت اور آزمائش برداشت کر کے اسلام کا جھنڈا سر بلند رکھا ہے۔

دوسری اہم بات جو شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے دور میں نمایاں ہو چکی تھی کہ اسلام کا دفاع کرنے والے دو طبقات — متکلمین اور اصحاب ظاہر جو دونوں گروہ اپنے اپنے مخصوص انداز میں اسلام کا دفاع کر رہے تھے اور اسلام کی جنگ لڑ رہے تھے، اس موقع پر دشمنان اسلام نے بڑی چابک دستی سے ان دو گروہوں کو آپس میں لڑا دیا تھا تا کہ اصل دشمن درمیان سے صاف بیچ نکلنے میں کامیاب ہو جائے اور ثانیاً اسلام کی قوت کو آپس کی خانہ جنگی اور فرقہ واریت کی نذر کر کے مسلمانوں کو داخلی طور پر کمزور کر دیا جائے۔

افسوس کہ دور بنو عباس کے آغاز سے ہی ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ دشمن اپنے تمام مقاصد میں آہستہ آہستہ کامیاب ہوتا جا رہا تھا۔ اگرچہ مسلمانوں کا رعب داب، کروفترا اور حکومت و لشکر موجود تھے مگر وہ جذبہ اور شان آہستہ آہستہ ایمان کی کمزوری، دنیا پرستی اور حب جاہ کی وجہ سے ختم ہو رہی تھی۔

اس پس منظر میں جن اصحاب علم و دانش اور فہم و بصیرت نے دشمن کی چال کو سمجھ کر مسلمانوں کی داخلی لڑائی اور خانہ جنگی روکنے کی کوشش کی ہے وہ بہت عزت احترام کے حقدار ہیں

ع اُو گرامی تراست گو داناست

ان گرامی قدر اصحاب علم و فضل میں نمایاں نام
حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ہے

تیسری اہم بات یہ ہے کہ سیاسی طور پر بنو عباس کی حکومت بہت کمزور ہو چکی تھی اور حکمران طبقہ عیاشیوں اور بد معاشیوں میں پڑ چکا تھا، 300 سالہ اقتدار کی بنیادیں کمزور پڑ گئی تھیں، ترکستان، شمالی ایران وغیرہ کے علاقوں میں عباسی اقتدار کمزور اور سلجوقیوں کی حکومتیں مضبوط ہو گئیں تھی، دمشق، مصر، شمالی افریقہ میں بھی مقامی حکمرانوں نے سراٹھایا تھا اور مرکز بغداد سے علیحدگی اور بغاوت کی پالیسی پر عمل پیرا تھے۔ ذیل میں درج چند اہم واقعات اسی دور کی کیفیت کی عکاسی کرتے ہیں جو شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے دور میں ہوئے اور جن کے اسباب و عواقب ان کی نگاہوں میں تھے:

(i) مصر میں فاطمیوں کا اقتدار جس میں کعبہ کی بے حرمتی اور حجر اسود کو اکھاڑ کر مصر لے جانے کے روح فرسا سانحات بھی شامل ہیں۔

(ii) غیر مسلم اسلام دشمن قوتیں بالخصوص یہود اتنے مؤثر اور اپنی کارروائیوں میں آگے بڑھ گئے تھے کہ ساڑھے چار سو سال پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں فتح ہونے والے بیت المقدس کی حفاظت عباسی حکمرانوں کے بس میں نہ رہی یہود کی مسلمانوں کے اندر سازشوں سے مسلمانوں کی سیاسی طاقت کمزور ہوئی اور بیرونی سازشوں سے عالم عیسائیت جاگا اور پورا یورپ شہنشاہ روم کی قیادت میں مذہبی جنگ لڑنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور حالات ایسے ہو گئے کہ ان صلیبی جنگوں کے نتیجے میں 1098ء کے لگ بھگ بیت المقدس اور یروشلم کا علاقہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل گیا اور عیسائی قبضے میں چلا گیا، عیسائیوں نے مذہبی جنونی کیفیت میں اس علاقے میں قتل عام کیا اور مسلمانوں پر ظلم کے پہاڑ توڑے اور قسطنطنیہ سمیت پورے یورپ نے فتح کے شادمانے بجائے۔ اس شکست اور اس کے بعد کے اثرات کو شیخ موصوف نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

(iii) دنیا میں خفیہ انجمنیں اور ادارے کام کرتے ہیں بالخصوص اسلام کے غلبے کے اس دور میں جتنی خفیہ سرگرمیاں زیر زمین پروان چڑھیں اس میں بلاشک و شبہ یہود کا ہاتھ تھا؛ بلکہ دنیا میں ہر خفیہ سوسائٹی میں اسی شیطانی اور ابلیسی گروہ کی کارستانیاں شامل ہوتی ہیں۔

بنو عباس کی حکومت کے اس روبہ زوال عرصے میں ایک طرف بیت المقدس بھی ہاتھوں سے نکل گیا۔۔۔ دوسری طرف خفیہ سرگرمیاں عروج پر پہنچ گئیں۔ ان خفیہ ابلیسی سرگرمیوں کا نقطہ عروج حسن بن صباح نامی شخص کی سرگرمیاں ہیں جس نے اپنے پیروکاروں کو فدائین کے نام سے منظم کیا ایک صحت افزاء پہاڑی علاقہ میں خود ساختہ جنت بسائی اور مسلمان حکمرانوں اور اہم شخصیات کو قتل کروانے کے لیے اپنے فدائین کو استعمال کیا اس کی کارروائیوں سے پورا شمالی ایران ان کے زیر اثر رہا اور سلجوقی حکمران خوارزم شاہ سمیت بے شمار زعماء کو جو بھی اس کی مرضی پر چلنے کو تیار نہیں تھا قتل کروادیا۔

ان تخریبی کارروائیوں میں قریب تھا کہ سارا مشرق وسطیٰ صلیبی جنگوں کی نذر ہو جاتا اور صلیبی اقتدار کا حصہ بن جاتا۔ عیسائیوں کا یہ مذہبی جنگی جنون جاری تھا کہ اللہ تعالیٰ نے دمشق میں

”زنگی“ خاندان کو اٹھایا اور نورالدین زنگی رحمۃ اللہ علیہ اور پھر صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ نے اسلام اور مسلمانوں پر بڑے احسان کیے ذاتی طور پر بھی وہ بہت خداترس، پارسا اور نیک حکمران تھے۔

(iv) حکمران نورالدین زنگی کے دور میں وہ کلیجہ شق کر دینے والی سازش بھی سامنے آئی جس سے سب مسلمانوں کی سانسیں رک گئیں۔ دو یہودی شیطان مسلمانوں کے روپ میں مدینے میں آباد ہو کر بظاہر عبادت گزازی اور پارسائی کی آڑ میں سُرنگ کے ذریعے مسجد نبوی میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جسد مبارک تک رسائی کی کوشش کر رہے تھے اور جسد مبارک کو نکال کر غائب کرنا چاہتے تھے جس کے خوفناک نتائج کا اہل علم ہی اندازہ کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے نورالدین زنگی رحمۃ اللہ علیہ کو بروقت خبردار کیا اور اس نے اس سازش کو پکڑا اور یہودی شیطانوں کو کیفر کردار تک پہنچایا۔ ایسے ناپاک کام یہودی اپنی ایجنسیوں کے ذریعے ہی کرواتے ہیں مگر ان کو شک گزرا کہ کوئی نام نہاد مسلمان اس غلیظ اور گھناؤنی حرکت میں شامل کریں گے تو شاید کہیں اس سازش کا راز ہی فاش نہ ہو جائے۔

ان سیاسی حالات میں اور مسلمانوں کی زبوں حالی کے ماحول میں شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے جو کام کیا اور مسلمانوں کو حوصلہ دے کر منظم کیا، وہ انہی کا کام تھا انہوں نے ایک مشنری جذبے کے ساتھ کام کیا اور امت مسلمہ کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو مشکلات اور خطرات کے بھنور سے نکالنے کی کوشش کی۔ شیخ موصوف 18 سال کی عمر میں بغداد آئے اور پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے بیرونی سفر بہت کم کیے اور وہ مشنری اسفار بھی حج وغیرہ کی طرح کے مذہبی اسفار تھے۔ ایک تذکرہ کے مطابق شیخ موصوف 1128ء میں ملتان بھی تشریف لائے تھے اور یہاں چند ماہ قیام فرمایا۔

شیخ موصوف نے وعظ و نصیحت اور اصلاحی تقاریر کے ذریعے لوگوں میں دین کے احیاء کا جذبہ بیدار کیا ان کا وعظ پر مغز، موثر اور دلنشین ہوتا تھا اور ایک ایک وقت میں ہزاروں لوگ ان کی خانقاہ میں آ کر ان کے وعظ سے مستفیض ہوتے تھے ان کے وعظ سے جو حضرات متاثر ہو گئے تھے شیخ موصوف نے ان سے کام لینے کے لئے انہیں منظم فرمایا اور ان کی اپنے اصلاحی اور مشنری خیالات پر تربیت کی، ان کی درجہ بندی فرمائی اس طرح ان کے ہزاروں کی تعداد میں تربیت یافتہ

شاگرد یا درویش یا ”اسلامی کامریڈ“ تیار ہوئے۔ شیخ موصوف ان تربیت یافتہ شاگردوں کی جماعت میں سے صلاحیت اور حالات کے مطابق مختلف جگہوں پر اپنے نمائندے بھیجتے تھے جو وہاں کے حالات کے مطابق کام کرتے تھے اور حالات کی نگرانی کرتے تھے۔

اس سلسلے میں ان کا اپنے شاگردوں کے درمیان رابطہ تھا اور پیغام رسانی کا سلسلہ بھی۔ حیرت ہے کہ اس زمانے میں ایک شخص اتنا بیدار مغز اور حالات پر نظر رکھنے والا تھا کہ ہر چہار طرف انہوں نے اپنی اصلاحی کوششوں کے محاذ قائم کر دیے۔ سندھ، پنجاب، اجمیر، ملتان، افغانستان، ایران، عراق، مشرق وسطیٰ، عرب، شمالی افریقہ حتیٰ کی یورپ کے مغربی حصے اندلس (جسے سپین یا ہسپانیہ بھی کہا جاتا ہے مسلمانوں کے دور میں اسے اندلس کہا جاتا تھا 1492ء میں یورپ نے زبردستی مسلم حکومت ختم کر کے مسلمانوں کو ختم کیا تو اس علاقے کا نام بدل کر ہسپانیہ رکھ دیا جو بعد میں بگڑ کر اب صرف سپین رہ گیا ہے۔ یہ اس لئے کیا کہ تاریخ میں اندلس میں مسلم اقتدار کی تفصیلات پڑھ کر انہیں فوراً سمجھ میں نہ آسکے کہ کس علاقے کی بات ہو رہی ہے اور یورپ میں مسلم اقتدار کے تذکرے مسلمانوں کے ذہن سے محو ہو جائیں حالانکہ یورپ پر علمی، ثقافتی، تمدنی، تحقیقی، ادبی میدانوں میں عربوں کے اتنے احسانات ہیں کہ یورپ کبھی ان کا احسان بھلا نہیں سکتا تا آنکہ وہ احسان فراموشی اختیار نہ کر لے) تک کے دربار میں ان کی رسائی تھی اور ان کے شاگرد وہاں بھی موثر انداز میں عمائدین سلطنت اور عوام میں برابر کام کر رہے تھے۔ اس ساری عملی جدوجہد اور شاگردوں کی روحانی، اخلاقی اور سیاسی و معاشرتی تربیت کے نظام کو انہوں نے ”سلسلہ قادریہ“ کے نام سے منظم فرمایا اور اس کے ذریعے اپنے شاگردوں میں وہ آگ بھردی کہ ان کے دور میں بھی اور اس کے بعد کئی صدیوں تک ان کے اثرات مشرق و مغرب میں پچشم سرد کیے جاسکتے ہیں۔ ان کے سلسلہ قادریہ کے کام میں قرآن و سنت یا قرآن و حدیث کی بڑی اہمیت تھی وہ مسلمانوں کے خارجی سیاسی حالات، حکومتوں کی اکھاڑ بچھاڑ، یہود کی ریشہ دوانیاں، فلاسفہ کی فکری کمزوریاں اور منطق کی قوت استدلال کے بودے پن کو خوب سمجھتے تھے اور اس ”نور بصیرت“ کو اپنے شاگردوں درویشوں اور خلفاء میں بھی عام کر رہے تھے۔

ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے سابقہ تین صدیوں میں یونانی فلسفہ کی یلغار کے نتیجے

میں پیدا ہونے والے علمی معرکوں کی دلدل سے لوگوں کو نکالا ہے اور روحانی تعلیمات کے ذریعے تصوف اور احسان کی طرف لے کر آئے ہیں۔ 'متکلمین' اور 'اصحاب ظاہر' میں فکری اتحاد و اتصال (SYNTHESIS) کی کوششیں کی ہیں اور اپنی عملی زندگی میں اس سوچ اور طرز عمل کو کامیاب کر دکھایا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے وقت اور صدی کے مجدد تھے جنہوں نے دینی فکر اور انقلابی فکر کو از سر نو تازہ کر دیا۔

ان کی حد درجہ محنت اور ان کے شاگردوں کی جانثاری اور فدائیت کا یہ مظہر ہے کہ ہم مشرق و مغرب پورے عالم اسلام میں ان کے شاگردوں اور زیر اثر لوگوں کو بڑے بڑے کام اور کارنامے سرانجام دیتے دیکھتے ہیں۔ ان کے اس عالمی سطح کے نظام میں مختلف جگہوں پر اپنے خلفاء وغیرہ کا ایک نظام قائم تھا جنہیں انہوں نے اپنے اصلاحی فکر کی بنیاد پر اور تنظیم کی غرض سے مختلف روحانی نام دے رکھے تھے جس سے درجہ بندی اور CADRES معین ہوتے تھے۔ غوث، قطب، ابدال سب اسی دور کی اصطلاحات ہیں۔ اور یہ آج کل امیر، امیر حلقہ، معتمد، مرشد عام کی طرح کی ہیں۔ ان کا ملتان تک خود تشریف لانا اس ساری جدوجہد کی تنظیمی اور تربیتی شکل ہے۔ ان کے شاگرد شمالی افریقہ اور اندلس (سپین) تک میں بڑے موثر تھے اور منظم انداز میں کام کرتے تھے جس کے اثرات شیخ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے اکابر صوفیاء کی صورت میں ظاہر ہوئے۔

آپ نے اپنی مساعی اور تجدیدی کوششوں کے لئے تصوف کا میدان چنا اور اسی میں اس قدر منہمک ہوئے کہ یہ ان کی پہچان بن گیا آپ مذہباً حنبلی تھے اور حنبلی فقہ کے ائمہ میں شامل تھے۔ تاہم یہ پہلو آپ کی اصلاحی سرگرمیوں میں دب گیا۔ آج کے ماحول میں آپ کی صوفیانہ خدمات کا تذکرہ عام ہے اور اس میدان میں حنفی بریلوی مسلمان پیش پیش ہیں آج اگرچہ ہمارے ہاں فرقہ بندی بلکہ فرقہ پرستی ہے مگر ہمارے اسلاف میں ان چیزوں کی شدت نہیں تھی ہمارے اسلاف حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی مذاہب کو فقہ کا ایک میدان سمجھتے تھے اور کسی کا حنفی یا حنبلی ہونا مسلمان ہونے پر فرق نہیں ڈالتا تھا اگرچہ آج یہاں حنفی ہونا مسلمان ہونے کے تقریباً ہم معنی ہے اور عوام کو اگر معلوم ہو جائے کہ ہمارے پیران پیر حنبلی مسلک کے تھے اور رفع یدین کرتے تھے تو حیرانی ضرور ہوگی۔ شیخ موصوف رحمۃ اللہ علیہ کی حنبلی مسلک اور فقہی وراثت آج سعودی عرب اور

امارات کے پاس ہے اور ان کی سلسلہ قادریہ کی وراثت بھارت، پاکستان اور بنگلہ دیش کی عوام کے پاس ہے۔

شیخ موصوف کی تجدیدی اور اصلاحی کوششوں کے ضمن میں آپ کی سلسلہ قادریہ کے فروغ کے لیے ان تھک محنت کا نتیجہ ہے کہ آپ صوفی زیادہ اور جنبلی کم پہچانے جاتے ہیں یہ آپ کی امت کے لئے اصلاحی خدمات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

آپ نے اپنے شاگردوں اور پیروکاروں اور طالبین کے لئے کئی کتابیں تصنیف فرمائیں جن میں غنیۃ الطالبین اور فتوح الغیب بہت مشہور ہیں ان کا قصیدہ غوثیہ بھی مشہور ہے جس کا ایک شعر ہدیہ قارئین ہے جس سے ان کی عالمی سطح پر بلا شرق و غرب میں سرگرمیوں کے انہماک اور ان کی نگرانی کا غماز ہے۔

نَظَرْتُ إِلَى بِلَادِ اللَّهِ جَمْعًا

كَخَرْدَلَةٍ كَحَكَمِ اتِّصَالِ

(میں نے اللہ کی ساری سرزمین کے شہروں پر نظر کی جیسے ہتھیلی پر رائی کا دانہ ہوتا ہے)

اس شعر میں معنویت کا ایک سمندر ہے کہ جیسے آج کل کوئی عالمی سطح کا رہنما دنیا کے نقشے پر مختلف ممالک کی سرگرمیوں کے جائزہ کے لئے غور و فکر کر رہا ہے اور ان کے سرکردہ جانثار ساتھ شریک ہیں جسے آج کل دینی جماعتوں میں ”مرکزی شوریٰ“ کا نام دیا جاتا ہے۔

آپ کے خلوص و اخلاص، بے حد محنت، شب و روز کے مجاہدے اور ہزاروں شاگردوں، مریدوں کی فدائی تربیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ عوام میں لاکھوں کروڑوں عقیدت مندان کا نام آج بھی عزت سے لیتے ہیں اور اہل علم کے نزدیک ان کے کارنامے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے جاتے ہیں۔ ع خدارحمت کنداں عاشقان پاک طینت را

ذاتی حالات و کوائف

نام: سید عبدالقادر، والد کا نام: سید ابوصالح عبداللہ (موسیٰ) بن جنگی دوست، آپ کا سلسلہ نسب حضرت حسین ؑ سے جا ملتا ہے۔ آپ بحیرہ کیسپین کے جنوبی علاقے میں واقع

عراق کے ایک صوبے جیلان یا گیلان میں 470ھ/1077ء کو پیدا ہوئے۔ اور وفات ربیع الثانی 561ھ/اپریل 1162ء کو بغداد میں ہوئی۔

آپ تین برس کی عمر میں والدین کے ساتھ بغداد آئے، وہاں دس سال رہے اور پھر والدین کے ہمراہ واپس آبائی علاقہ میں آگئے، اس کے بعد دوبارہ اٹھارہ سال کی عمر میں تحصیل علم کی غرض سے بغداد تشریف لے گئے اور اس وقت سے لے کر وفات تک یہی شہر آپ کی سرگرمیوں کی جولانگاہ بنا رہا۔

دوسرے بہت سے اساتذہ کے علاوہ آپ نے علوم و فنون اور ادب کی تعلیم میں سے فقہ حنبلی کی تعلیم ابوالوفاء بن العقیلی اور ابوسعید مبارک مخزومی سے اور حدیث کی تعلیم ”مصارع العشاق“ کے مصنف ابو محمد جعفر سراج سے حاصل کی۔ اور تصوف سے ابوالخیر حماد الدباس نے آپ کو روشناس کرایا جو اپنے وقت کے نہایت محترم و مسلم صوفی اور بزرگ تھے، ان کی سخت ریاضت کا ذکر جو یہ اپنی زیر تربیت مریدوں سے کرایا کرتے تھے، ابن اثیر نے بھی کیا ہے۔

521ھ یعنی پچاس سال کی عمر میں آپ نے وعظ و نصیحت کا آغاز کیا، آپ کے وعظ و

درس کا چرچا دور دور تک پھیل گیا، اس کے کچھ عرصہ بعد آپ کے استاد مخزومی کے مدرسے کا انتظام آپ کے حوالے کر دیا گیا، یہاں آپ کے اہم مشاغل افتاء، درس قرآن و حدیث اور بالخصوص وعظ تھے جن کی شہرت دور دور تک تھی جو دنیا کے اسلام سے بے شمار شاگردوں کو کھینچ لائی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے دانشین حسن وعظ کے باعث بہت سے غیر مسلم بھی حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ شیخ نے ایسے دور میں زندگی بسر کی جب تصوف کا عروج اور صوفیاء کے مسلک میں وسعت پیدا ہو رہی تھی اور تاریخی حالات نے ایک سوال اٹھا رکھا تھا کہ زہد و تصوف کے عناصر کو شریعت کے ساتھ ہم آہنگ کس طرح کیا جائے۔ بعض اہل علم نے تو تصوف کی ضرورت و افادیت سے صاف انکار کر دیا تھا۔ ان حالات میں شیخ موصوف نے عملی سرگرمیاں شروع کیں اور وعظ و نصیحت کے ساتھ تصنیف کا کام بھی کیا۔ ”غنیۃ الطالبین“ ان کی طرف منسوب مشہور اور ضخیم کتاب ہے جس میں شریعت و طریقت کے مسائل پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور مختلف فرقوں کے درمیان جو اختلافی مسائل ہیں ان کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے، آپ کے مقالات پر مشتمل کتاب ”فتوح

الغیب“ تصوف اور معرفت کی اہم کتاب سمجھی جاتی ہے۔ فتح رحمانی اور فیض ربانی شیخ کے تریسٹھ خطبات کا مجموعہ ہے جو ان کے نواسے شیخ عقیف الدین مبارک نے ترتیب دیے۔

آپ اخلاق میں اپنے تمام معاصر اولیاء سے ممتاز تھے۔ تذکرہ مشائخ اولیاء میں درج ہے کہ سیرت و کردار کے لحاظ سے کوئی ولی آپ کا ہم پلہ نہ تھا۔ آپ دنیوی ضروریات سے بے نیاز تھے اور بے خوفی سے کلمہ حق کہتے تھے، حق گوئی، ایثار و سخاوت، عفو و درگزر کا پیکر تھے، کسی پر ظلم برداشت نہ کرتے غریبوں اور مظلوموں کی امداد کے لیے فوراً تیار ہو جاتے اور شریعت کے معاملے میں کبھی نرمی نہیں برتتے تھے۔

آپ کا مقبرہ بغداد میں ہے اور پوری دنیا کے مقابر اولیاء سے ممتاز حیثیت رکھتا ہے ہر سال ہزاروں افراد وہاں حاضری کے لیے جاتے ہیں۔





الملك الناصر، فاتح بيت المقدس

سلطان يوسف اول

صلاح الدين الايوبي

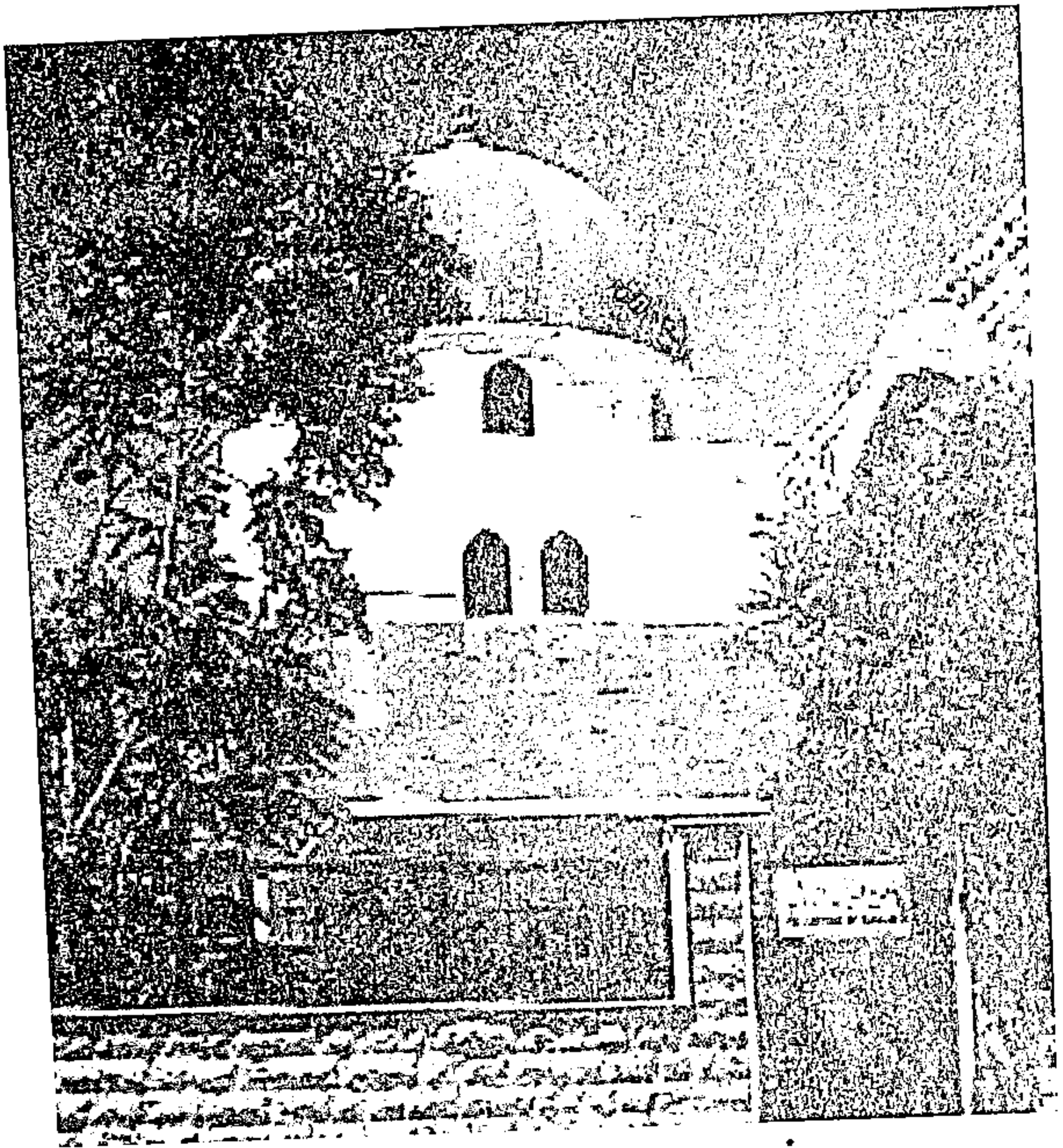
ع
رحمة الله

ولادت: 532ھ / 1138ء تکریت

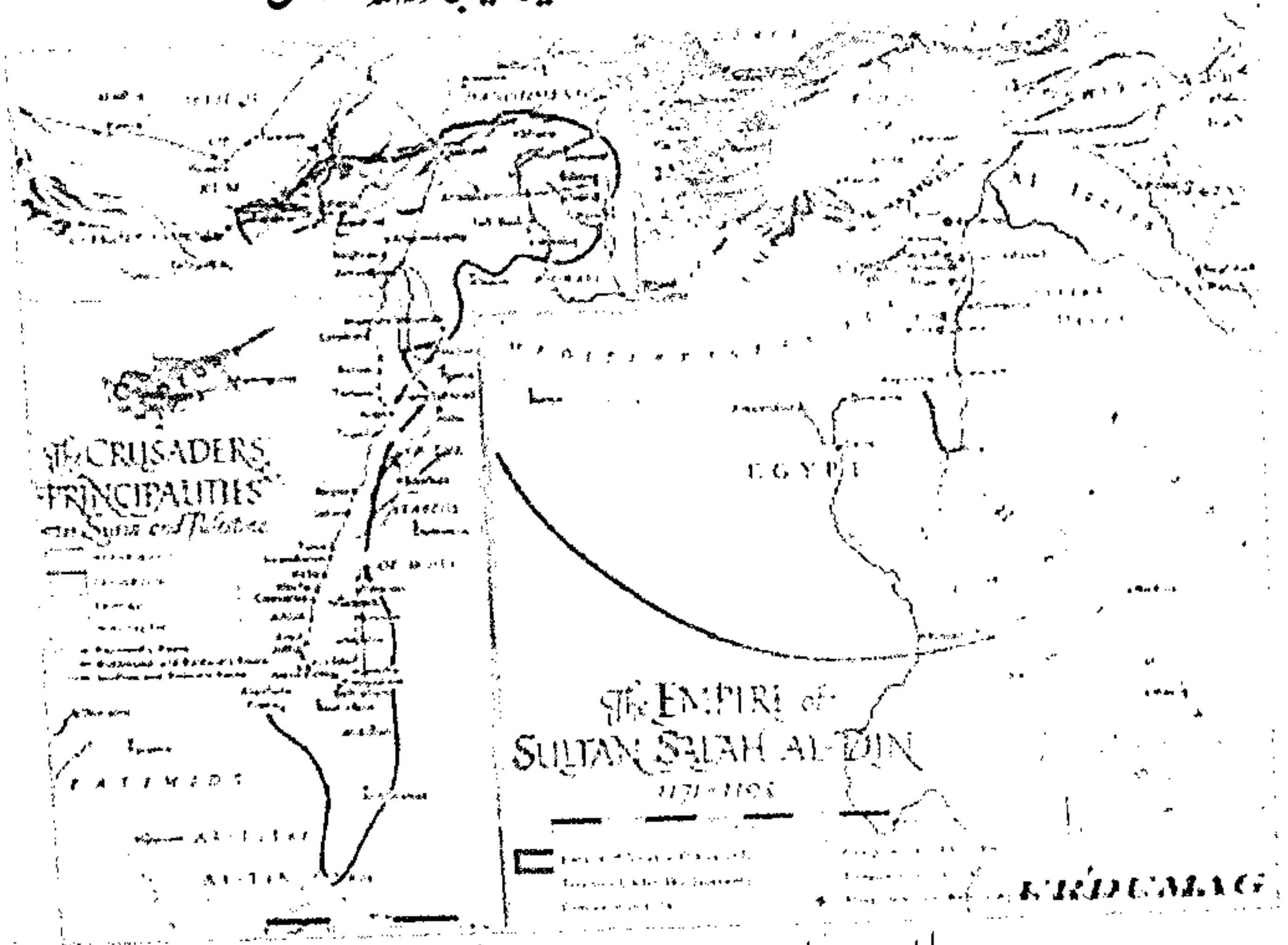
○ 1169ء میں مصر کے حکمران بنے۔

○ 1190ء بیت المقدس فتح کیا۔

وفات: 589ھ / 1193ء دمشق



مدفن: سلطان صلاح الدين ايوبي رحمه الله، دمشق



سلطنت سلطان صلاح الدين ايوبي رحمه الله

آپ امیر نجم الدین ایوب کے ہاں 532ھ (1138ء) میں تکریت (عراق) کے مقام پر پیدا ہوئے۔ صفر 589ھ (1193ء) میں دمشق میں وفات پائی۔

سلطان صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ، آٹھ صدیاں گزرنے کے باوجود آج بھی اسلامی دنیا میں معروف ہیں اور ان کا نام عزت و احترام سے لیا جاتا ہے، ان کا تذکرہ مسلمانوں کے خون میں زندگی کی لہر دوڑاتا ہے اور جذبہ و ولولہ پیدا کرتا ہے، آج بھی لوگوں کے لیے ان کی شخصیت روشنی اور ہدایت کا مینار ہے وہ علوم دینیہ کے دلدادہ اور علماء کے سرپرست اور تعمیرات کا شوق رکھتے تھے۔

سلطان صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ ہو تو لازماً صلیبی جنگوں کا خیال آ جاتا ہے اور ذہن ان یورپی مذہبی جنونیوں کی طرف لوٹ جاتا ہے جو اپنے وطن سے بارہا پیادہ سینکڑوں میل کا سفر کر کے مذہبی بنیادوں پر مسلمانوں سے جنگیں کرنے کے لئے حملہ آور ہوتے رہے۔ یہ صلیبی جنگیں جنہیں CRUSADES کہا جاتا ہے گزشتہ ایک ہزار سے جاری ہیں (یہاں تک کہ موجودہ اسلام دشمن اتحادی سرگرمیوں اور مسلم کش حملوں کے لئے بھی 2001ء میں امریکی صدر بش کی زبان پر CRUSADES کا لفظ ہی آیا تھا، جو ان کے باطنی عزائم اور خفیہ منصوبوں کا اظہار تھا جس کے لئے بظاہر اس نے معذرت کر لی)۔

یہ صلیبی جنگیں کیا ہیں؟ اور کیوں لڑی گئیں اور آخر 1000 سال سے یہ جنگیں کیوں جاری ہیں؟ سلطان صلاح الدین کے حالات زندگی پڑھنے سے ان سب سوالوں کا جواب مل جاتا ہے۔ ان جنگوں کی شدت اور یورپی مسیحی برادری کے دل کی جلن اور سینے کے داغوں کا سلطان صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے وہ فرماتے ہیں:

”جب تک ایک مسلمان زندہ ہے یورپی عیسائیوں کی طرف سے صلیبی جنگ جاری رہے گی تا وقتیکہ اس کو بھی ختم نہ کر دیں“

یہ جملہ اس سلطان کا ہے جو مسلسل چالیس سال تک ان سے نبرد آزما رہا اور ان اسلام دشمن صہیونی و مسیحی مذہبی جنونی طبقہ سے میل جول کے باعث ان کے عزائم اور منصوبوں سے بخوبی آگاہ تھا۔

مسیحی دنیا اور مسلمانوں کے درمیان جنگوں کا سلسلہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت سے شروع ہوا اور عیسائیوں نے اپنی ہی کتابوں کی پیشگوئیوں کے مطابق بغیر جنگ کے قلعہ بیت المقدس مسلمانوں کے حوالے کر دیا، تاہم وہ اسے آج تک بھلا نہ سکے۔

اس کے بعد عیسائیوں اور یہودیوں نے میدان جنگ کی بجائے مسلم عسکری قوت کو نیچا دکھانے کے لیے سازشوں کا جال پھیلانے کا راستہ اختیار کیا اور ہر ممکن طریقے سے مسلمانوں کے عقائد اور ایمانیات کو متزلزل کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ دور بنو امیہ کے بعد جب دور بنو عباس آیا اور دار الحکومت دمشق سے بغداد منتقل ہو گیا تو مسیحی دنیا کو سازشوں کا جال وسیع کرنے کا نادر موقع مل گیا اور انہوں نے اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا، قسطنطنیہ اس وقت تک عیسائی دنیا کا گڑھ اور قوت کا مرکز تھا۔ لہذا اندونی سازشوں سے مسلمانوں کو باہم لڑا کر جب کمزور کر دیا تو یہود اور عیسائیوں نے مسلمانوں کو نیچا دکھانے اور آسمانی ہدایت کو مٹانے کی غرض سے خوفناک منصوبہ بنایا اور اس کام کے لئے مسیحی دنیا کو آمادہ کرنے کے لئے اس منصوبہ کو مذہبی نام دیا صلیبی جنگ (CRUSADES)، جس سے یورپ کے طول و عرض میں مذہبی رہنما لوگوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکا رہے تھے اور عوام و خواص، پیر و جوان، غریب اور امیر، مزدور اور کسان، محنت کش اور راجہ مہاراجہ، لارڈ پرنس، غرض ہر سطح کے لوگوں کو اس مذہبی جنون نے اس درجہ متاثر کیا کہ لوگ اس مقدس جنگ میں شرکت کے لیے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے۔

یہ سلسلہ گیارھویں صدی کے وسط سے شروع ہو کر پندرہویں صدی تک چلا ہے اور اس طرح دس بڑی جنگیں لڑی گئی ہیں۔

پہلی مہم جو 1095ء سے شروع ہو کر 1142ء میں ختم ہوئی اس مہم میں بنو عباس کی

کمزوری کے باعث بیت المقدس مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھین گیا اور وہ عیسائیوں کے قبضے میں چلا گیا اس فتح کے نشے سے سرشار ہو کر انہوں نے مزید مسلم علاقے بھی فتح کر لیے۔

ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے سلطان نور الدین زنگی رحمۃ اللہ علیہ اور اس کے بعد سلطان صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ کو اٹھایا اور سلطان صلاح الدین کی بھرپور مہم جوئی سے اس صلیبی جنگ میں مسلمانوں کو فتح ہوئی اور 1190ء کے لگ بھگ تقریباً نوے سال بعد بیت المقدس کی بازیابی ممکن ہو سکی (مدینے میں آمد پر مسلمان بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نمازیں ادا کرتے رہے بعد میں تحویل قبلہ کا حکم آیا اور مکہ میں اللہ کا گھر قبلہ قرار پایا پھر بیت المقدس معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ میں ایک اہم پڑاؤ یا LANDMARK کی حیثیت بھی رکھتا ہے جس کی وجہ سے مسلمانوں کے نزدیک بھی بیت المقدس کی بڑی اہمیت ہے) اور صلیبی جنگ میں پورے یورپ کا تنہا مقابلہ کر کے ان کو شکست سے دوچار کر دینا یہ سلطان ہی کا کام تھا اور اسی کی کوششوں کا نتیجہ۔

سلطان کی بہادری، فیاضی، عالی ظرفی دشمنوں سے بھی نیک سلوک کی وجہ سے آج بھی یورپ سلطان صلاح الدین ایوبی کے نام سے خائف رہتا ہے اور دلوں میں شدید نفرت اور بعض چھپائے ہوئے ہے جو بظاہر چھپانے سے چھپتے نہیں۔ اس تیسرے کروسیڈ جس میں سلطان صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ کو فتح ہوئی اس کے بعد بھی مسیحی مذہبی رہنما بیت المقدس کے حصول کے لئے جنگی جنون کو عام کرتے رہے مگر ان کو اپنے مقاصد میں کامیابی نہیں ہو سکی۔

سلطان صلاح الدین ایوبی نے کس طرح چالیس سال کی مسلسل محنت کے بعد بیت المقدس واپس لیا اور یورپ کا راستہ روکا اس کے متعلق تاریخ میں ہے کہ اس جلیل القدر سلطان کا حال یہ تھا کہ:

”سلطان صلاح الدین کا ایک خاص کریکٹر جس نے اس کو اسلامی دنیا میں عزیز الوجود اور مسلمانوں کا ایک محبوب ہیرو بنایا، تمام دنیا سے اس کی عظمت اور ناموری کو تسلیم کروایا، صلاح الدین اعظم کا اس کو خطاب دلویا اور اس کے بزرگ نام کو صفحہ ہستی پر لاثانی بنادیا وہ اس کی بے نظیر ہمت، شجاعت استقلال اور اسلام کی حمایت کا آن تھک جوش تھا جو کسی وقت اور کسی حالت میں کم نہیں ہوتا تھا۔ یہ اسی عدیم المثال ہمت اور

جوش کا نتیجہ تھا کہ ہم ایک سلطان کو بلکہ زیادہ صحیح طور پر کہا جاوے کہ ایک شاہنشاہ کو جو مصر، شام، عراق، بحرین، یمن اور افریقہ کے بعض صوبوں کا مالک و فرمانروا تھا اور جس کے سامنے اسلامی سلاطین کے ہر ایک درجہ کی معاشرت اور عیش و عشرت کی زندگی کے نمونے اور سامان موجود تھے، تمام انسانی حظوظ سے کنارہ کش ہو کر ایک خیمہ کی مملکت کی زندگی بسر کرنے پر قانع اور مسرور دیکھتے ہیں، کسی انسان کا جوش یا ایک وصف اس سے بڑھ کر اور کیا قربانی اس سے کرا سکتا ہے۔ سلطانی عظیم الشان قصروں اور محلوں کی پر عیش و عشرت، پُر امن اور محفوظ زندگی کو ترک کر کے جو شخص اپنی خوشی سے عناصر کی شدتوں، برف، بارش اور طوفان اور کثیر التعداد دشمنوں کے مقابلہ میں ایک خیمہ کو اپنے واسطے اختیار کرتا ہے، وہ دنیا سے اس خراج کے حاصل کرنے کا مستحق ہو جاتا ہے جو صلاح الدین نے حاصل کیا، خیمہ اس کی محل سرائے تھا، گھوڑے کی پیٹھ اس کا تخت تھا، اہل فوج اس کے درباری اور وہی اس کی پیاری اولاد تھے، تلوار کی چمک اس کی شان و شوکت کے سامان تھے اور یہی سردلوہا اس کی دلچسپی کے اسباب۔ اس کے جوش استقلال، ہمت اور شجاعت کی تشریح کے واسطے واقعات تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی تمام زندگی کے حالات جو بیان ہو چکے ہیں اس کو ایک بہادر سپاہی، ایک لائق جرنیل اور ایک اُن تھک اور پُر جوش مسلمان فرمانروا کے سوائے اور کچھ ثابت نہیں کرتے ہیں۔ وہاں نہ شاہانہ درباروں کی شوکتیں ہیں نہ مصنوعی عظمتوں اور ہیبتوں کے تماشے ہیں، نہ آراستہ و پیراستہ محلوں میں راگ و رنگ کی محفلیں ہیں بلکہ یہاں تو صرف ننگی تلواروں کے ہیبت ناک مناظر ہیں جو نیاموں میں جانے کے بعد اپنے منہ پر سے خون کو بھی خشک نہیں ہونے دیتیں۔“

بیت المقدس چھن جانے کے باعث عیسائیوں میں غیظ و غضب کی لہر دوڑ گئی اور تیسرا صلیبی حملہ اس کا رد عمل تھا۔ اس حملے میں جرمنی کے بادشاہ فریڈرک باربروسا، انگلستان کے بادشاہ رچرڈ شیرول اور فرانس کے بادشاہ فلپ آگسٹس نے شرکت کی۔ ان میں جرمنی کا بادشاہ تو ایشائے کوچک کے ایک دریا میں ڈوب کر مر گیا اور فرانس کا بادشاہ رچرڈ سے اختلاف کے باعث واپس

چلا گیا جبکہ رچرڈ شیرول سلطان صلاح الدین ایوبی سے صلح کا معاہدہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد بھی یورپ کے بظاہر امن پسند مسیحیوں کی جارحانہ اور جنوبی سرگرمیاں ختم نہیں ہوئیں بلکہ وقتاً فوقتاً صلیبی جنگوں میں عوام اور وسائل کو جھونکتے رہے مگر ہر بار ناکام رہے۔

ان ساری صلیبی جنگوں کے پیچھے 'یہود' کا سازشی ہاتھ کار فرما تھا اس لئے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اصلی پیروکار جو انہیں اللہ کا بندہ اور پیغمبر سمجھتے تھے بہت کم تھے اور وہ بھی غیر معروف جبکہ کیتھولک عقائد کے حامل مسیحی سینٹ پال کے پیروکار تھے اور ان کے عقائد تثلیث پر مبنی تھے جو ایک پیغمبر علیہ السلام کی تعلیمات کے سراسر منافی ہیں۔ یہ تثلیث کا عقیدہ فروغ دینے میں بھی یہود کی مساعی سرفہرست ہیں۔ یہود نے یورپ کی فوجی قوت کے ذریعے مسلمانوں کو دباننا چاہا اور مسلم علاقے فتح کرنے چاہے جس میں ناکام اور نامراد ہوئے تو انہوں نے اپنی پالیسی اور طریقہ کار یکسر بدل دیا۔

سلطان صلاح الدین ذاتی کردار اور انسانی اوصاف اور حسن سلوک کے اعتبار سے اتنا بلند انسان تھا کہ اس کی تعریف میں مبالغہ کی حد تک بات درست ہے۔

”سلطان کے جوش اور شجاعت کا اثر اگر اس کی ذات یا ذاتی افعال تک محدود

ہوتا تو معتد بہ نتیجہ نہیں پیدا کر سکتا تھا، یہ اس کا جوش تھا جو اس کے چاروں طرف پھیل

گیا تھا، یہ اس کا جوش تھا جس نے بکھرے ہوئے مسلمانوں کو جمع کر لیا تھا، یہ اس کا

جوش تھا جس کا عکس مسلمانوں کے دلوں پر پڑ رہا تھا، یہ اس کا جوش اور اس کی ہمت

تھی جس نے قوم کے لڑکھڑاتے ہوئے پاؤں کو مضبوط کر کے اسے کھڑا کر دیا تھا، یہ

اس کی ہمت اور شجاعت تھی جس نے مسلمانوں کو جہاد فی سبیل اللہ کا بھولتا ہوا سبق

پھر یاد دلایا تھا جس نے پڑ مردہ دلوں کو تازگی دی تھی اور مستحضر کر لیا تھا یہ اس کا دل تھا

جس نے مسلمانوں کے متفرق دلوں کو ایک مشترک غرض کے واسطے جمع کر لیا تھا۔

اسلامی دنیا اس وقت سوچکی تھی، ایوان اسلام بوسیدہ ہونے لگا تھا جس دردناک صدا

اور دلکش نغمہ نے سوتوں کو جگا لیا تھا وہ صلاح الدین ہی کا تھا جن ہاتھوں نے اس

عمارت کو گرنے سے بچا لیا وہ صلاح الدین کے تھے۔ عیسائی دنیا اور فرنگستانی عالم

کے مقابلہ میں جو وجود ایک آہنی دیوار اور مضبوط پہاڑ کی طرح کھڑے ہو گئے اور جنہوں نے اسلامی عزت اور ننگ ناموس کو ازلی دشمنوں کے ہاتھوں سے بچالیا ان میں صلاح الدین کا دل تھا۔

سلطان کی ہمت اور شجاعت کے بارے میں مورخ ابن شداد لکھتا ہے:

”وہ بڑا قوی دل، بارغب، بہادر، بے مثل شجاع اور حد درجہ کا ثابت قدم تھا کوئی مہم اور کوئی مصیبت اس کو ڈرا نہیں سکتی تھی عیسائیوں کے ساتھ سخت سے سخت مقابلوں کی وہ پرواہ نہیں کرتا تھا۔ موسم سرما کی شدید سردیوں میں جنگ اور حملوں میں مصروف رہتا تھا اور بہت دفعہ قلیل فوج کے ساتھ کثیر التعداد دشمنوں کا مقابلہ کرنے میں تامل نہیں کرتا تھا۔“

اعلائے کلمۃ الحق کے جوش کے سوا سلطان کی زندگی کا کوئی اور مقصد نہیں تھا اور اس کی تمام کامیابیوں میں جو اسے عیسائیوں کے مقابلے میں حاصل ہوئیں یہ کامیابی قابل ذکر ہے کہ اس نے قسطنطنیہ کے رومی شہنشاہ کو عیسائیوں کے اس دار الحکومت میں مسجد کی تعمیر اور اماموں اور مؤذنون کے تقرر پر راضی کر لیا۔

اس کے ذاتی اخلاق میں فیاضی، احسان، عفو و درگزر، مرؤت اور حلم بہت نمایاں ہیں سلطان ایک عدل پسند بادشاہ اور انصاف کرنے والا حکمران تھا اور ان شاء اللہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اُسے اپنے سائے میں نمایاں جگہ دے گا۔

سلطان علم کی قدر دانی کرتا اور اہل علم سے تعلقات بڑھاتا اور ان کی قدر کرتا، علم کے حصول کے لئے کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا اہل علم کی محفلوں میں شریک رہتا اور قرآن و حدیث اور جہاد سے متعلق باتیں سن کر انہیں پلے باندھ لیتا۔

سلطان نے اپنے دور حکومت میں بے شمار مدارس تعمیر کرائے اور اس کے لئے قابل اساتذہ مقرر کیے اور شاندار عمارات تعمیر کرائیں۔ کتابوں سے اس کو خصوصی شغف تھا اس نے کتابیں جمع کیں اور کتب خانے تعمیر کرائے جس سے رعایا میں علم کا ذوق پیدا ہو گیا۔ اس نے رفاہ عامہ کے کاموں میں بھی دلچسپی لی اور شفا خانے تعمیر کرائے اور ان کا بہترین انتظام کیا۔

سلطان کا بڑا کارنامہ مصر کے فاطمی حکمرانوں کے اقتدار کا خاتمہ تھا اللہ نے یہ سعادت اس کے لئے لکھ دی تھی فاطمی حکمران مسلمان ریاست سے روابط بڑھانے کی بجائے مرکز گریز رجحانات کی بنا پر دشمنوں سے زیادہ رابطہ رکھتے تھے اور کئی موقعوں پر فاطمی حکمرانوں نے صلیبیوں کی مدد کی تھی تاکہ مسلمانوں کو نقصان پہنچایا جاسکے۔

سلطان ایک فیاض اور سخی انسان تھا اور ان سب اوصاف کے ساتھ وہ پابند شریعت تھا اور خود اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری میں اپنی سعادت سمجھتا تھا اور دینی احکام کی پابندی میں فخر محسوس کرتا تھا۔

غرض سلطان ذاتی اخلاق و کردار، شریعت کی پابندی اور جہاد و حکومت انتظام و انصرام مملکت پر کام میں ایک مثالی انسان تھا اور اس کے کردار کے اثرات اسی دور کے معاشرے پر بھی پڑے اور آج تک مسلمانوں کے اجتماعی شعور اور حافظے پر موجود ہیں۔

بنا کردند خوش رسی بخاک و خون غلطیدن

خدا رحمت کند ایس عاشقانِ پاک طینت را



سلطان حسن حسنہ کی
 صاحبزادی اور خدیجہ بیگم نے
 انہیں انورہ کی قوم کی ابرو
 کی حالت میں لے کر مکہ مکرمہ
 لائے۔
 فاطمہ بیت المقدس
 سلطان صلاح الدین ایوبی

اگر کسی قوم کو بغیر جنگ
 کے شکست دینی ہو
 تو اس قوم کے جوان طالب
 میں فحاشی عام کر دی
 سلطان صلاح الدین ایوبی



حضرت شیخ الاسلام تقی الدین ابوالعباس احمد

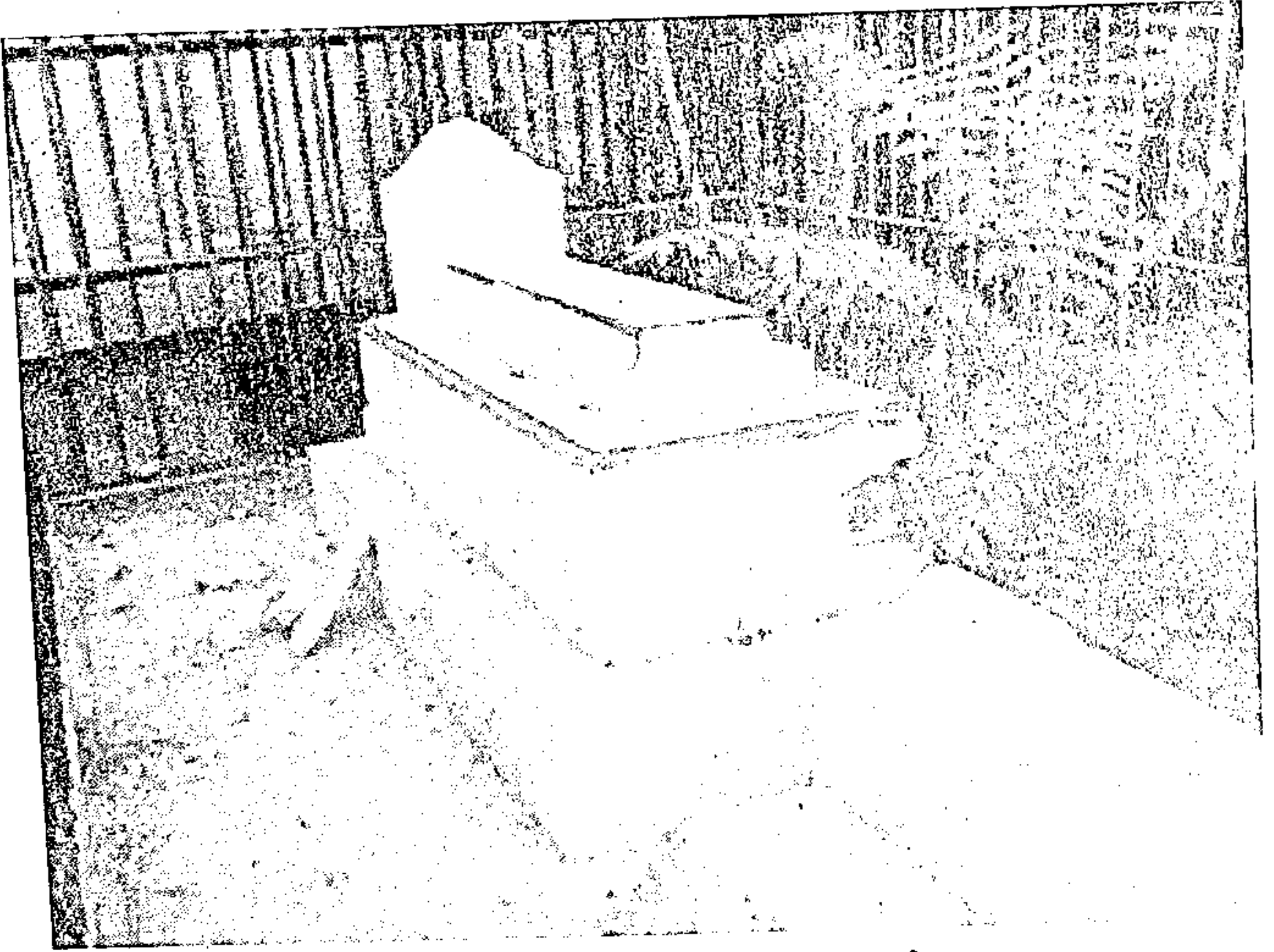
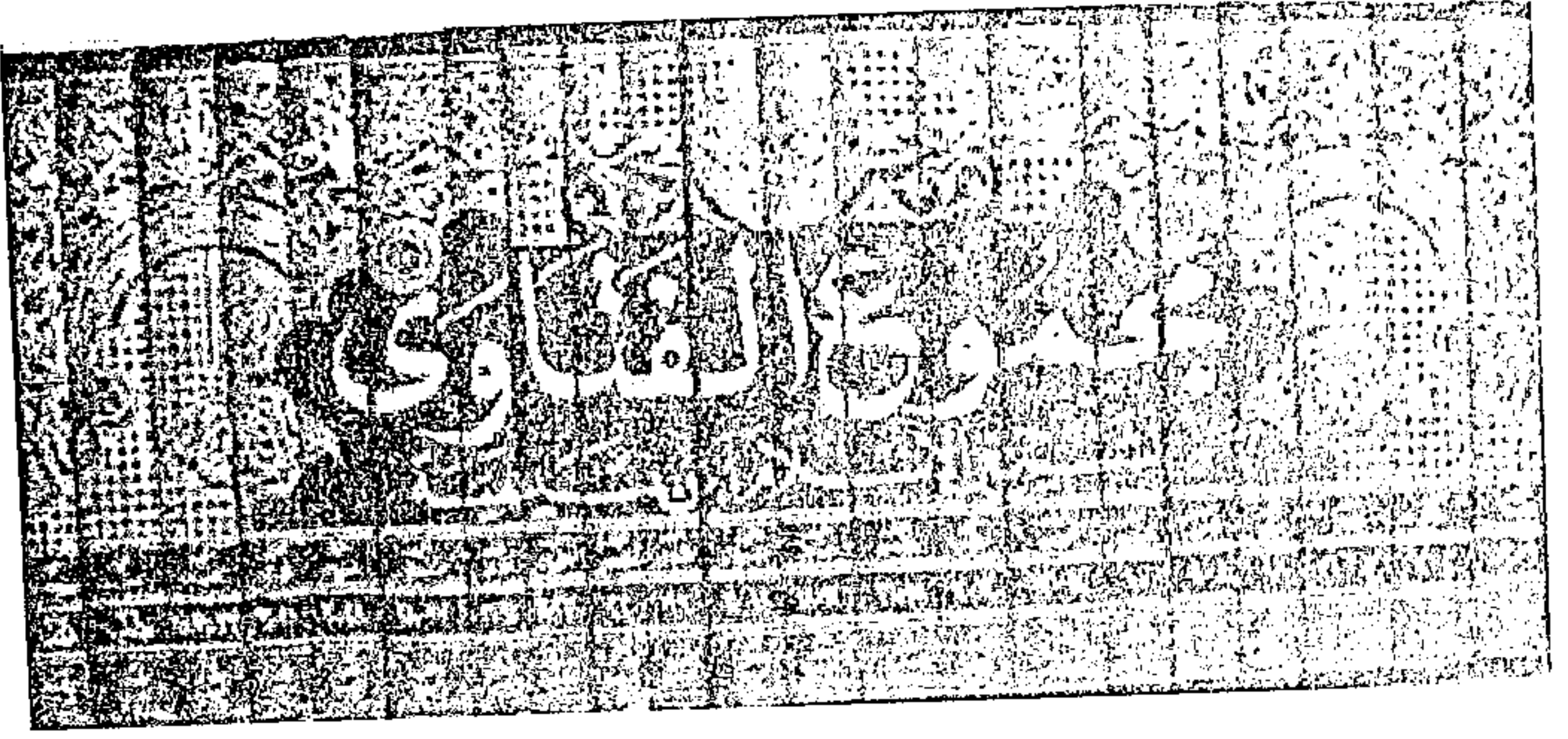
المعروف به

امام ابن تیمیہ

رحمۃ اللہ علیہ

ولادت: 661ھ / 1263ء

وفات: 728ھ / 1328ء



مدفن: حضرت امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ، دمشق

پینچمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کی وفات کے 650 سال بعد حالات یکسر بدل چکے تھے۔ اسلام کی تعلیمات اور مسلمان اس عرصے کے دوران کئی نشیب و فراز سے گزر کر ایک گہرے نشیب اور زوال سے دوچار تھے کہ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت (1263ء میں) ہوئی ہے۔

سیاسی حالات

خلافت راشدہ 11ھ تا 40ھ (632ء تا 661ء) دور بنو امیہ 40ھ تا 132ھ (661ء تا 750ء) کے بعد دور بنو عباس کا آغاز ہوا۔ بنو امیہ عرب تھے اور بنی اسماعیل ہی کی شاخ تھے جبکہ بنو عباس بھی حضرت محمد ﷺ کے چچا حضرت عباس بن عبدالمطلب کی اولاد میں سے تھے اور بنی اسماعیل میں سے ہی تھے۔

دور بنو عباس 525 سال کے طویل عرصے پر محیط ایک عظیم وسیع اور بے مثال حکومت کا نام ہے۔ ان 525 سالوں میں پہلے 115 سال بنو عباس کا دور عروج اور مسلمانوں کو بحیثیت ایک قوم اور ملت تمام عالم پر فضیلت اور فوقیت کا دور ہے۔ اس دور میں اگرچہ اسلامی فتوحات کا سلسلہ رک گیا اور حقیقی اسلام کی تعلیمات ماند پڑ گئیں اور اسلامی انقلاب کی تصدیر (EXPORT) کی صلاحیت مفقود ہو گئی تاہم بے جان مذہبیت اور فرقہ پرستی کے جلو میں غیر اسلامی نظریات کی یلغار کی وجہ سے اب میدان جنگ سرحدوں پر نہیں بلکہ مدارس، تعلیم گاہوں اور شاہی درباروں میں سجنے لگے اور دشمنوں کے خلاف 'جہاد' کی جگہ آپس میں 'جہاد' اور لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا جس میں تلوار، توپ و تفنگ اور منجنیقوں کے بجائے، منطقی بحثیں، کلامی مویشگافیاں، فتوے اور مسلمانوں کی باہمی تقسیم در تقسیم کے عمل کا 'مصالحہ' استعمال ہونے لگا۔

اس دور میں سرکاری سطح پر سارا زور امن و امان کے قیام اور داخلی استحکام پر رہا اور

حکمرانوں کی عیاشیوں کے لئے واحد راستہ DIVIDE AND RULE کا نظریہ رہا اور مذہبی منافرتوں نے حکمرانوں کی عیاشیوں کے باوجود ان کے دور کو طول دینے میں مدد دی۔

تاہم اسی دور میں مجموعی طور مسلم کلچر، رہن سہن کے طریقے، ایجادات اور ضروریات زندگی کی فراہمی میں بے مثال ترقی ہوئی اور معاشی طور پر صرف خواص ہی نہیں عوام بھی خوشحال ہو گئے۔ اگلے دو سو سال باہمی خلفشار اور پھر مزید 225 سال دشمنوں کی ریشہ دوانیاں اور مرکز گریز عناصر کا طاقت حاصل کر کے علیحدگی کے رجحانات میں شدت کا دور ہے۔ اس دور میں سارا یورپ متحد ہو کر آیا، 1090ء کے لگ بھگ مسلمانوں کے ہاتھوں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مفتوحہ بیت المقدس چھین لیا اور عرب اس کا دفاع نہ کر سکے اور یہ صلیبی غلبہ تقریباً ایک صدی جاری رہا اور بجا طور پر اسے صلیبی جنگوں کا نام دیا گیا تھا کہ اس میں پورا عالم عیسائیت عالم اسلام کے خلاف صف آرا ہو گیا تھا اور قسطنطنیہ اس کا مرکز تھا۔ بنو عباس کے زوال کے باعث بیت المقدس کی واپسی عربوں سے ممکن نہیں ہو سکی بلکہ یہ سعادت علاقائی حکمرانوں میں دمشق میں مسلمان حکمران خاندان کے سپوت نور الدین زنگی اور اس کے بھتیجے صلاح الدین ایوبی رضی اللہ عنہ کے حصے میں آئی کہ 1192ء میں بیت المقدس صلیبی چنگل اور اقتدار سے چھین کر پھر عالم اسلام میں شامل کر دیا۔

اس پر بس نہیں بنو عباس کے حکمرانوں کی دین سے دوری، عیش پرستی اور الف لیلوی داستانیں تاریخ کا حصہ ہیں اور بغداد کے شہزادے پوری دنیا میں عیاشی کی علامت (SYMBOL) بن گئے تھے اور بعد کی کئی صدیوں تک ذہنوں پر چھائے رہے۔

ان حالات میں ہلاکو خان اور چنگیز خان کی فوجوں نے بنو عباس کی حکومت کا سارا شمالی علاقہ تاخت و تاراج کر دیا اور بالآخر سلطنت سمٹ کر بغداد میں رہ گئی۔ تو 1258ء میں حملہ کر کے آخری عباسی خلیفہ کو دردناک انداز میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور یوں پانچ صدیوں پر محیط بنو عباس کے اقتدار کا سورج غروب ہو گیا۔ اس سقوط بغداد کے واقعہ کے بعد کئی سال تک عالم اسلام پر خاموشی اور ہیبت چھائی رہی اور سر اٹھانے اور دشمنوں سے مقابلہ کرنے کی جرأت و ہمت مفقود ہو گئی۔

اس پس منظر میں 1263ء میں حران کے مقام پر امام ابن تیمیہ رضی اللہ عنہ کی پیدائش اور

اس خارجی ماحول میں ان کی پرورش اور تعلیم ہوئی ہے۔ لہذا مسلمانوں کی زبوں حالی، ایمان کی کمزوریوں اور ایمانی کیفیات کا بے جان ہو جانا، دین سے اعراض، دنیا پرستی، دشمنوں کا خوف اور نفسا نفسی کا ماحول ہے جس کا اثر امام موصوف کی طبیعت پر ہوا اور اس سے ان جیسی سعید روح نے اسلام کی عظمت کے لئے کام کرنے کی ٹھانی اور اللہ تعالیٰ نے انہیں ہمت دی اور وسائل بھی اور اعوان و انصار بھی ایسے میسر آ گئے کہ وہ ساری زندگی مسلمانوں کی بیداری اور قرآن و سنت کی طرف رجوع کے لئے کوشاں رہے۔

کوئی شخص ان کی آراء اور فتاویٰ سے اختلاف تو کر سکتا ہے یہ اس کا حق ہے تاہم ان کی بے لوث خدمات، حق کی حمایت، باطل کے خلاف تیغ بے نیام ہونے کے جو تمنغے ان کے کردار کا حصہ ہیں اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

اسلام دشمن ابلہسی طاقتوں کی سرگرمیاں

اسلام کے قرون اول میں خلافت راشدہ جیسے شاندار آغاز کے بعد چھ صدیوں تک بنی اسماعیل کے ہاتھ سے اسلامی اقتدار اور قیادت چھن جانے کا تذکرہ کرتے ہوئے اسلام دشمن ابلہسی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کا تذکرہ نہ کرنا تاریخ کے ساتھ بڑا ظلم ہوگا۔

مسلمانوں کی نظریاتی پختگی، ایمانی کیفیات اور جذباتی لگاؤ میں وقت کے ساتھ ساتھ کمی آ جانا معمول کی بات ہے اور عین فطرت انسانی ہے اور اس قانون خداوندی اور آفاقی سچ کا ”ذوی العقول“ میں سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ تاہم — اگر کوئی نادیدہ قوت اور ابلہسی گروہ کسی حق پرست گروہ کے درپے ہو جائے اور اس کو گزند پہنچانے اور راہ حق سے ہٹانے (DERAIL کرنے) کو اپنا مشن بنا لے اور سارے جائز ناجائز وسائل اور طریقے استعمال کر دے اور اس کے نتیجے میں حق پرستی کا پرچم سرنگوں ہو جائے تو اپنوں کی کوتاہیوں کے تذکرے کے ساتھ ساتھ غیروں کا ماتم کرنے اور ان کی بے اصولیوں، وعدہ خلافیوں اور مارا آستیں بن کر کاٹنے کے عمل کا تذکرہ کرنے کو جی ضرور چاہتا ہے۔

عالمی ابلہسی قوت جس کا سب سے بڑا مظہر اور علمبردار گروہ مجموعی طور پر بنی اسرائیل

ہے اور اس میں سے بھی یہود اور عیسائیوں کا پروٹسٹنٹ (PROTESTANT) گروہ ہے۔

ملک یمن کے عیسائی حکمران ابرہہ کے مکہ پر حملہ کر کے حضرت محمد ﷺ کی دنیا میں تشریف آوری (میلاد النبی ﷺ) کو سبوتاژ (SABOTAGE) کرنے کے کی کوشش سے لے کر بیثاق مدینہ کی خلاف ورزیاں، بنی نصیر، بنی قبیقاع، بنی قریظہ کی سازشیں، خیبر سے اخراج، دو متہ الجندل میں سرکوبی، انہیں کے اٹھائے ہوئے فتنے دجالوں (جو مدعی نبوت بھی تھے) کا خاتمہ، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں حضرت محمد ﷺ کی وصیت کے عین مطابق کہ ﴿أَخْرِجُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ مِنْ جَزِيرَةِ الْعَرَبِ﴾ (یہود و نصاریٰ کو جزیرہ عرب سے نکال دو) پر عمل درآمد، نیز حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور مبارک میں ان کا بلوایوں کے خلاف طاقت استعمال نہ کرنے کا عزم جس سے ان ابلیسی طاقتوں کے اسلام کے خاتمے کے فوری منصوبے خاک میں مل گئے۔ (یاد رہے کہ سیاسی اعتبار سے جو ابلیسی تحریک دشمنان اسلام نے جو ان کی تھی اور اس کے اثرات مدینے تک آگئے تھے اگر اس کے خلاف طاقت استعمال کی جاتی جو کہ ان کے VISION کے مطابق لازمی ہونا تھا اور یوں آنا فانا جلدی اسلام کی تعلیمات، صحابہ کرام اور قرآن مجید کو ختم کر دیا جاتا، یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مومنانہ فراست، بصیرت باطنی تھی کہ انہوں نے طاقت استعمال نہ کر کے ان کے سارے منصوبے خاک میں ملادے اور وہ ابلیسی منصوبہ جو چند مہینوں کا تھا اس سقوط بغداد کی شکل میں چھ صدیوں بعد عملی شکل میں سامنے آسکا۔ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے درپردہ ابلیسی طاقتوں نے مسلمانوں کو باہم لڑا دیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے لے کر سقوط بغداد تک ہزاروں عنوانوں سے اپنے مقصد کی طرف پیش قدمی کو ممکن بنایا۔

اس دور میں شمالی افریقہ کے علاقے میں اس گروہ نے مسلمانوں میں سے ہی بعض ایسی قوتوں کو کھڑا کیا اور ان کی مدد کر کے مرکز سے لڑا دیا اور مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا۔ فاطمی خاندان 909ء - 1171ء شمالی افریقہ (بشمول مصر) پر چھایا رہا اور اس کی سرگرمیاں حقیقی اسلامی تعلیمات کے اس قدر خلاف تھیں کہ انہوں نے ایک وقت میں مکہ پر حملہ کیا، بیت اللہ کو آگ لگا دی، حج کئی سال موقوف رہا اور حجر اسود اکھاڑ کر ساتھ لے گئے اور ایک عرصہ تک فاطمی حکمرانوں کے لئے تخت کے ساتھ پائیدان کے طور پر استعمال ہوتا رہا۔

اس سیاسی اور جغرافیائی پس منظر میں امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے آنکھ کھولی۔ 1258ء میں سقوط بغداد اور ہلاکو خان اور چنگیز خان (تاتاریوں) کی دہشت کی وجہ سے مسلمان پست ہمتی کا شکار تھے اور دشمن کی مرعوبیت کے ساتھ ذہنی پس ماندگی بھی عام تھی۔ گزشتہ دو تین صدیوں میں یونانی فلاسفہ کی کتابوں کی بھرمار کی وجہ سے امت کا ذہن طبقہ اس طرف کھچا چلا جا رہا تھا اور اس کے زیر اثر عوام میں مایوسی اور دین سے دوری کے ساتھ بد عملی نے بھی قدم جمائے تھے۔ انصرفارابی (870ء - 990ء) ابن سینا (970ء - 1037ء)، عمر خیام (1039ء - 1131ء)، ابن رشد (1126ء - 1198ء) مسلمانوں میں سے اٹھ کر عجمی فلسفوں کا پرچار کر رہے تھے۔ اور وحی، جنت، دوزخ، آخرت، فرشتے، سب چیزیں عقل کی یونانی ترازو میں تول کر ڈ کرنے کا رجحان دن بدن بڑھتا جا رہا تھا۔

ان عجمی فلسفوں اور نظریات کے فروغ پذیر ہونے پر فطری طور پر مسلمان زعماء اور وارثانِ علوم نبوت میں جو رد عمل سامنے آیا وہ دو قسم کا تھا: پہلا طبقہ ایسے افراد پر مشتمل تھا جو عجمی (یونانی، ایرانی، ہندی وغیرہ) نظریات کا دفاع دلیل کے ساتھ کرنے کو ترجیح دے رہا تھا اور دورِ بنو عباس کے آغاز میں دوسری صدی ہجری (750ء) کے بعد ابھی اسلامی جذبات اور ایمانی کیفیات، بعد کے ادوار کے مقابلے میں بہت بہتر تھے اور اسلامی جذبات اور امت مسلمہ کی اجتماعی یادداشت میں ابھی دورِ خلافت راشدہ اور اس کے بعد کے ادوار میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مسحور کن شخصیات کا سحر تازہ تھا۔ لہذا ایمان اور مابعد الطبیعیاتی حقائق کو موضوع بحث بنانے اور ان پر یقین رکھتے ہوئے عقل و فطرت کے دلائل سے یونانی فلاسفہ کے نظریات کا دفاع کرنے کے عمل کا آغاز ہوا۔

یہ سوچ، انداز کلام اور بات سمجھانے اور ابلاغ کا انداز چونکہ ماضی کے مقابلے میں مختلف تھا لہذا شروع شروع میں اس میں بڑا جوش و جذبہ، ولولہ، ایمانی کیفیات اور یقین و اذعان نمایاں تھا۔ صاف ظاہر ہے دورِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں فریق مخالف کی بات کا جواب وحی آسمانی سے آنا تھا اور آتا تھا۔ لہذا اس دور کی خصوصیت یہ تھی کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کسی سوال پر

”اللہ ورسولہ اعلم“ کا مختصر اور مسکت جواب دیتے تھے۔ دور صحابہ رضی اللہ عنہم میں کسی بات میں اختلاف پر قرآن مجید کے ساتھ فرمان رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کا حوالہ کافی سمجھا جاتا تھا کہ اس میں ہر مسئلے کا حل اور ہر سوال کا شافی و کافی جواب مضمحل ہے۔

تاہم دور صحابہ کے بعد اب بات یقیناً قرآن و سنت (یا قرآن و حدیث) سے استدلال کی تھی اور اس میں مسلمانوں کے باہمی نزاعات اور اختلافات میں بھی رائے اور اجتہاد کا دخل ہو گیا تھا اور اجتہاد کا یہ راستہ اسلام کے پھیلاؤ، بین الاقوامیت اور توسیع کے لئے ہمیشہ مثبت ہتھیار سمجھا گیا ہے۔

اس طرز بحث سے آہستہ آہستہ ایک پورا دبستان وجود میں آ گیا جو عقل و فکر، حالات حاضرہ، ماحول کے مطابق قرآن و حدیث کے احکامات کی وضاحت کرتے تھے اور بالخصوص یونانی فلاسفہ کی موٹھ گائیوں کا مسکت جواب دیتے تھے۔ یہ حضرات متکلمین کہلائے اور اس علم اور فن کا نام ”علم کلام“ رکھ گیا۔

تاہم اس علم کلام کی خوبیوں کے ساتھ جو خلا اور خامی تھی وہ یہ تھی — کہ اسلام کا دفاع کرنے والا کوئی ”متکلم“ اگر کسی درجے میں ’ضعف بشری‘ کے تحت مخالف عجمی نظریات سے متاثر ہو جائے — تو ایسا شخص اسلام کا دفاع کرتے کرتے ان نظریات کو آگے بڑھنے کا موقع فراہم کر رہا ہوگا بظاہر یہ صورت بڑی معصوم فطری اور بے ضرر لگتی ہے تاہم — اسی بشری کمزوری سے دشمن نے فائدہ اٹھا کر ہمیشہ اسلام کو نقصان پہنچایا کہ کوئی ایک شخص بظاہر ”اسلام کا محافظ“ بن کر اٹھا اسلام کے دفاع کے میدان میں کام شروع کیا، معرکے سرانجام دیے، نام پیدا کیا اور پھر آہستہ آہستہ عجمی نظریات کو پھیلانے اور عام کرنے میں اپنا رول ادا کرنا شروع کر دیا اور اہل اسلام کچھ عرصے کے لئے اس سے دھوکا کھا گئے اگرچہ ایسے حضرات کا کام جلد ہی اہل علم کی نگاہوں میں آجاتا — تاہم امت کا ایک حصہ ضرور اس گمراہی کی رو میں بہہ جاتا ہے۔

اس طبقہ متکلمین میں بڑے بڑے نام ہیں اور انہوں نے بڑا کام کیا اگرچہ ایک حصہ فطری طور پر — کالی بھیڑوں پر بھی مشتمل ہے جنہوں نے دفاع کرتے کرتے یونانی اور عجمی نظریات کو عام کر دیا۔

اس طبقہ متکلمین کی خامیوں اور بعض مسلمان فلسفیوں کے طرزِ عمل اور افکار کے نتیجے میں ردِ عمل کے طور پر اور ANTITHESIS کے طور پر ایک بالکل دوسرا نقطہ نظر سامنے آ گیا اور وہ نقطہ نظریوں تھا کہ اسلام کی تعلیمات اور ایمانی کیفیات نیز قرآن و حدیث کے دفاع کے لئے ہمیں قرآن کی ظاہری تعلیمات پر کاربند ہونا چاہیے اور اس کی کوئی تاویل نہیں کرنی چاہیے۔ اس طبقے کا اصول یہ طے پایا کہ ہمیں اسلام کا دفاع اپنے عقائد اور تصورات کے حصار میں رہ کر کرنا ہے کوئی مانے یا نہ مانے کسی پر اثر ہو یا نہ ہو، کوئی اسلام قبول کرے یا نہ کرے، ہمیں اپنے عقائد و تصورات کے اندر ہی دفاع کا فریضہ سرانجام دینا ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، ان کے بہت سے تلامذہ اور دیگر معروف اہل علم پہلے طبقہ میں سے تھے۔ جبکہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ دوسرے طبقے میں سے تھے بعد کے زمانے میں یہی دو طبقات، دو نقطہ ہائے نظر اور دو مکاتب فکر یا SCHOOL OF THOUGHTS کے طور پر تاریخ کے صفحات پر موجود ہیں۔

بنو عباس کی حکومت کے آخری دور میں اور سقوط بغداد کے فوراً بعد امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے پہلے طبقہ کی نمائندگی کی ہے۔ جبکہ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے دوسرے طبقے کی اور ان دو عظیم ہستیوں میں شدید اختلاف، تنازع اور ان کے متبعین میں باہمی رنجش اور دوریوں کا سبب بنیادی طرز استدلال کا فرق ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس میدان میں اپنی خداداد صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے اپنے ماحول میں مسلمانوں کے جذبات کو جلا بخشی۔ عام حوصلے جو پست ہو چکے تھے ان کو مضبوط کرنے کا کام کیا اور امت مسلمہ کے ایک بڑے حصے کو سقوط بغداد کے بعد شدید کچھاؤ اور پس ماندگی (TENSION AND DEPRESSION) سے نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔ جزاء اللہ عنا احسن الجزاء۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی وفات پر ان کا جنازہ۔۔۔ لوگوں کی دلوں کی دھڑکنوں کا اڈا ہوا سیلاب تھا جو شمار سے باہر تھا۔

درحقیقت آپ کے کارناموں میں ایک شعبہ تعلیم کے سلسلہ کو فروغ دینا تھا۔ چنانچہ آپ کے ہزاروں شاگرد اور ہم خیال پیدا ہو گئے اور علمی میدان میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری

ہوا جس کے ذریعے ردّ بدعات و رسومات، بے عملی کے خلاف جہاد اور اپنے مخصوص انداز میں ایمانی کیفیات کا دفاع شامل تھا۔ مناظرہ اور چیلنج کے میدان میں فلاسفہ کے ساتھ پنچہ آزمائی رہی اور ان کے فلسفہ کے ردّ کے لئے ساری زندگی سرگرم عمل رہے اور چھوٹی بڑی کئی تصانیف میں فلاسفہ کی بے بنیاد باتوں کا ردّ کر دیا "الردّ علی المنطقیین" اس دور کے پس منظر میں حرف آخر ہے۔

آپ صاحب قلم بھی تھے، صاحب سیف بھی، لہذا جہاد کے میدان میں بھی صف اول پر رہ کر کام کیا ہے اور شہادۃ علی الناس کے فریضے کا، جو ہر باصلاحیت مسلمان (عوام و خاص) پر فرض ہے، حق ادا کر دیا۔

ذاتی حالات و کوائف

نام احمد، لقب تقی الدین، کنیت ابو العباس۔ آپ کا سلسلہ نسب یوں ہے: تقی الدین ابو العباس احمد بن شیخ شہاب الدین بن ابو البرکات عبدالسلام الحسنبلی الحرانی۔ ولادت: آپ ملک شام کے شہر حران میں ربیع الاول 661ھ / جنوری 1263ء کو پیدا ہوئے۔ وفات: ذیقعدہ 728ھ / ستمبر 1328ء۔ آپ کے خاندان کے تمام افراد "تیمیہ" کی طرف منسوب تھے جس کی ایک وجہ یہ لکھی گئی ہے کہ آپ کی دُور کی ایک دادی کا نام تیمیہ تھا، یہ اتنی بڑی عالمہ فاضلہ خاتون تھی کہ سارا خاندان اس کی طرف منسوب ہو گیا۔

چھ سال کی عمر میں والدین کے ساتھ دمشق منتقل ہو گئے، یہاں آ کر معروف علمی درسگاہ دارالحدیث السکر یہ اور دیگر درس گاہوں کے اساتذہ سے صرف و نحو، منطق، ادب، فقہ، حدیث اور تفسیر وغیرہ مختلف علوم حاصل کیے۔ ابھی عنقوانِ شباب کے مراحل میں تھے کہ آپ کی ذہانت و قابلیت کے چرچے ہونے لگے، نوعمری میں ہی علوم قرآنیہ، حدیث، فقہ اور مناظرہ میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ مذاکرات و مناظرات کی مجالس میں جب آپ علمی قابلیت کے جوہر دکھاتے تو بڑے بڑے علماء دنگ رہ جاتے۔ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے سترہ سال کی عمر میں افتاء و تصنیف کا سلسلہ شرع کر دیا تھا، بائیس سال کی عمر میں حکومت نے انہیں دمشق کے عظیم مدرسہ دارالحدیث السکر یہ میں شیخ الحدیث کے منصب پر فائز کر دیا۔ امام ابن تیمیہ نے جب مدرسہ میں پہلا درس دیا تو آپ کی علم و فضل کی شہرت کی بناء پر علماء اور قاضی حضرات کی خاصی تعداد اس میں شامل ہوئی۔

امام صاحب نے اس درس میں ”بسم اللہ الرحمن الرحیم“ کے اتنے معارف و نکات بیان کیے کہ سامعین حیران رہ گئے۔ ان کی عمر ابھی تیس سال بھی نہ ہوئی تھی کہ انہیں قاضی القضاة کا عہدہ پیش کیا گیا، لیکن انہوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

امام موصوف بہت مسائل میں فقہاء سے اختلاف بھی رکھتے تھے۔ ان کی تدریس کا انداز کچھ ایسا ہوتا تھا کہ کسی مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے ائمہ مجتہدین اور فقہاء کے اقوال بیان کرتے ہوئے جو قول حق کے مطابق سمجھتے اس کی دو ٹوک حمایت کرتے اور کسی لومۃ لائم کا خوف نہ رکھتے، تقریر و تحریر اور خطبات و فتاویٰ میں بھی آپ کا یہی انداز تھا۔ چنانچہ 698ھ میں آپ نے ایک استفتاء کے جواب میں ”عقیدہ جمویہ“ کے نام سے ایک تحریر لکھی جس میں متکلمین کے مذہب پر بھرپور تنقیدانہ جائزہ پیش کیا اور چونکہ بہت سے قاضی اور علماء متکلمین کے ہم خیال بھی تھے اس لئے عناد و مخالفت کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہو گیا۔ نیز امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے مشرکانہ رسومات اور بدعات کے خلاف بھی بھرپور جہاد کیا۔ رجب اور شعبان کی بدعتوں پر تفصیلی کتابیں لکھی اور بعض بدعات کا خاتمہ کیا۔ لوگوں کو جاہل و اعظوں، ان پڑھ مولویوں اور خود ساختہ پیروں کے چکر سے نکال کر کتاب و سنت کی پیروی کا درس دیا۔ اس سلسلہ میں آپ کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور ایک طبقہ آپ کا دشمن ہو گیا جس وجہ سے متعدد بار پابند سلاسل ہوئے۔

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ 1326ء میں دمشق کے قلعے میں نظر بند کر دیے گئے۔ یہاں وہ اپنے بدنام کنندگان کے خلاف رسائل اور ان تمام مسائل پر مستقل کتب لکھنے میں مشغول ہو گئے جن کی وجہ سے وہ قید ہوئے تھے۔ لیکن جب ان کے دشمنوں کو ان کی ان تصانیف کا علم ہوا تو انہیں ان کی کتابوں، کاغذ اور روشنائی سے محروم کر دیا گیا۔ اس سے انہیں زبردست دھکا لگا۔ انہوں نے نماز اور تلاوت قرآن سے تسکین خاطر چاہی۔ انہی قید و بند کی صعوبتوں میں ذوالقعدہ 728ھ ستمبر 1328ء کو اس دار فانی کو چھوڑ کر دار بقا کا رخ کر گئے۔ ان کا جنازہ بڑی دھوم دھام سے اٹھا اور اندازہ ہے کہ ان کی نماز جنازہ میں دولاکھ مرد اور پندرہ ہزار عورتیں شریک تھیں۔ قبرستان صوفیہ میں ان کو دفن کیا گیا جہاں باقی قبریں مٹ چکی ہیں اور ان پر جامعہ سوربیہ کی عمارات تعمیر کر دی گئی ہیں صرف امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی قبر محفوظ ہے۔



مصادر و مراجع

- شاہکار اسلامی انسائیکلو پیڈیا مولفہ سید قاسم محمود
- اردو معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور
- ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ مولفہ ثروت صولت
- عظیم شخصیات کے آخری لمحات۔ مولفہ خواجہ طاہر محمود کوریجہ
- تاریخ المشاہیر۔ مولفہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری
- سیرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ، مولفہ مولانا عبدالسلام ندوی
- حضرت عمر بن عبدالعزیز مولفہ پروفیسر سید محمد ابوالخیر کشفی
- تاریخ اسلام، مولفہ شاہ معین الدین احمد ندوی
- تاریخ الخلفاء، مولفہ جلال الدین السیوطی
- عبرت نامہ اندلس، مولفہ پروفیسر رائن ہارٹ ڈوزی
- اعلائے کلمۃ الحق کی روایت، اسلام میں، مولفہ میاں محمد افضل
- امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ حالات، کمالات، ملفوظات، مولفہ علامہ جلال الدین السیوطی
- سیرت نعمان امام ابوحنیفہ کی سوانح حیات، مولفہ علامہ شبلی نعمانی
- امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کی سیاسی زندگی مولفہ مناظر احسن گیلانی
- ترجمہ حیات امام ابوحنیفہ۔ مولفہ مولانا غلام احمد حریری
- امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ، مولفہ پروفیسر کمال عثمانی ○ امام احمد بن حنبل مولفہ ملک نصر اللہ خان عزیز
- 100 عظیم سائنس دان (۹۰) امام غزالی رضی اللہ عنہ، مولفہ رفیق انجم، ابراہیم عمادی
- افکار غزالی مولفہ مولانا محمد حنیف ندوی ○ الغزالی مولفہ علامہ شبلی نعمانی
- ارشادات شیخ عبدالقادر جیلانی مولفہ مولانا محمد صادق سیالکوٹی
- غنیۃ الطالبین مولفہ شیخ عبدالقادر جیلانی
- حیات صلاح الدین ایوبی، مولفہ سراج دین احمد ○ سلطان صلاح الدین ایوبی مولفہ مقصود ایاز
- امام ابن تیمیہ رضی اللہ عنہ، مولفہ ڈاکٹر غلام جیلانی برق

NATION MASTER ENCYCLOPEDIA : WEB ○

أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ
بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

قِيلُوا لَهُمْ

حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةً

وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ

ان لوگوں سے لڑتے رہو

یہاں تک کہ فتنہ (یعنی کفر کا فساد) باقی نہ رہے

اور دین سب اللہ ہی کا ہو جائے

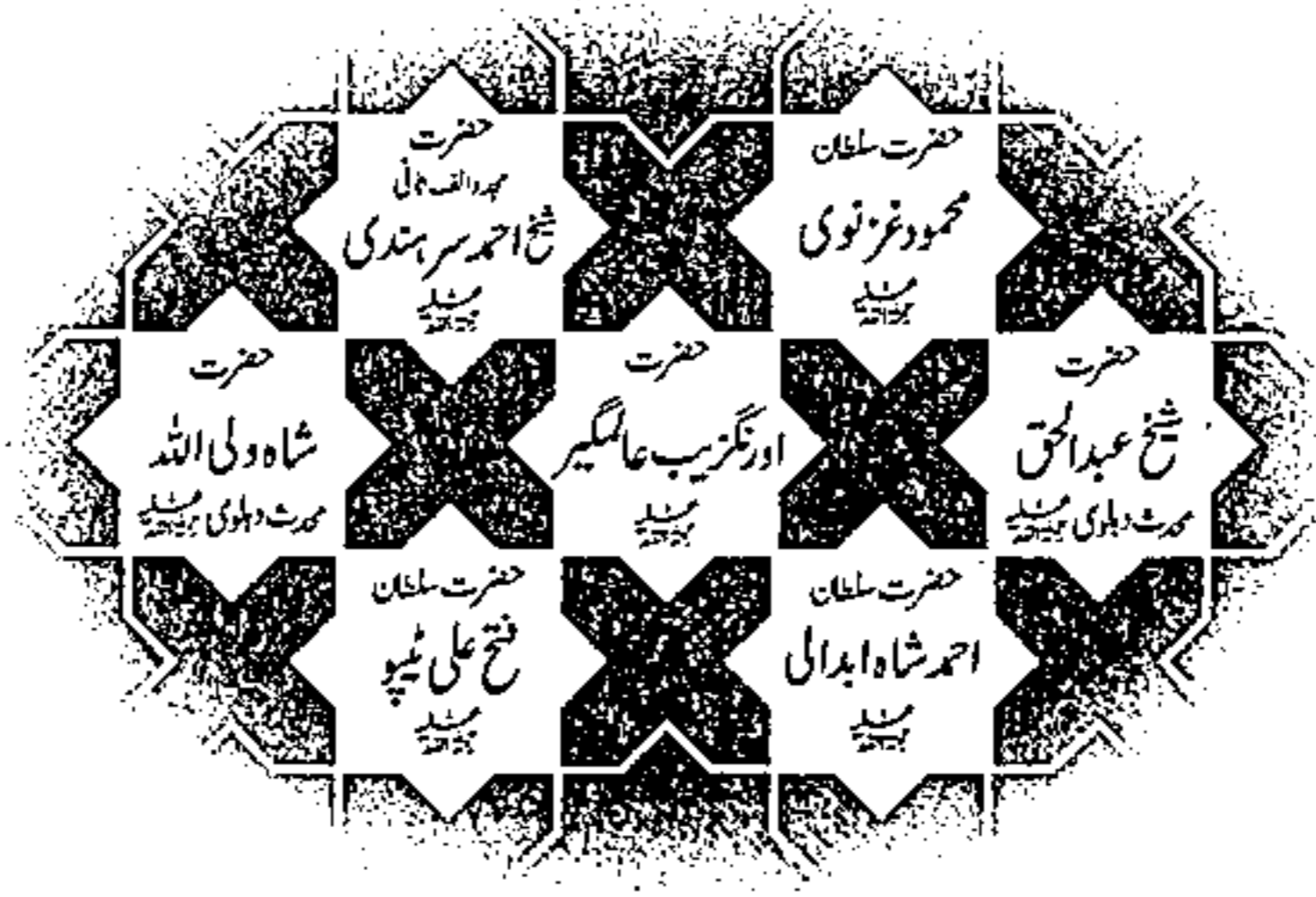
(سورة الانفال، آیت 39)

کیا تو نے صحرا نشینوں کو یکتا
 خبر میں، نظر میں، اذانِ سحر میں!
 طلبِ جس کی صدیوں سے تھی زندگی کو
 وہ سوز اس نے پایا انھیں کے جگر میں!
 کشادِ دل سمجھتے ہیں اُس کو
 ہلاکت نہیں موت ان کی نظر میں!
 دلِ مردِ مؤمن میں پھر زندہ کر دے
 وہ بجلی کہ تھی نعرہٴ 'لاتذر' میں!
 عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے
 نگاہِ مسلمان کو تلوار کر دے

فرمودہ اقبال

طشقند کی شہر
(انڈس کے میدان جنگ میں)

حصہ دوم



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مشمولات

- 1 مقدمہ 7
- 2 حضرت سلطان محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ 9
- 3 حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ 19
- 4 حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ 39
- 5 حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ 49
- 6 حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ 59
- 7 حضرت احمد شاہ ابدالی رحمۃ اللہ علیہ 71
- 8 حضرت سلطان فتح علی بیوی رحمۃ اللہ علیہ 87

- 1 حضرت عمر بن عبدالعزیز
- 2 امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت
- 3 امام احمد بن حنبل
- 4 امام غزالی محمد بن محمد
- 5 شیخ عبدالقادر جیلانی
- 6 سلطان صلاح الدین ایوبی
- 7 امام ابن تیمیہ تقی الدین
- 8 سلطان محمود غزنوی ناصر الدین
- 9 حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی
- 10 حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی
- 11 حضرت اورنگزیب عالمگیر محی الدین
- 12 حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی
- 13 حضرت احمد شاہ ابدالی
- 14 سلطان فتح علی ٹیپو شہید
- 15 حضرت شاہ اسماعیل شہید
- 16 حضرت مولانا فضل حق خیر آبادی
- 17 حضرت امداد اللہ مہاجر کی
- 18 حضرت محمود حسن شیخ الہند
- 19 حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی
- 20 حضرت مولانا محمد علی جوہر
- 21 حضرت علامہ محمد اقبال

دورِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد سے قیام پاکستان تک کی 21 اسلامی انقلابی شخصیات کے اسمائے گرامی

رحمۃ اللہ علیہم

مقدمہ

الحمد للہ کہ قرآن اکیڈمی جھنگ میں چند سال قبل منعقد ہونے والے سیمیناروں میں عظیم اسلامی انقلابی شخصیات پر سامنے آنے والے قیمتی خیالات کی اشاعت کا منصوبہ آگے بڑھ رہا ہے۔ 21 شخصیات کے اس سنہرے سلسلہ کے حصہ اول کی اشاعت ہو چکی ہے اور دوسرا حصہ بھی پریس کے لیے بالکل تیار ہے۔ ہمارے اندازوں میں بھی یہ بات نہ تھی کہ حصہ دوم کی طباعت کا مرحلہ اتنی جلدی سامنے آجائے گا۔ حصہ سوم کی تیاری کا کام بھی جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق شامل حال رہی تو ان شاء اللہ جلد ہی حصہ سوم بھی قارئین تک پہنچ جائے گا۔

21 اسلامی انقلابی شخصیات کے حالات پر حصہ اول، حصہ دوم اور حصہ سوم کی طباعت کے بعد اس علمی ذخیرہ کو یکجا چھاپنے کا بھی ارادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ اس کے لیے اسباب جمع فرمادے آمین، اور اس کاوش کو اس میں تمام اصاغروا کا برسب کے لیے توشہ آخرت بنا دے آمین۔

انجینئر مختار فاروقی
قرآن اکیڈمی جھنگ

18 جنوری 2013ء

5 ربیع الاول 1443ھ



اہم مسیحی صدیاں		اسلامی شخصیات	
18	1701-1800AD 1112-1215AH	1601-1700AD 1009-1112AH	1501-1600AD 906-1009AH
17	1401-1500AD 803-906AH	1301-1400AD 700-803AH	1201-1300AD 597-700AH
16	1101-1200AD 494-597AH	1001-1100AD 391-494AH	901-1000AD 288-391AH
15	1250	1226	1258
14	1250	1226	1258
13	1250	1226	1258
12	1250	1226	1258
11	1250	1226	1258
10	1250	1226	1258
حکمران	علماء	صوفیاء	شخصیات تصہ دوم
اسلامی تاریخ کی اہم شخصیات			
دسویں تا اٹھارھویں صدی عیسوی			



ناصر الملک سلطان

حضرت

محمود غزنوی

رحمۃ اللہ علیہ

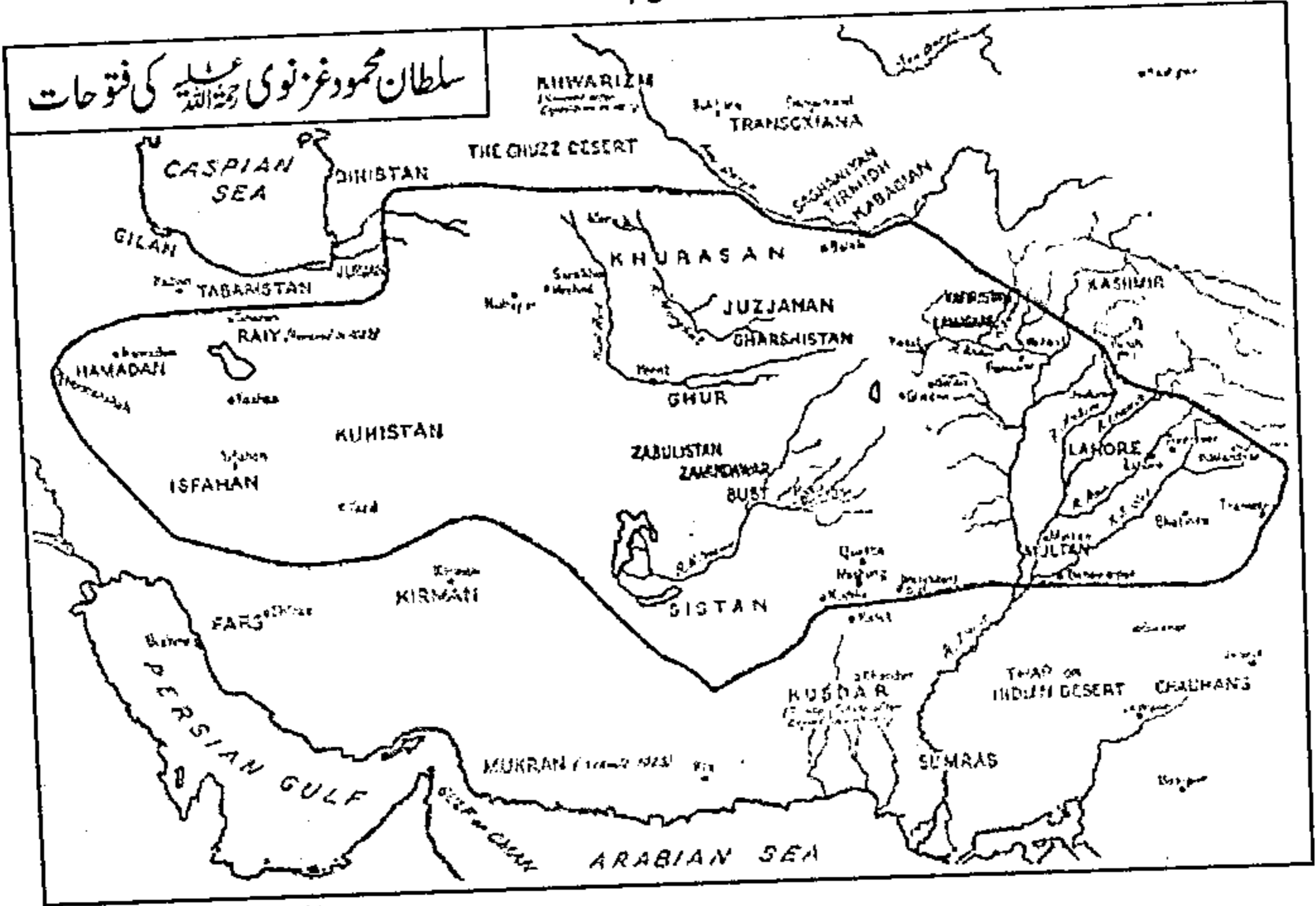
ولادت : 361ھ / 971ء غزنی (افغانستان)

○ 994ء میں صوبہ خراسان کے گورنر بنے

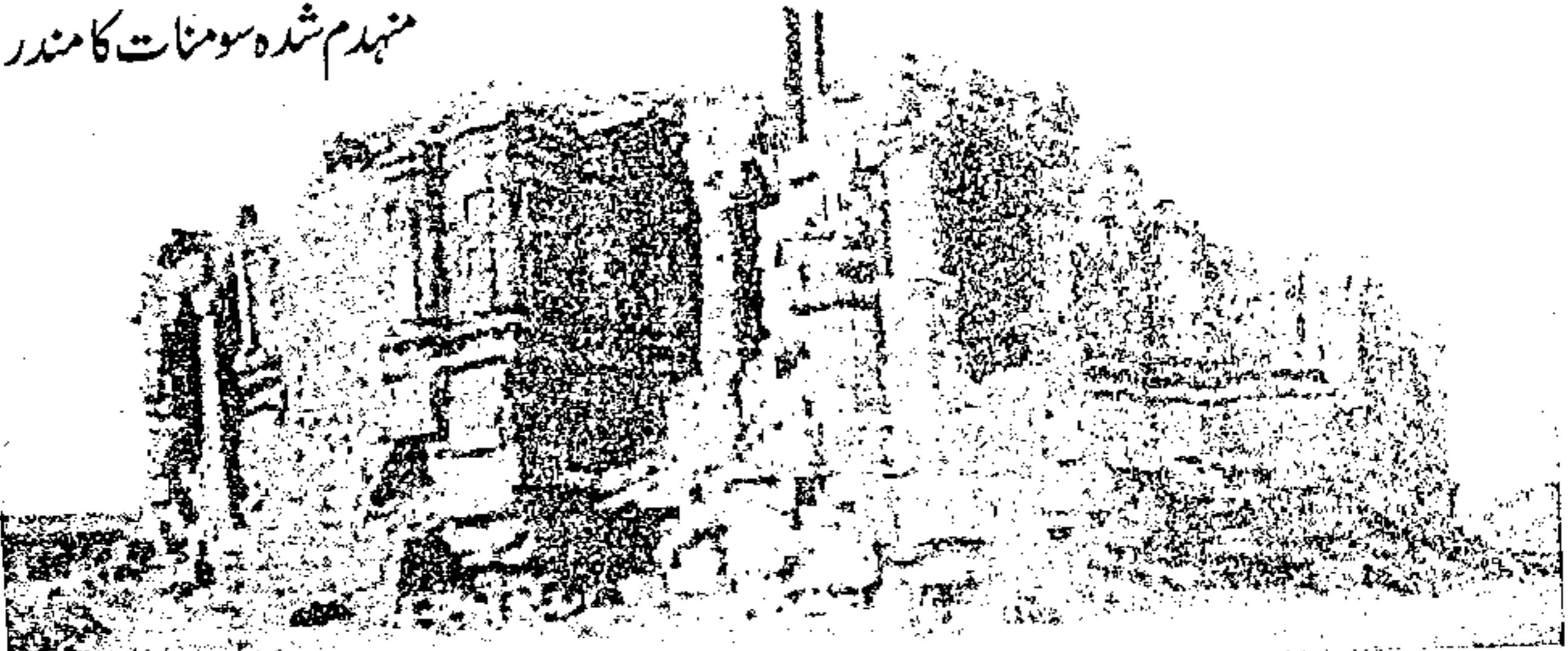
○ 998ء میں غزنی کے حکمران بن گئے

○ 1025ء میں سومنات کو فتح کیا

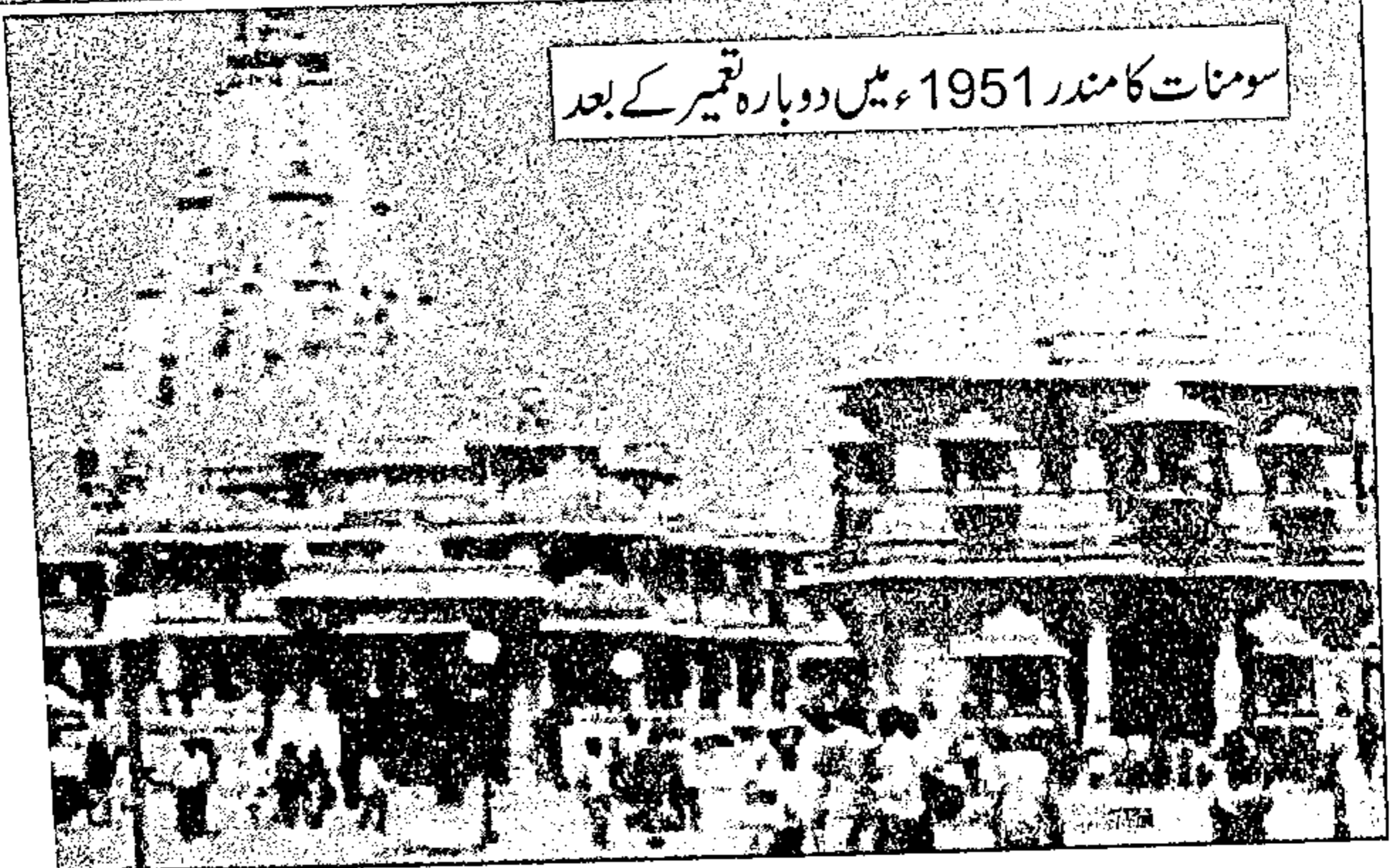
وفات : 421ھ / 1030ء غزنی (افغانستان)



منہدم شدہ سومنات کا مندر



سومنات کا مندر 1951ء میں دوبارہ تعمیر کے بعد



سلطان محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ 971ء میں غزنی افغانستان میں پیدا ہوئے اور ایک بھرپور مجاہدانہ زندگی گزاری، ایک بہت بڑی سلطنت کی بنیاد رکھی اور 1030ء میں غزنی میں وفات پائی۔

تاریخ اسلام کی 21 نامور اسلامی انقلابی شخصیات میں سے سات شخصیات کے تذکرے کے بعد اب جنوبی ایشیا میں اسلام کے ورود اور استحکام کی طرف رخ کرتے ہوئے سلطان محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر ناگزیر ہے۔

جنوبی ایشیا پاک و ہند کے ساحلی علاقوں اور مشرق بعید انڈونیشیا وغیرہ میں اسلام عرب تاجروں کے تجارتی اسفار اور تجارتی روابط کی وجہ سے خلافت راشدہ کے دور ہی میں متعارف ہو گیا تھا اور نور ہدایت کی کرنیں لوگوں کے دلوں کو متور کرنے لگی تھیں۔ انڈونیشیا کے لوگوں میں اسلام تیزی سے پھیل رہا تھا اور تجارتی قافلوں کی آمد و رفت سے مرکز اسلام سے ان کا مسلسل رابطہ بھی گہرا اور مضبوط تھا۔

بر عظیم پاک و ہند کے وسیع تمدنی علاقوں میں اسلام کا ورود مسعود حضرت محمد بن قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں ہوا ہے۔ یہ 93ھ اور 711ء کا واقعہ ہے۔ اس دور تک اسلام کی تبلیغ و توسیع اور نبی عن المنکر کا مثبت جذبہ سرد پڑ چکا تھا اور بنو امیہ کے لئے حکومت کا استحکام ہی سب سے اہم مسئلہ رہا۔ اعلیٰ حکومتی ایوانوں میں اسلام کی برکات — ظلم و جبر اور نا انصافی کے ساتھ جا گیر داری کے جڑ پکڑنے کی وجہ سے نظر نہیں آتی تھیں۔ پاک و ہند میں اسلام کی یہ آمد قرآن مجید کے حکم کے مطابق تو وسیع اسلام کے مثبت جذبے سے نہیں بلکہ ایک وقتی اشتعال انگیز واقعہ کے سبب ہوئی تھی۔ اگرچہ شرک میں ڈوبے اس علاقے میں اسلام کی ہدایت اور برکات کی ہلکی سی

پھوار بھی مقامی آبادی کو مسحور کر گئی اور اسلام نے لوگوں کے دلوں کو فتح کر لیا۔ حضرت محمد بن قاسم رضی اللہ عنہ نے راجہ داہر کو شکست دے کر سندھ فتح کیا، منصورہ میں اسلامی حکومت قائم کی جو سندھ کا دار الحکومت بنا پھر پنجاب فتح کیا اور ملتان کو دار الحکومت بنایا اور شمال میں کشمیر تک کا علاقہ اس کے قبضے میں آ گیا گویا موجودہ پاکستان تشکیل پا گیا۔ جس وقتی جذبے سے مسلمان افواج یہاں آئی تھیں وہ جذبہ زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکا اور اسلامی حکومت کی مزید تبلیغ و توسیع کی سرگرمیاں رُک گئیں البتہ اس علاقے کے اسلامی قلمرو میں شامل ہونے سے مسلمان مبلغین اور اہل علم کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہو گیا جس سے اسلام کی تبلیغ کی انفرادی سطح پر کوششیں تیز ہو گئیں۔

بڑا عظیم ایشیا میں جنوبی ایشیا کی حقیقتاً ایک منفرد حیثیت ہے۔ شمال مشرق، شمال، شمال مغرب اور مغرب سے عظیم پہاڑی سلسلوں سے گھرا ہوا ہے جنوب مغرب، جنوب اور جنوب مشرق میں بحیرہ ہند اور خلیج بنگال واقع ہے۔ اس خطے کی تہذیب، تمدن اور تاریخ ہی اپنے قریبی علاقوں سے ممیز و منفرد ہے۔ روس کو علیحدہ کر کے اس حصے کا رقبہ ایشیا کے 1/4 حصے کے برابر ہے۔ اس حصے کو انگریزی میں SUB-CONTINENT کہتے ہیں جس کا اردو ترجمہ اکثر برصغیر کر دیتے ہیں جبکہ زیادہ مناسب (براعظم کی تصغیر) برعظیم پاک و ہند ہے۔ اس برعظیم پاک و ہند کو جغرافیائی حساب سے 3 حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے اور ان تینوں حصوں کی تاریخ اور ثقافت بھی الگ الگ ہے۔ پہلا حصہ وادی سندھ کا ہے جو موجودہ شمال مشرقی افغانستان، پورا پاکستان، بھارتی حصے کا پنجاب راجپوتانہ اور کشمیر سمیت شمالی علاقہ جات پر مشتمل ہے۔

دوسرا حصہ دریائے گنگا کی وادی ہے۔ یہ دریا ہمالیہ سے نکل کر قدرے جنوب مشرق کی طرف بہتا ہوا خلیج بنگال میں جا گرتا ہے۔ موجودہ بھارت (UPPER HALF) دریائے گنگا کی وادی ہے اور یہ شمالی بھارت زیادہ تر میدانوں اور زرخیز مینوں پر مشتمل ہے۔

تیسرا حصہ جنوبی بھارت ہے جو کئی طرح کے پہاڑی علاقوں پر مشتمل ہے زرخیز علاقہ کم ہے۔ اور زیادہ تفصیل میں جائیں تو مزید تین حصوں پر مشتمل ہے جو ثقافت تمدن اور نظریات

میں بھی مختلف ہیں۔

وادی سندھ میں انسانی تاریخ بہت قدیم ہے موہنجوداڑو اور ہڑپہ آج سے تقریباً 5000 سال قبل کے ترقی یافتہ شہر تھے۔ جنوبی بھارت میں اسی کے قریب کی تہذیب پائی جاتی ہے۔ اس حصے میں زیادہ تو میں مغرب سے آکر آباد ہوئی ہیں جو یہاں آکر یہیں کے ہو کر رہ گئیں۔ دراوڑ نسل کے لوگ، آریہ، منگول غرض کئی نسلوں اور مزاج کے لوگ گزشتہ دس ہزار سال میں یہاں آئے اور آباد ہوئے۔ سری لنکا نام کا ملک اس جنوبی ایشیا کا حصہ ہے اور مشہور ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے جنت سے نکال کر وہاں اتارا تھا۔ واللہ اعلم

سندھ اور ہند حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد کے نام بھی بتائے جاتے ہیں جس سے طوفانِ نوح کے بعد ان کی اولاد کے یہاں آکر آباد ہونے کا اشارہ ملتا ہے۔ مصر سے نکلنے کے بعد بنی اسرائیل کے ایک قبیلہ کا خلیج فارس سے سمندر کے ذریعے جنوبی ہند پہنچنے کو بھی بعد از قیاس قرار نہیں دیا جاسکتا۔

اگر اوپر درج آرا تسلیم کر لی جائیں تو چونکہ قرآن کہتا ہے ابراہیم علیہ السلام سے قبل دنیا کے ہر خطے میں اور ہر قوم کے لئے انبیاء و رسل علیہم السلام تشریف لاتے رہے ہیں تو صنم خانہ ہند میں 1800 ق م تک یقیناً پیغمبر آئے ہوں گے اگرچہ ان کے بارے میں حتمی طور پر کچھ کہنا ممکن نہیں ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے کئی امتحانوں میں کامیابی کے بعد جو انعامات دیے تھے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کی نسل کو بطور خاص پروان چڑھائے گا اور آئندہ صرف ابراہیم علیہ السلام ہی کی نسل میں انبیاء اور رسول مبعوث ہوں گے اور وحی و کتاب کے حامل بنیں گے۔ اگر بنی اسرائیل کے ایک قبیلے کا جنوبی ایشیا میں وارد ہونا مان لیا جائے تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک ان میں نبوت و رسالت کا امکان بھی رد نہیں کیا جاسکتا ہے اگرچہ مثبت طور پر چونکہ قرآن مجید میں اس کا تذکرہ نہیں ہے لہذا کسی شخصیت کو نبی یا رسول قرار دینا ممکن نہیں ہے۔

ہندومت، جین مت اور بدھ مت اس جنوبی ایشیا کے تین قدیم مذاہب ہیں جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے ہی یہاں رائج تھے۔ ہندومت اور جین مت میں کوئی اعتقادی طاقت ایسی مانتی پڑے گی کہ اس نے بدھ مت کو زیادہ دیر قبول نہیں کیا اور اس کو اس خطے

سے نکال باہر کیا آج مشرق بعید کے ممالک جاپان سمیت سب بدھ مت کے پیروکار ہیں مگر برعظیم
پاک و ہند میں بدھ مت کے پجاری نہ ہونے کے برابر ہیں۔

بدھ مت کا دور 600 ق م سے 600 عیسوی تک ہے۔ چین مت، ہندو ازم ہی کی
ایک شاخ ہے۔ بدھ مت کا فروغ زیادہ وادی سندھ اور شمالی حصے میں ہوا جبکہ چین مت اور
ہندو مت کا زیادہ فروغ جنوبی حصے میں ہوا اگرچہ ہندو ازم پورے علاقے میں موجود رہا۔

ہندو ازم کے عروج کا دور عظیم سلطنتوں کی شکل میں 600 ق م سے لے کر 200 عیسوی
تک ہے۔ جبکہ اس کے بعد بھی 1200 عیسوی تک مختلف راجاؤں اور بادشاہوں کے نام سے کئی
بڑی سلطنتیں وجود میں آئیں تاہم پہلی تابارہویں صدی عیسوی ہندو مت کے رعب و دبدبے اور ترقی
و عروج کا دور ہے جس میں ان کے جو بھی عقائد تھے وہ سمٹ کر ان کے دستکاروں، ہنرمندوں اور
نقاشوں کے فن میں نمایاں ہو گئے۔ وسطی ہند اور راجپوتانہ میں 600 عیسوی سے لے کر 1100
عیسوی تک جو عبادت گاہیں تعمیر ہوئیں ان میں اس تہذیب کا عروج جھلکتا ہے اگرچہ کوئی بھی سلیم
الفطرت آدمی شاید ان عبادت گاہوں اور ”مقدس مقامات“ کو دیکھنا بھی گوارا نہ کرے۔ فحاشی
و عریانی اور بے حیائی کے یہ مناظر۔۔۔ جن ذہنوں نے ان کے خیالات پیش کیے، جن ذہنوں
نے اس کو منصہ شہود پر لانے کی حامی بھری، جن لوگوں نے خزانے لٹا دیے اور جن ہنرمندوں نے
اپنی ہنرمندی اور لگن کے ساتھ بے حیائی کے یہ مناظر تخلیق کیے وہ شاید تحریری آرٹ، نیچرل آرٹ
اور ابا حیات پرستی کے مذاحوں کو اپنی طرف ATTRACT کرنے کے قابل ہوں۔ حقیقت میں کوئی
باغیرت انسان خود اپنے اہل خانہ کے ساتھ ان ”مقدس مقامات“ کا نظارہ نہیں کر سکتا۔

[قارئین کرام کی خاص توجہ کے لئے اگر اس بات کا تذکرہ یہیں ہو جائے تو مفید بھی

رہے گا اور فوری تقابل (SIMULTANEOUS CONTRAST) کا کام بھی دے گا کہ
برعظیم کے مسلمان بادشاہوں نے جو بعد میں عظیم عمارات تعمیر کیں ان کا حسن، لطافت، پاکیزگی
فن کی بلندی پر غور فرمائیں تو پیغمبر اسلام ﷺ کے ایک ہزار سال بعد بھی دیکھیں گے کہ اکبر جیسے
بادشاہ، جسے ہندو دلیوتا سمجھتے ہیں، (اگرچہ ہمارے نزدیک اس نے اسلام سے منہ موڑ کر دین الہی
ایجاد کر کے ارتداد کا پھندا اپنے گلے میں ڈال لیا تھا) کی تعمیرات میں انسانی بت تو کجا حیوانی بت

بھی بہت کم ہیں اور اس کے مزار پر بھی آیاتِ قرآنی ہی لکھی ہوئی ہیں۔ جبکہ اللہ نے ہندومت اور جین مت پر اتمامِ حجت کے لئے شاہ جہان سے عورت کی محبت کی ایک یادگار تاج محل تعمیر کرا دی۔ پورے برعظیم کا مطلق العنان بادشاہ محبت کی یادگار تعمیر کرتا ہے اور وہ بھی اکلوتی چہیتی بیوی کی، مگر اسلامی تعلیمات کا یہ اثر ہے کہ اس تعمیر میں جو عننائی فن کا شاہکار ہے اور عجائبات عالم میں شمار ہوتا ہے، کوئی عریاں تصویر نہیں، کوئی بت نہیں بلکہ شائستگی اور نفاست کا فن پارہ ہے، وہاں مسجد ہے عبادت گاہ ہے قرآنی آیات ہیں، اگر کوئی تصویر ہے بھی تو شاید شاہ جہان اور اس کی بیگم کا فائل فوٹو کا نقش ہے۔ یہ کوئی مذہبی مقام اور مقدس یا تراکی جگہ نہیں تھی تاہم سوچ، عقائد، نظریات و خیالات کا میلان و رجحان صاف ظاہر ہوتا ہے۔ اب جو لوگ تن پرست، حُسن پرست اور صورت پرست ہیں وہ جائیں تو اب بھی ہندومت اور جین مت کے مقدس مقامات کے فن کی تعریف کرتے رہیں تاہم اگر صورت کے ساتھ بے صورت REALITY اور UNSEEN کا کوئی لحاظ فہم و فراست اور ذہن و خیال میں ہو تو تہذیبوں کا فرق صاف پہچانا جاسکتا ہے]

اس پس منظر میں سندھ میں ایک خاندان کی حکومت چل رہی تھی اور اس کا مشہور سپوت راجہ داہر حکمران تھا (712ء-680ء) کہ اس کے دور میں اسلام کی شعاعیں وادی سندھ کو منور کر گئیں۔ ہماری مراد ہے کہ 93ھ (712ء) میں حضرت محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کیا اور تین سالوں میں منصورہ اور ملتان میں حکومتیں قائم کیں اور کشمیر تک کا علاقہ یعنی پوری وادی سندھ مسلمانوں کی حکومت کے زیر نگیں آگئی۔

یہ بات یاد رہے کہ اسلام کا سب سے اعلیٰ اور خالص زمانہ دور نبوت کے بعد خلافت راشدہ کا ہے پھر اس کے بعد کے زمانے ہیں۔ 93ھ تک خلافت راشدہ کے بعد اسلام ایک قدم نیچے اتر چکا تھا (ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ) اگرچہ بعد کے ادوار کے حساب سے وہ دور بہت بہتر تھا اور پھر وادی سندھ میں اسلام کی آمد کسی مثبت تبلیغی جذبے کے ساتھ نہ تھی بلکہ ایک خاتون کی بے حرمتی پر سبق سکھانے کے لئے TEEN AGE کا ایک نوجوان سندھ کی جمعی حکومت ختم کر کے رکھ دیتا ہے۔ وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں تھی کہ پورے برعظیم میں اخلاق و کردار، انسانی قدروں اور مساوات انسانی نام کی کوئی چیز نہیں تھی جس سے اسلام کی آمد کو لوگوں نے خدائی عطیہ سمجھا اور

دل کی آواز گردانا یہاں تک کہ جو لوگ مسلمان نہ ہوئے انہوں نے محمد بن قاسم کے بُت بنا کر اس کو پوجنا شروع کر دیا کہ یہ انسان نہیں دیوتا ہے۔

یہ ہے اسلام کا برعظیم میں پہلا داخلہ جس سے موجودہ پاکستان کا علاقہ فتح ہو کر اسلامی سلطنت کا حصہ بن گیا جسے 12 سو سال گزر چکے ہیں۔ قائد اعظم نے بجا طور پر QUOTE کیا تھا کہ ”پاکستان اسی دن وجود میں آ گیا تھا جس دن وادی سندھ کا پہلا شخص مسلمان ہوا تھا“۔

بنو امیہ کے زوال کے باعث اسلام کی آمد کا یہ دور پھسپھسا سا رہا اور اسلامی فتوحات کا دائرہ وادی سندھ سے آگے نہ بڑھ سکا چنانچہ آئندہ تین سو سال صورت حال میں تبدیلی نہیں آئی اس دوران مؤرخین مسعودی اور ابن حوقل یہاں آئے تو منصورہ اور ملتان کی دو حکومتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ بد قسمتی سے اسلامی حکومت کا سرحدی علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں دسویں صدی میں قرامطہ (آغا خانیوں کی ایک شاخ جو حاضر امام کا تصور رکھتے ہیں اور حاضر امام کو معاذ اللہ نبی کا درجہ دیتے ہیں) کا دور حکومت آ گیا مصر میں فاطمیوں کی طرح یہ بھی مرکز گریز عناصر تھے جن کی سرگرمیوں نے نتیجتاً بیرونی اسلام دشمن طاقتوں کو زیادہ فائدہ پہنچایا۔

مصر کے فاطمی خاندان (جس نے کعبہ پر حملے کر کے حجر اسود نکالا تھا کعبہ کی بے حرمتی کی اور حجر اسود کو اپنے دار الحکومت لے جا کر تخت شاہی پر بیٹھتے وقت پائیدان کے طور پر استعمال کرتے رہے) کی سرکوبی کے لئے اللہ تعالیٰ نے نور الدین زنگی رحمۃ اللہ علیہ اور صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ کو کھڑا کیا اور برعظیم پاک و ہند میں قرامطہ کی سرکوبی کے لئے اللہ تعالیٰ نے محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کو موقع عطا فرمایا۔

1000ء تک صنم خانہ ہند میں ہندو اقتدار کا رعب داب رو بہ زوال تھا اور مذہبی اور حکومتی اثر بہت ڈھیلا پڑھ چکا تھا کہ حضرت محمد بن قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے 300 سال بعد درّۃ خیبر سے اسلام کے دوبارہ تازہ دم داخلے کا مرحلہ آیا ہے۔

اگرچہ تین صدیوں میں عملی طور پر اسلام کا نظریاتی پہلو بہت کمزور ہو چکا تھا اور بغداد کی سلطنت عباسی بھی رو بہ زوال تھی تاہم ”ہند“ کی حیا سوز اور حیوانی ثقافت و مدنیت کے زیر اثر اسلام کا یہ ”ورود“ بھی باد بہار ہی کا ایک جھونکا تھا جو اس خطے کے باضمیر اور زندہ روحوں کو مسحور

کر گیا۔ سلطان محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا عسکری محاذ سنبھالے رکھا اور مبلغین اسلام نے صنم خانہ میں ڈیرے لگا کر لوگوں کے دلوں کو مسخر کر لیا۔ چنانچہ شیخ علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ 1005ء میں تشریف لائے (وفات 1077ء)۔ شیخ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ لاہور سے اٹھے اور آگے ہندومت کے گڑھ میں اجمیر شریف جا بیٹھے (1141ء تا 1230ء)۔ اس کے بعد تو ایک طویل سلسلہ ہے۔ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ (1191ء) ملتان، خواجہ بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ (وفات 1235ء) دہلی، فرید الدین شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ (1265ء) پاکپتن، حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ، (وفات 1325ء) دہلی، حضرت بہاؤ الدین نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ (وفات 1318ء) ملتان۔

محمود غزنوی کے والد کا نام سبکتگین تھا جو ایک سامانیوی سردار البتگین کا ترک غلام تھا۔ البتگین نے غزنوی سلطنت کی بنیاد ڈالی (881ء) جس کی وفات کے بعد بالآخر زمام حکومت سبکتگین کے ہاتھ آئی اس نے فتوحات سے سلطنت کو مستحکم کیا۔ اس کے بڑھتے ہوئے اقتدار کا اثر ہندوستان میں راجہ جے پال پر بھی پڑا جس سے جھڑپیں شروع ہو گئیں۔ سبکتگین کے سامنے سندھ اور ملتان کو باطنیوں کے تسلط سے آزاد کرانا تھا۔ 997ء میں سبکتگین کے انتقال (بلخ) کے بعد پہلے اسماعیل اور بعد ازاں محمود کو اقتدار مل گیا یوں ایک مستحکم سلطنت کے ساتھ اور اسلام کی نظریاتی اساسات کی آبیاری کے عزائم لے کر محمود سریر آرائے تخت ہوا۔

سلطان محمود نے پہلے سامانیوں سے گلو خلاصی حاصل کی بعد ازاں فتوحات اور حسن انتظام سے غزنی کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

افغانستان اور ہند کے تعلقات کی تاریخ 300 ق م سے معلوم ہے۔ دراوڑ اور آریہ یہیں سے آئے تھے۔ سکندر بھی یہیں سے حملہ آور ہوا۔ ہندوستان کے حکمران آشوک کی حکمرانی کابل تک تھی۔ لہذا ہندوستان کے حالات اور تبدیلیوں کی خبریں سلطان محمود کو مسلسل ملتی رہتی تھیں۔ ہندوستان کے مذاہب کی حیوانی اور ابلیسی کارستانیوں اس کو پہلے سے معلوم تھیں تاہم اس کے حکمران بننے کے زمانے میں تاریخی اعتبار سے ہندوستان کے حکمران اپنے عروج اور ثقافتی و مذہبی تعمیرات کے بعد 600ء سے زوال پذیر تھے۔

سلطان محمود نے ہندوستان پر 17 حملے کیے۔ پہلے ملتان میں قرامطہ کا اقتدار ختم کیا پھر

راجپوتانہ اور دہلی کے آس پاس ہندوں کے راجہ جے پال (1008ء) اور دیگر مہاراجوں کو شکست دی جس سے اس کی شہرت عالمگیر ہو گئی۔ سلطان نے وادی گنگا پر حملہ کے نتیجے میں قنوج (1019ء)، ملید شہر، مستھر، اوتاہ اور میرٹھ وغیرہ فتح کیے۔ لاہور کو اس نے اس علاقے کا صدر مقام قرار دیا اور گوالیار (1021ء) اور کالنج بھی فتح کیا۔ سندھ کو 1029ء میں فتح کیا۔

سلطان کا سب سے بڑا کارنامہ ہندوستان سے برہمن راج کو ختم کرنا اور ذات پات میں لپسے ہوئے انسانوں کو اسلام کی تعلیمات کے تحت خود شناسی اور خود شعوری کا احساس دلانا تھا جس سے وہ اسلام کے دامن میں آ گئے۔ چنانچہ ہندو راج کی نشانی سومنات (جہاں ہندوستان کے سارے راجے، مہاراجے جمع ہو گئے تھے اور محمود کا راستہ روکنا چاہتے تھے) کو مسمار کرنا تھا (1026ء) جہاں محمود غزنوی بت فروشی کے عوض بت توڑ کر تاریخ میں محمود بت شکن مشہور ہوا۔ 1030ء میں سلطان محمود رحمۃ اللہ علیہ نے وفات پائی۔

ذاتی کردار اور علم کی قدر کے لحاظ سے بھی سلطان ایک بلند پایہ انسان تھا۔ خود عالم تھا اور اس کے ساتھ باعمل بھی۔ اس کی سیرت و کردار کے واقعات تاریخ کی زینت ہیں۔ اس کے اقتدار نے یہاں کی عوام کو ہندو فلسفہ کی بے حیائی اور انسانی پستی سے نکال کر مساوات، آزادی، خود آگاہی اور خدا شناسی کا درس دیا اور عظمت انسانی کے بام عروج تک پہنچا دیا ایسے ہی انسانوں کی خدمات کے عوض ان کی نیک نامی اور شہرت رہتی دنیا تک باقی رہتی ہے۔

ع ثابت است بر جریدۂ عالم دوام ما

کیا نہیں اور غزنوی کارگہ حیات میں
بیٹھے ہیں کب سے منتظر اہل حرم کے سومنات!

علامہ اقبال

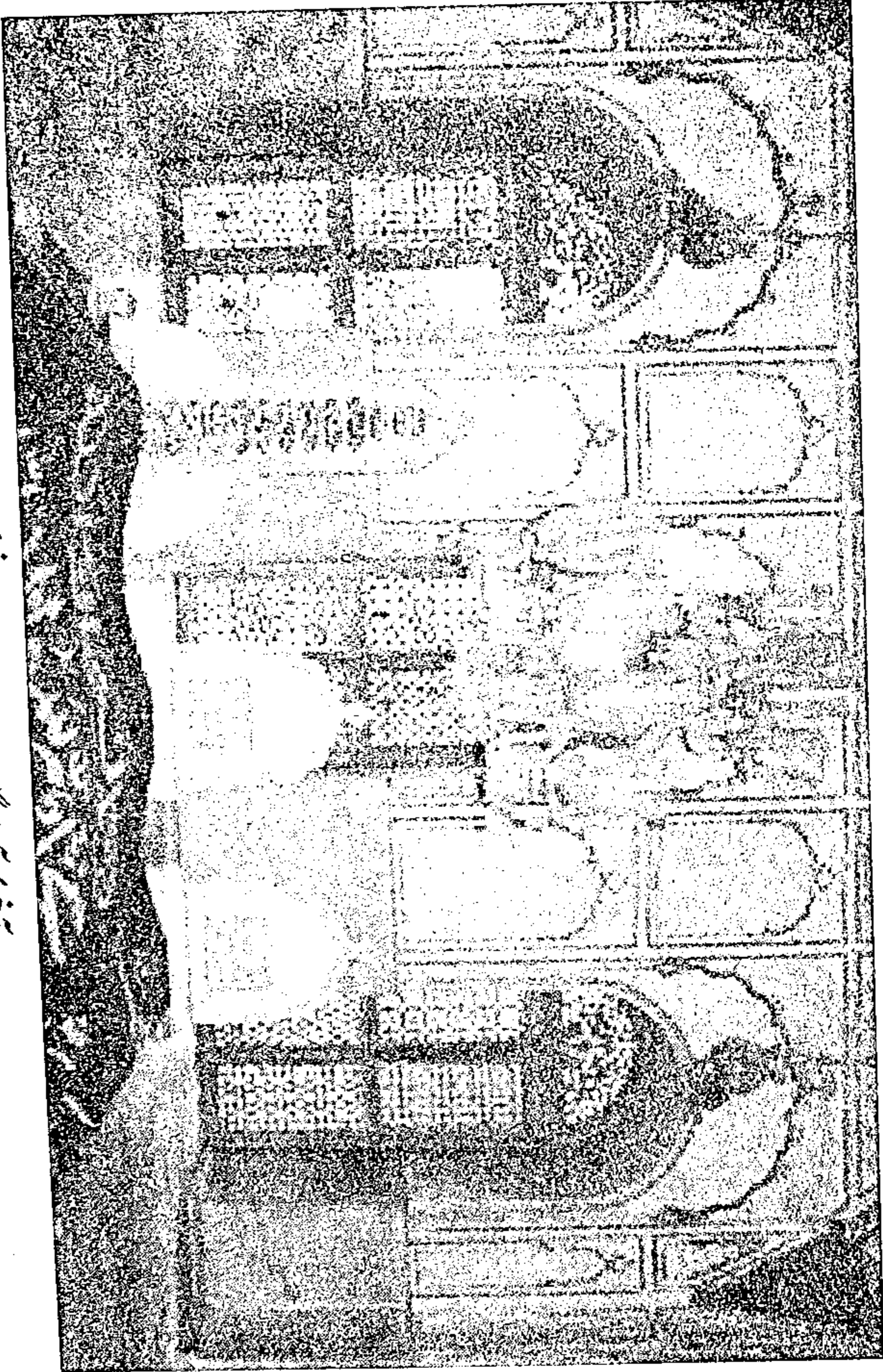


حضرت مجدد الف ثانی

شیخ احمد سرہندی

رحمۃ اللہ علیہ

ولادت: 971ھ/1564ء سرہند
○ 1619ء میں جہانگیر نے قلعہ گوالیار میں قید کر دیا
وفات: 1034ھ/1624ء سرہند



آخری آرا مگاہ حضرت بجدالف ثانی رضی اللہ عنہما

آپ جون 1564ء میں سرہند میں شیخ عبدالاحد کے ہاں پیدا ہوئے لقب بدرالدین اور کنیت ابوالبرکات تھی۔ سلسلہ نسب حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ آپ کی وفات مغل بادشاہ جہانگیر کے عہد میں دسمبر 1624ء میں ہوئی۔

آپ جس نام سے سب سے زیادہ مشہور ہیں وہ مجدد الف ثانی ہے اسلام کی تعلیمات کے مطابق انبیاء کرام ﷺ کا سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر آ کر تکمیلی شان کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اب اس دین کی آبیاری اور احیاء کا مرحلہ ہے جب داخلی و خارجی حالات کے تحت مسلمان اسلام سے دوری اختیار کر لیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ وقفے وقفے سے مسلمانوں میں ایسے رجال دین کھڑے کرتا رہا ہے جو مخالفین کی شرارتوں اور اپنوں کے غلو اور سرکشی کی وجہ سے دین اسلام کی تعلیمات پر جو پردے پڑ جاتے تھے ان پردوں کو ہٹا کر دین اسلام کے رخ روشن کو از سر نو انسانیت کے سامنے مبرہن کر کے اتمام حجت کر دیتے تھے۔

چنانچہ سنن ابوداؤد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا:

إِنَّ اللَّهَ يَبْعَثُ لِهَذِهِ الْأُمَّةِ عَلَى رَأْسِ كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مِنْ يُجَدِّدُ لَهَا دِينَهَا
 ”اللہ تعالیٰ اس امت کے لیے ہر صدی میں ایسا شخص بھیجتا رہے گا جو اس کے لیے اس
 کے دین کی تجدید کرے“

اسی حدیث مبارکہ کے مطابق انبیائے کرام ﷺ کے بعد دین کے خادموں میں سے سب سے اونچا مقام مجدد دین ملت کا ہے ان میں سے بعض شخصیات نے اس کا دعویٰ بھی کیا کہ وہ مجدد ہیں اور اکثر نے بے غرض اور بے نام ہی خدمات انجام دی ہیں۔ انہی بزرگوں اور

خادمانِ دینِ مبین میں ایک اہم نام شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔

ایک دوسرا تصور قرآن مجید میں یہ ہے اللہ تعالیٰ کے ہاں معاملات دنیا چلانے کے لئے جو تقویم جاری ہے وہ اس ذات باری تعالیٰ کے خاص دن ہیں جو عالم انسانیت میں ہمارے ایک ہزار سال کے برابر کا ایک دن ہے۔ چنانچہ سورۃ الحج اور سورۃ الم السجدہ دو جگہ اس بات کا تذکرہ ہے سورۃ الحج کے الفاظ یہ ہیں:

وَإِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ ۝ (47)

”اور بے شک تمہارے پروردگار کے نزدیک ایک روز تمہارے حساب کے روسے ہزار برس کے برابر ہے۔“

یہی مضمون احادیث مبارکہ میں بھی ہے کہ سابقہ اُمت مسلمہ کی عمر اور ہدایت کا معاملہ ایک ہزار سال کا تھا۔ (چنانچہ اہل کتاب یہود و نصاریٰ میں بھی ہزار سال کی اہمیت کے پیش نظر MILLENNIUM کا تصور موجود ہے)

جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ چونکہ میری اُمت ختم نبوت کی وجہ سے آخری امت ہے لہذا مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ سابقہ امت کے مقابلے میں اسے نصف دن (یعنی پانچ سو سال) مزید عطا فرمائے گا۔ (ابوداؤد، باب قیام الساعة، عن سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ)

قرآن و سنت کی انہیں تعلیمات کا نتیجہ ہے کہ اُمت میں مُجددین ملت تشریف لاتے رہے اور ہزار سال کے خاتمے پر 1000 ہجری کے بعد جب حضرت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ماحول میں کام کیا تو آپ نے اپنے آپ کو صرف 1001 تا 1100 ہجری یعنی گیارہویں صدی ہجری کا مُجدد نہیں کہا بلکہ 1001 ہجری کے بعد جو تاریخ اسلام کی دوسری ہزاری شروع ہو رہی تھی اس کے مُجدد ہونے کا اظہار کیا جس سے آپ اس لقب سے مشہور ہو گئے چنانچہ اکثر لوگ آپ کے اسم گرامی کی بجائے آپ کو اسی لقب ”مجدد الف ثانی“ سے زیادہ یاد کرتے ہیں۔ (عربی میں ہزار کو الف کہا جاتا ہے اور ثانی کے معنی دوسرے کے ہیں)۔

گزشتہ صفحات میں حضرت سلطان محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ ہوا ہے اُن کی وفات 1030ء کی ہے جبکہ حضرت مجد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی دسمبر 1624ء کی ہے یعنی ان دونوں اکابرین

میں 600 سال کا زمانی فرق ہے، ان 600 سالوں میں دنیا میں بے شمار تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئی ہیں اور بڑے بڑے انقلابات نے جنم لیا ہے لہذا زمانی اعتبار سے ان دونوں زمانوں کے درمیان تاریخی اور نظریاتی تسلسل کو سمجھنے کی ضرورت ہے اس مقصد کے لئے ذیل میں کچھ وضاحتیں پیش کی جا رہی ہیں قارئین ان شاء اللہ ان کو مفید مطلب پائیں گے۔

چھ صدیوں کے اس زمانی بُعد نیز سپین، بغداد اور بر عظیم ہند و پاک کے مکانی بُعد کے پیش نظر ان گزارشات کو ہم کئی حصوں میں تقسیم کر کے پیش کریں گے۔

1- مشرق وسطیٰ — 1000ء تا 1600ء

○ سیاسی اعتبار سے

○ نظریاتی کمزوری اور وابستگی کے ادوار میں احیائے اسلام کی مساعی کی تاریخ

2- سپین (اندلس یا ہسپانیہ) میں اسلامی حکومت کے عروج و زوال کی داستان

اور اسلامی نظریاتی وابستگی کی تاریخ

3- دشمنان اسلام کی اسلام کو مٹانے کی کوششیں اور یہودی سرگرمیاں

4- پاک و ہند — 1030ء تا 1600ء

○ سیاسی اعتبار سے ○ اسلامی تعلیمات اور نظریاتی تسلسل کے اعتبار سے

آئیے ان عنوانات کے تحت مختصر انداز میں حالات و واقعات کا تذکرہ پڑھتے ہیں:

1 مشرق وسطیٰ ایران، ترکستان 1000ء تا 1600ء

سلطنت عباسی 750ء میں قائم ہوئی اور 865ء تک ایک صدی کے شاندار عروج کے بعد زوال پذیر ہونا شروع ہو گئی۔ 1000ء کے لگ بھگ اس عظیم سلطنت کا اقتدار ڈول رہا تھا، عالمی سطح پر اگرچہ مسلمانوں کی شان و شوکت قائم تھی تاہم اندرونی طور پر سلطنت دشمنوں کی سازشوں کی شکار ہو چکی تھی، قرامطہ اور فاطمی حکمرانوں نے مرکز سے علیحدگی اختیار کر کے وحدتِ امت کو سخت نقصان پہنچایا تھا، بارہویں صدی آنے تک سلطنت کے حصے بخرے ہو گئے، شمال میں سلجوقی حکمرانوں نے اپنا اقتدار قائم کر لیا تھا، دمشق وغیرہ کا علاقہ بھی عباسیوں کے براہ راست

کنٹرول میں نہیں تھا، مصر وغیرہ میں فاطمی خاندان عیسائیوں سے روابط بڑھا رہا تھا اور شمالی افریقہ تک عباسی حکمرانوں کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ ذاتی کردار کے اعتبار سے بھی عباسی بادشاہ جو نام کے خلفاء تھے اور حکمران طبقہ، امراء و رؤساء میں شراب نوشی عام ہو چکی تھی، مقتدر حلقوں میں راگ رنگ اور بے حیائی نے قدم جما لیے تھے، بغداد کے شہزادے عیاشی کی علامت بن چکے تھے اور بغداد الف لیلوی داستانوں کا شہر تھا جیسے آج کل سنگار پور وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ ہلاکو خان اور چنگیز خان جیسے ظالم لوگ آئے اور عباسی سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ 1258ء میں سقوط بغداد ہے۔

اس کے بعد دو صدیاں باہمی خلفشار اور افراتفری کی ہیں تا آنکہ خود ہلاکو خان کے بیٹوں اور پوتوں نے اسلام قبول کر لیا اور ان کے جذبہ اور گرم خون نے اسلام کو سہارا دیا اور تھوڑے عرصہ میں ہی مشرق و مغرب میں یہی لوگ چھا گئے۔ چنانچہ 1350ء میں ترکستان میں عثمانی سلطنت قائم ہو گئی، 1540ء ایران کا صفوی خاندان اور 1528ء ہندوستان میں مغلیہ خاندان حکمران بن گیا، جس سے مسلمانوں کی عظمت قدرے بحال ہو گئی۔ 1099ء میں بیت المقدس مسلمانوں کے ہاتھوں سے چلا گیا تھا۔ 1192ء میں صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ نے صلیبیوں سے واپس لیا۔ بعد ازاں 1453ء میں سلطان احمد فاتح نے قسطنطنیہ فتح کر کے اسلام کی عزت و عظمت کو چار چاند لگا دیے اور یورپ میں مشرق کی طرف سے فتوحات کے راستے کھول دیے۔

ایمان اور نظریاتی اعتبار سے حالات آہستہ آہستہ دورِ نبوت سے بُعد کی بنا پر دگرگوں ہوتے چلے گئے۔ امام غزالی، شیخ عبدالقادر جیلانی، امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہم کی مساعی نے اگرچہ یہود و نصاریٰ اور ان کے زیر اثر مسلمانوں کے اندر کے مرکز گریز اور گمراہ فرقوں کا ابطال کیا اور دین کی حفاظت کی، تاہم یہود و نصاریٰ کے میل جول اور اثر نفوذ کی وجہ سے یونانی اور ہندی فلسفہ کے زیر اثر مسلمانوں میں نظریاتی گمراہی پھیلی جا رہی تھی اور خود مسلمانوں کے اندر ارسطو و افلاطون کے حمایتی ہی نہیں پر جوش مبلغین پیدا ہو رہے تھے جو علی الاعلان اسلام کی نظریاتی بنیادوں اللہ، وحی، نبوت، فرشتے، آخرت کو ڈھا رہے تھے۔ چنانچہ ابن رشد، ابوالنصر فارابی، ابن سینا، عمر خیام جیسے لوگ اسی دور میں گزرے ہیں اور ان کے اثرات اُمت مسلمہ کے مجموعی ایمان اور

اعتقاد پر براہ راست مترتب ہوئے جس سے مسلمانوں پر زوال کے سائے گہرے ہوئے اور سلطنت عباسیہ کے ٹکڑے ہو گئے۔ پھر ہلاکو خان نے بغداد فتح کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے وہ صورت حال پیدا کر دی کہ ڈیڑھ سو سال بعد اسلام نے ہلاکو خان کی اولاد کو فتح کر لیا انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر اسلام کی حفاظت و صیانت کا جھنڈا انہی کے ہاتھوں میں دے دیا۔ چنانچہ ہندوستان اور ایران اور ترکستان میں انہی کی اولادوں نے پندرہویں صدی سے عروج حاصل کیا۔ بقول اقبال

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

2 سپین (یورپ) میں اسلام 1000ء تا 1600ء

ہندوستان میں اسلام 93ھ (711ء) میں حضرت محمد بن قاسم رضی اللہ عنہ کے ذریعے آیا جب کہ اس نے سندھ فتح کیا عین اس وقت 93ھ ہی میں حضرت طارق بن زیاد رضی اللہ عنہ نے شمالی افریقہ سے شمال کی طرف بحیرہ روم عبور کر کے جبرالٹر کے مقام سے یورپ میں داخل ہوئے جہاں کشتیاں جلانے کا مشہور واقعہ ہوا۔ جذبہ صادق تھا اور مسلمانوں میں ابھی شوق جہاد اور جاہ و جلال تھا لہذا ہسپانیہ کا علاقہ جہاں عیسائیت کے مظالم اور مقامی امراء و رؤساء کی سفاکی کی وجہ سے عوام بیزار و پریشان تھے، چند ہی عشروں میں مسلمانوں کے زیرِ کمان آ گیا اور بنو امیہ ہی کی ایک شاخ میں عبدالرحمن اول کے ذریعے ایک سلطنت کی بنیاد پڑ گئی تھی جو مشرق وسطیٰ سے دور اور مکانی اعتبار سے بھی کٹی ہوئی ہونے کی وجہ سے ذرا آزاد تھی اور بغداد کے سیاسی اتار چڑھاؤ سے متاثر نہیں ہوئی، اس سلطنت کو سات صدیاں بڑے آرام سے حکومت کرنے کا موقع ملا اور مسلمانوں کے ذریعے زیادہ تر علم اور تحقیق کی ترقی یہیں ہوئی جہاں پورے یورپ کے نوجوان غرناطہ اور اشبیلہ کی یونیورسٹیوں سے علم حاصل کر کے جاتے تھے۔ یہودیہاں بڑے اطمینان سے اور پرسکون زندگی گزار رہے تھے۔ تاہم وہ مسلمانوں کی آغوش میں بیٹھ کر عباسی سلطنت کے خلاف یہیں سے سازشوں میں بھی مصروف تھے۔

الحمراء اور دیگر اسلامی فنون کے نمونے آج بھی اس کی یادگار ہیں لیکن

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حقیقی ماننے والے تو اسلام کی طرف کھنچے آتے تھے (قرآن مجید میں ساتویں پارے کے آغاز میں اس کا ذکر ہے) حضرت نجاشی رضی اللہ عنہ کا اسلام بھی اس کا مظہر ہے مگر تثلیث اور الوہیت مسیح کے قائل عیسائی اور انبیاء کرام علیہم السلام کے قاتل یہودی طبقہ جو کبھی فری مین تھے تاریخ میں ZIONS کہلاتے ہیں اور آج بھی یہی صہیونیت (ZIONISM) کے علمبردار ہیں، آسمانی وحی کے دشمن اور انبیاء کرام علیہم السلام کو قتل کر کے آسمانی ہدایت کی عدم موجودگی میں من مانی کرنے کے خواہش مند یہی لوگ ہیں جو تاریخ میں شیطان کی پارٹی کے طور پر کام کرتے آرہے تھے (اور آج بھی ہیں)۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دور سے سازشوں میں ملوث یہ گروہ مسلمانوں کے اندر گھس کر کام کرتا رہا ہے، داخلی طور پر مسلمانوں کو آپس میں لڑانا اور نظریات کو کمزور کرنا ان کا خاص طریقہ واردات ہے۔

دوسری صدی ہجری سے انہوں نے یونانی فکر و فلسفہ (جو قتل انبیاء کے بعد خود تیار کرایا تھا تا کہ وحی اور آسمانی ہدایت کے مقابلے میں کھڑا کیا جاسکے) کی کتب کے تراجم کرائے اور مسلمانوں میں اسی کی اشاعت کی جس سے مسلمان اہل علم اور ذہین طبقات میں نظریاتی بحثیں چھڑ گئیں اور یوں اسلام سے تعلق ماند پڑتا چلا گیا جس کی حفاظت کے لئے مجددین ملت نے کام کیا ہے۔ (ان ہستیوں کا ذکر انہی صفحات میں ہو چکا ہے) 1000ء (چوتھی صدی ہجری کا اختتام) آتے آتے مسلمانوں میں داخلی انتشار بہت گہرا ہو گیا تھا، عباسی حکمران عیاشی میں پڑ کر بہت کمزور ہو چکے تھے اور حکومتی گرفت ڈھیلی ہونے کی وجہ سے علاقائی قوتیں سرا اٹھا رہی تھیں اور دشمن کو مخالفانہ کارروائیوں کے لئے مواقع فراہم کر رہی تھیں۔ اس نظریاتی انتشار اور سیاسی کمزوری کے باعث یہود کو اسلام دشمنی کے جذبے کے تحت ایک کاری وار کرنے کا موقع مل گیا (یاد رہے کہ 70ء میں بیت المقدس پر ٹائٹس رومی کے حملے کے بعد وہاں سے یہود کو جلا وطن کر دیا گیا تھا جہاں سے پھر یہ یہودی ساری دنیا میں پھیل گئے مدینہ، عراق، اصفہان روس، یورپ اور ہندوستان میں ان کی آمد بطور خاص نمایاں ہے) گیارہویں صدی عیسوی میں پورے یورپ کے مسیحیوں کو اٹھایا اور مذہبی جہاد کے لئے بیدار کیا۔ بیت المقدس 70ء میں رومیوں کے قبضے میں چلا گیا تھا پھر 300ء کے

قریب رومیوں کے عیسائی مذہب قبول کر لینے کے بعد عیسائی مرکز بن گیا اور مذہبی طور پر قبلہ بھی — پھر 637ء (15 ہجری) میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں فتح ہو کر مسلمانوں کے زیر انتظام آ گیا۔ اس وقت سے عیسائیوں کے دلوں میں تو اپنے قبلہ کے چھن جانے کا غم اور ماتم تھا ہی، یہود نے اس کو اکسایا اور صلیبی اور مذہبی جنگ کا عنوان دے کر اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کے لئے یورپ و قسطنطنیہ کو بیت المقدس کے حصول کے لئے اس مہم جوئی پر آمادہ کر لیا۔

چنانچہ عباسی سلطنت کی کمزوری اور ELITE طبقہ کی عیاشیوں اور ارسطو و افلاطون کے خیالات کے زیر اثر روشن خیالی اور LIBERALISM کے دلدادہ ہونے کا نتیجہ جہاد سے اعراض کی شکل میں نکلا اور 1099ء میں بیت المقدس مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل کر صلیبیوں کے پاس چلا گیا پورے یورپ میں خوشی کے ترانے گائے گئے اور یہود کے حوصلے مزید بڑھ گئے۔

ایک صدی بعد مسلمانوں میں احيائی کام اور تجدیدی مساعی کے زیر اثر جذبہ اور جوش پیدا ہوا اور دمشق سے نور الدین زنگی رحمۃ اللہ علیہ اور سلطان صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ اٹھے اور انہوں نے پہلے فاطمی سلطنت کے شر سے علاقے کو پاک کیا اور پھر طویل جنگ لڑ کر 1192ء میں بیت المقدس مسلمانوں کو واپس دلادیا۔ یہ دوسری صلیبی جنگ کہلاتی ہے (اور 2001ء کے بعد سے اب آخری صلیبی جنگ یعنی CRUSADE جاری ہے)۔

پورے یورپ کی فوجی طاقت اور مذہبی جوش و خروش کے باوجود بیت المقدس چھن جانے کی باعث یہودیوں نے فوجی اور سیاسی میدان کی بجائے سازشوں کا میدان منتخب کیا اور یورپی مسیحی حکومتوں کی بجائے کسی دوسری عالمی طاقت کے ذریعے مسلمانوں کی سیاسی برتری کو ختم کرنے کا منصوبہ بنایا اور سیکولر بنیادوں پر اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے جدید نظام NEW WORLD ORDER کی بنیاد رکھی۔

چنانچہ 1192ء کے تھوڑے ہی عرصہ بعد سے واقعات کی ترتیب کچھ یوں ہے

● یورپ میں 1215ء میں بنیادی انسانی حقوق کا تصور پیش کیا گیا۔

● 1225ء میں شاہ انگلستان نے مشہور زمانہ انسانی حقوق کا مشہور چارٹر

MAGNACARTA منظور کیا۔

○ مغربی چین میں حکمران منگول خاندان کوروسی علاقہ جات، ایران، (اصفہان میں پہلی باقاعدہ یہودی آبادی 206ء سے موجود ہے) اور بغداد تک موافق حالات کی یقین دہانی، مالی امداد اور مسلمانوں کے جنگی اور سیاسی راز دینے کا لالچ دے کر اس عظیم مہم کے لیے آمادہ کیا گیا جس کے نتیجے میں چنگیز خان اور ہلاکو خان نے آ کر پورا علاقہ تاراج کر دیا اور سلطنت بغداد کا نام و نشان مٹا دیا۔ 1258ء میں سقوط بغداد ہو گیا یہودی اس کامیابی پر حیران تھے کہ یہ کام ان کی توقع سے کہیں بڑھ کر تھا اس لئے وہ اس سے کوئی فوری فائدہ حاصل نہ کر سکے۔ (یہی دور ہے جب ایران میں سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ اور دمشق میں مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ اپنے کلام سے لوگوں کو آمادہ عمل کر رہے تھے)

○ چودھویں صدی عیسوی پورے مشرق وسطیٰ میں باہمی خلفشار اور افراتفری کا دور رہا جو یہود کے پینے اور گل کھلانے کے لئے موسم بہار تھا۔

○ یورپ میں انسانی حقوق اور اقلیتوں کو بھی مساوی حقوق کے تصور کے ذریعے یہود کو ذرا سکون ملا تو ایک طرف عیسائیوں کے ORTHODOX عقائد کے خلاف بغاوت کھڑی کر دی اور پروٹسٹنٹ تحریک کے ذریعے جدید ذہن کے مطابق نیا فرقہ کھڑا کر دیا اور اس کی ہر طرح سے سرپرستی کی، چنانچہ شریعت سے آزادی، اور روشن خیال مذہبیت کی بنیاد یہیں سے پڑی۔

○ پندرہویں اور سولہویں صدی میں مسلمان علاقوں میں بیداری پیدا ہوئی تو ترکستان میں عثمانی حکومت، ایران میں صفوی حکومت اور ہندوستان میں مختلف کمزور حکومتوں کے بعد مغلیہ سلطنت کو استحکام ملا۔ عثمانی حکومت نے اس قدر طاقت حاصل کی کہ 1453ء میں سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ فتح کر لیا جو عیسائیت کا صدیوں سے مضبوط گڑھ تھا۔ یہ واقعہ یہود کے لیے بڑا حیران کن تھا۔ چنانچہ پورے یورپ نے مل کر اور یہود کے ایماء پر 1492ء میں سپین سے مسلم اقتدار ختم کر دیا اور مزید ایک صدی میں وہاں سے مسلمانوں کا مکمل خاتمہ کر دیا۔

○ پروٹسٹنٹ فرقے کے ذریعے جدید خیالات کی آڑ میں یہود نے تورات اور انجیل کی تعلیمات کے برخلاف سود کی اجازت حاصل کر لی جس کا بھرپور فائدہ یہود نے ہی پہلا بینک، بینک آف انگلینڈ قائم کر کے اٹھایا (یہ بینک آج بھی یہود کی ملکیت ہے اور نجی ملکیت ہے) اس

سے یہود کو سود کی شکل میں بے پناہ (ناجائز) وسائل حاصل ہو گئے۔

● اگلے مرحلے میں بینکوں کے نظام کے تحت کاغذی سکہ (PAPER CURRENCY) کا اجراء ہے، جو تاریخ انسانی کا بہت عظیم المیہ ہے اور جس کے نقصانات آج تک انسانیت بھگت رہی ہے۔

● ہندوستان کی سیاست میں بظاہر یہود کا عمل دخل بڑا کم ہے مگر اندرون خانہ اکبر کی حکمرانی اور دین الہی کے اجراء میں یقیناً یہودی ذہن شامل ہے۔

● سودی معیشت، PAPER CURRENCY کا اجراء اور بے پناہ مالی وسائل کے حصول کے بعد یہود نے حکومت برائے اقتدار اور خدائی (LORD SHIP) کی بجائے حکومت برائے تجارت کا تصور عام کیا۔

● اس مقصد کے لئے 1498ء میں مشرق بعید تک رسائی کے لئے واسکو ڈی گاما نے مسلمان راہبروں (GUIDES) کے ساتھ جنوبی افریقہ کی بندرگاہ کیپ ٹاؤن کا راستہ معلوم کر لیا اور یورپی تجارتی بیڑوں کی آمدورفت شروع ہوئی تو ہندوستان اور مشرق بعید میں اپنی حکومتیں قائم کرنے کی بجائے ایسٹ انڈیا کمپنی (EIC) کا قیام 1600ء میں عمل میں آیا تاکہ ظاہری لیبل تجارت کا رہے اور درپردہ وسائل پر قبضہ کا مقصد بھی حاصل ہو جائے اور مقامی حکومتوں اور عوام کا رد عمل بھی سامنے نہ آئے۔

4 اسلام ہندوستان (پاک و ہند) میں 1000ء تا 1600ء

● ہندوستان میں اسلام 93ھ (711ء) میں مسلم جرنیل حضرت محمد بن قاسم رضی اللہ عنہ کے ذریعے آیا۔ مسلمانوں کی مہم کا مقصد کوئی تبلیغ یا اشاعت اسلام کا مثبت جذبہ نہیں تھا۔ ورنہ اس مہم کا حشر وہ نہ ہوتا جو فاتح جرنیل محمد بن قاسم رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیا گیا۔ جب کہ اس مہم کا جذبہ سندھ کے حاکم راجہ داہر کو اس کے بحری قزاقوں کی لوٹ مار کا سبق سکھانا تھا۔ جو انہوں نے مشرق بعید کے مسلم تاجروں کا مال لوٹ کر ظلم کیا تھا اور بالخصوص عورتوں کی بے حرمتی کی تھی۔ اس مہم میں پوری وادی سندھ (موجودہ صوبہ سندھ پنجاب کشمیر تک) کا علاقہ مسلمانوں کے زیر اثر آ گیا۔

● اسلام کے سندھ میں اس داخلے کی مثال موسم بہار میں ہلکی بارش کی ہے جس سے اسلام کی

برکات کی ایک جھلک وادی سندھ کے عوام کو مسحور کر گئی اور پورے ہند میں ضمیر انسانی کو مصنوعی خداؤں کے تصور سے آزادی دلانے کی نوید ثابت ہوئی۔

○ اس دور میں مسلمانوں کے مرکز میں باہمی خلفشار اور کسی مثبت جذبے کے نہ ہونے کی وجہ سے یہ مہم آگے نہ بڑھ سکی اور تین صدیاں یونہی گزر گئیں۔ اس دور میں مسلمان مبلغین اور اولیاء کرام اس علاقے میں آ کر اسلام کے فکر کی آبیاری کرتے رہے۔ حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی اس علاقے میں تشریف آوری بھی ثابت ہے۔

○ اسلامی قلمرو کی ہندوستان میں کسی توسیع کے نہ ہونے کی ایک خارجی وجہ بھی بہت اہم ہے وہ وجہ یہ ہے کہ ہندو فکر و فلسفہ کئی انقلابات دیکھ کر اور بدھ مت سے ٹکراؤ کے بعد اب بدھ مت مذہب کو مشرق بعید میں دھکیل کر اپنے ایک نئے عروج کی طرف بڑھ رہا تھا۔

وسطی ہندوستان میں اس عروج کی وجہ سے کئی سلطنتیں اپنے عظمت کے ڈنکے بجا رہی تھیں اور دور عروج کی جھلکیاں ان کے علوم و فنون اور تعمیرات سے ظاہر ہو رہی تھیں اسی دور میں بڑے بڑے مندر اور مذہبی استھان تعمیر ہوئے جو ہندو مت کی مخصوص فکر، تہذیب اور ثقافت کے علمبردار تھے یہ یاد رہے کہ عریانیت کا جذبہ تو ہر شخص میں فطری طور پر ہوتا ہے تاہم اس کو کسی حدود و قیود کا پابند کرنا اخلاق اور مذہب کا فریضہ ہے اسی وجہ سے انسانی لباس اور چادر و چادر یواری کا تصور ساری دنیا میں پایا جاتا ہے مگر اس عریانیت کا پرچار کرنا اور پھر اس کی انتہاء یہ کہ عریانیت اور بے حیائی کا پجاری ہونا یہ بات صرف ہندو مت کے حصے میں آتی ہے۔ چوکوں، شاہراہوں، پارکوں اور عجائب گھروں میں عریاں مجتسمے اور بے حیائی کے انداز تو مغرب، یونان اور شمالی یورپ میں بھی پائے جاتے ہیں مگر مذہبی عبادت گاہوں میں آخری درجہ کی بے حیائی کے مناظر کے مجتسمے اس کثرت کے ساتھ سجادینا جہاں جوان بوڑھے، عورتیں مرد، بچے بچیاں سب مذہبی جوش و خروش آتے ہیں۔ بے حیائی کی پرستش کا بھی آخری درجہ ہے (موجودہ مغربی تہذیب نے اس میدان میں انتہائی درجے کو حاصل کر کے دنیا میں دیکھا تو ہندو مت ان سے کہیں آگے تھا اس وجہ سے ہالی وڈ کی بے حیائی اور عریانیت سے ہالی وڈ کی ہندوستانی بے حیائی اور عریانیت بہت آگے ہے کہ مغرب اس معاملے میں ہندوستان کے سامنے سجدہ ریز ہے)

○ ہندوستان میں یہ عروج گیارھویں صدی تک جاری رہا ہے۔ سومنات کا مندر اور وسطی ہند کے مشہور زمانہ حیا سوز مناظر کے حامل مندر اسی زمانہ کی تعمیر ہیں جس کے اثرات بعد میں جنوبی ہندوستان پر اور پھر نیپال اور مشرق بعید کے ممالک پر پڑے ہیں۔ اسی وجہ سے آج کل ہر چہار طرف سے بے حیائی کے دلدادہ سیاح ہندوستان اور نیپال کی اس سیاحت کے لئے اُٹھ چلے آتے ہیں۔

ہندوستان کی اس منفرد حیا سوز اور ننگ انسانیت تہذیب ہی کا نتیجہ ہے کہ تاریخ میں ہندو مذہب کبھی ہندوستان سے باہر قدم نہیں نکال سکا۔ جب اس تہذیب نے عروج سے زوال کی طرف ذرا سفر شروع کیا ہے تو اب قدرت نے 1000ء کے لگ بھگ سلطان محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کو بھیجا ہے جس نے ہندومت کو شکست دی۔ ان کے سومنات کے مندر سمیت راجپوتانہ اور قریب کی سلطنتوں کو تاراج کر دیا اور یوں ہندوستان کے بد قسمت انسانوں کو برہمن کی غلامی اور بے حیائی کی آگ سے نکال کر سکون بخشا ہے اور اسلام کی روحانی، باحیاء اور باضمیر تہذیب و ثقافت سے روشناس کرایا ہے۔ اس کے بعد شہاب الدین غوری نے یہی کام کیا ہے اس کے ساتھ ہی مشرق وسطیٰ سے بہت سے مبلغین نے اس دور میں آ کر اسلام کی فطری، حسین اور خدائے واحد کی عبادت والی تعلیمات کو عام کیا ہے۔ (شیخ علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ وفات 1077ء۔ معین الدین اجمیری وفات 1230ء) ہندومت کے زوال، صوفیاء کی آمد اور مسلمان فاتحین کے حملوں سے عام ہندی انسان کے شعور کو آزادی ملی اور کثیر تعداد میں لوگوں نے اسلام کی تعلیمات کو قبول کر کے اپنے دلوں کو منور کیا ہے۔

چنانچہ وادی سندھ کی مسلم حکومت کو توسیع ہوئی اور یہ اقتدار شمالی اور وسطی ہندوستان تک پھیل گیا۔ چنانچہ اب 1200ء کے بعد مسلمان حکومتیں قائم ہوئیں جن کا مرکز دہلی تھا۔

1- خاندانِ غلاماں (نسلاً ترک) 1206ء - 1290ء قطب الدین ایبک (غوری کا غلام) التمش، رضیہ سلطانہ، ناصر الدین محمود، غیاث الدین بلبن (التمش کا غلام)۔

2- خلجی خاندان (ترک) 1290ء - 1320ء جلال الدین خلجی (چچا) علاؤ الدین خلجی (بھتیجا۔ چچا کو قتل کیا) اس دور میں نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ (دہلی) رکن الدین (ملتان)

قطب الدین مبارک شاہ۔

3۔ تغلق خاندان (ترک) 1320ء تا 1413ء غیاث الدین تغلق (منگولوں کو شکستیں

دیں) محمد تغلق (بیٹا) فیروز شاہ تغلق (چچازاد) محمود تغلق (امیر تیمور کا حملہ) دہلی فتح۔

4۔ سید خاندان۔ 1414ء۔ 1451ء سید خضر خان۔ سید علاؤ الدین عالم شاہ۔

5۔ لودھی (پٹھان) 1451ء۔ 1526ء بہلول لودھی۔ سکندر لودھی (آگرہ کی بنیاد

ڈالی) ابراہیم لودھی (پانی پت میں شکست)۔

6۔ مغلیہ سلطنت

○ ظہیر الدین بابر 1496ء۔ 1530ء

○ نصیر الدین ہمایوں 1530ء۔ 1556ء

○ سوری خاندان 1540ء۔ 1555ء

○ جلال الدین اکبر 1556ء۔ 1605ء

○ نور الدین جہانگیر 1606ء۔ 1627ء

ہندومت دسویں صدی عیسوی میں اپنے زوال کے بعد مسلم تعلیمات اور مسلمان حکمرانوں کے سامنے ٹھہر نہیں سکی۔ تاہم تین صدیوں کے بعد جب مسلم اقتدار میں اسلامیت، عدل و انصاف اور رعایا پروری کے اوصاف کمزور پڑنا شروع ہوئے تو چودھویں صدی عیسوی (1301ء کے بعد) میں ہندومت میں بیداری کی لہر بیدار ہوئی اور اس نے اپنے نظریات کو از سر نو تازہ کر کے مسلمانوں کے خلاف کھڑے ہونے کا عزم کیا ہے۔ اس دفعہ ہندومت کا یہ جذبہ جنوبی اور مشرقی ہندوستان میں نمایاں تھا جہاں مرہٹہ قوت نے اس بیداری میں ہراول دستہ کا کام کیا ہے۔

اسی بیداری کے نتیجے میں ہندومت نے مسلمان حکمرانوں سے میل جول پیدا کر کے ان کو اپنی تہذیب کے رنگ میں رنگنے کی کوشش کی ہے اور چانکیہ سیاست کے انداز میں مغل حکمرانوں کو اپنے شیشے میں اتارنے کی سازشیں کی ہیں۔ چنانچہ ایک طرف ہندو مسلم نظریات کا ملغوبہ (سکھ مذہب کا بانی گورونانک) سامنے آیا اور دوسری طرف مغل حکمرانوں میں اکبر کے طویل عہد میں ہندو عورتوں کا عمل دخل حکمران طبقے، بادشاہ، وزراء، رؤساء کے گھروں میں

بڑھ گیا اور وہ ان کے حرم میں داخل ہو گئیں (جیسے آج کل عرب امارات میں عرب شیوخ اور رؤساء کے گھروں میں ہے)۔ اس ہندومت نے مسلم اقتدار کو حکمرانوں کے ذریعے بغیر جنگ کے رام کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں وہ کافی حد تک کامیاب رہے۔ چنانچہ اکبر کے دربار میں ہندو ذہن بڑا مؤثر تھا اور اس کے حرم میں ہندو عورتیں چھائی ہوئی تھیں۔ چنانچہ اس کا جانشین جہانگیر ایک ہندو عورت کے بطن سے پیدا ہوا۔

یہ وقت ہندو کی بیداری کا تھا اور مسلمانوں کا یہ زوال، اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور قرآن سے حد درجہ دوری کا نتیجہ تھا۔ اس زوال کی انتہائی گہری اور تباہ کن صورت یوں پیدا ہوئی کہ اکبر نے 1580ء کے لگ بھگ اسلام کو ترک کر کے ایک نیا دین دین الہی جاری کر دیا اور بے حیائی، بے دینی، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام سے بے اعتنائی اور آزادی و روشن خیالی جیسے نظریات سرکاری سطح پر عام ہونے لگے۔ سارے درباری امراء، وزراء اسی رنگ میں رنگے گئے اور سرکاری دربار تک رسائی کے لیے اسی دین الہی کو قبول کرنا لازم تھا۔

ہندو پس پردہ اپنی اس کامیابی پر بڑا نازاں اور خوش تھا اور اپنے منصوبے کو کامیاب ہوتے دیکھ رہا تھا کہ اس طرح وہ بدھ مت کی طرح اسلام کو ہڑپ کر جائے گا اور اپنے رنگ میں رنگ لے گا۔

ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی ہستی کو پیدا کیا اور کھڑا کر دیا جس نے ہندومت کے ان ناپاک اور ننگ انسانیت منصوبوں کو خاک میں ملا کر انسانیت کو دوبارہ برہمنی سامراج کے چنگل میں جانے سے بچالیا۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت، کردار اور کارنامے

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا دور اکبر کے عروج کا دور ہے۔ اکبر شہنشاہ کہلاتا تھا اور مغل اعظم مشہور تھا۔ اس کی سلطنت کابل سے نیپال اور برما تک محیط تھی۔ اس نے اپنی سلطنت کو عسکری لحاظ سے مستحکم کر کے انتظامی لحاظ سے بھی مضبوط بنایا۔ محاصل کا نظام درست کیا، عدل و انصاف کا اہتمام کیا، علوم فنون کی سرپرستی کی۔

اس سب کے باوجود چونکہ مسلمان ہندوستان میں اقلیت میں تھے لہذا اسے ہندو کی

طرف سے اپنے اقتدار اور سلطنت کے لیے خدشہ رہتا تھا۔ اس نے دارالحکومت میں تمام مذاہب کے علماء کا باقاعدگی سے اجلاس بلا کر مختلف معاملات پر بحثیں کرنے (INTER-FAITH DIALOGUE) کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ جس سے اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ سلطنت کے استحکام کے لئے مذہبی یگانگت اور حکومتی معاملات میں سب کی شرکت (SENSE OF PARTICIPATION) ضروری ہے۔ لہذا اس نے اپنے درباریوں سے مشورہ کیا تو خوشامدی قسم کے درباری علماء نے اسے دلائل بھی فراہم کر دیئے کہ اب ایک نئے دین کی ضرورت ہے چنانچہ اس نے 1581ء میں دین الہی کے نام سے نیا دین جاری کر دیا۔

دین الہی میں ہندومت، جین مت، بدھ مت، پارسی، یہود، عیسائیت، اسلام سب کی تعلیمات کو ملا کر ایک نیا دین بنا دیا۔ تاکہ سب کو یہ دین اپنا دین محسوس ہو۔ اس دین میں اکبر کو نبی سے بھی بڑھا کر خدا کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ اور سرکاری کاموں اور دربار تک رسائی کے لئے اس دین کو اختیار کرنا ضروری تھا۔ لوگ آپس میں ملتے تو السلام علیکم کی بجائے اللہ اکبر اور جل جلالہ کے الفاظ کہتے جس سے ذہن اکبر بادشاہ کی طرف ہی منتقل ہوتا۔

اس مذہب کے فروغ میں بے حیائی کے ساتھ آزادی کو بھی بہت دخل تھا چنانچہ اسلام کی تعلیمات کا علی الاعلان مذاق اڑایا جانے لگا اور لوگ دین اسلام سے برگشتہ ہونا شروع ہو گئے اور خدشہ تھا کہ اگر یہ صورت حال جاری رہی تو ہندوستان سے دین اسلام کا خاتمہ ہو جائے گا اور یہ سارا منصوبہ دراصل ہندو ذہن کی پیداوار تھا جس نے اسلام کی بیخ کنی کے لئے اکبر کو اس پر آمادہ کر لیا۔ اکبر اسلام سے روگردانی کر کے ”مرتد“ ہو گیا اور اسلام کے مقابلے میں دین الہی کھڑا کر دیا۔

اس پس منظر میں دین کے دردمند علماء، صلحاء اور صوفیاء میں بے چینی پائی جاتی تھی اور ہر آدمی ایک دوسرے کی طرف دیکھتا تھا کہ وہ پہل کرے اس لئے کہ حکومت کا دباؤ بہت شدید اور مصائب اور سختیاں ناقابل برداشت تھیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان حالات میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کو اس کام کے لئے کھڑا کیا اور انہوں نے مردانہ وار اس فتنہ الکبریٰ کا مقابلہ کیا۔ بعد میں اور بھی کئی لوگ ان کے حمایتی ہو گئے

تاہم دین الہی کے خلاف مزاحمت کا سارا CREDIT حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کو ہی جاتا ہے آپ کے مرشد خواجہ باقی باللہ نے ان حالات کے لئے خاص آپ پر توجہ فرمائی تھی اور تربیت کی تھی۔ اور اکبر کا مقابلہ کرنے کے لئے آپ کو اپنے مرشد کی بھرپور تائید و حمایت حاصل تھی۔ خواجہ باقی باللہ کا انتقال 1603ء میں ہوا اور اکبر 1605ء میں مر گیا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا جہانگیر تخت نشین ہوا۔ جہانگیر کے دور میں بھی آپ پر آغاز میں بہت مصیبتیں آن پڑیں سب امراء، رؤساء آپ کے مخالف تھے۔ جہانگیر نے آپ کو پہلے قید کر دیا مگر بعد میں جہانگیر کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس نے شیخ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کو رہا کر دیا اور عزت کی۔ قید کی حالت میں بھی سفر و حضر میں اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ تاکہ حضرت مجدد کا رابطہ عوام اور خواص سے کسی صورت نہ ہو سکے تاہم آپ نے عوام سے رابطہ بڑھانے اور اصلاح کی سعی کی خواص امراء اور رؤساء کے علاوہ علماء صوفیاء کی اصلاح پر توجہ دی امراء و رؤساء کے نام ان کے 200 اصلاحی خطوط آپ کی تعلیمات کا خلاصہ ہیں اور مکتوبات کے نام مشہور ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی کوششوں سے جہانگیر کے خیالات میں بھی تبدیلی آئی اور اس نے اکبر کے جاری کردہ دین الہی کو منسوخ کر دیا اور اسلامی شریعت کے مطابق عدل و انصاف کی کوشش کی حضرت مجدد ہی کے اثرات کی وجہ سے شاہی خاندان میں اسلام سے وابستگی لوٹ آئی اور جہانگیر سے بہتر شاہجہان اور اس سے بہتر اورنگ عالمگیر جیسا حکمران نصف صدی کے اندر ہندوستان کو میسر آ گیا۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے گونا گوں خوبیوں سے نوازا تھا آپ علوم عقلیہ اور نقلیہ میں درجہ کمال پر فائز تھے۔ آپ کی روحانی فضیلت مسلمہ ہے۔ اس کے علاوہ آپ ایک صاحب طرز ادیب اور منفرد انشاء پرداز بھی تھے۔ آپ نے اپنے عہد کے مطابق متعدد رسالے لکھے اور کتابیں تالیف فرمائیں۔ ان میں سے رسالہ اثبات النبوة، رسالہ تہلیلیہ، رسالہ ردّ روافض اور معارف الدینیہ زیادہ مشہور ہیں۔

آپ کا اصل کارنامہ دین اسلام کا دفاع ہے اور عام بے دینی کے ماحول میں

ایمان باللہ، ایمان بالآخرہ اور ایمان بالرسالت کا اثبات اور اس کی اہمیت کو واضح کرنا تھا۔ آپ نے سنت رسول ﷺ پر بہت زیادہ زور دیا سلسلہ نقشبندیہ کو آپ کے عہد میں بہت زیادہ ترقی ہوئی اور یہ ہندوستان سے افغانستان اور روسی علاقہ جات کے علاوہ ترکی تک جا پہنچا۔ آپ نے علماء و صوفیاء کی بدعات و اختراعات کو بھی نشانہ تنقید بنایا اور ان کی اصلاح فرمائی تصوف کو شریعت کا پابند بنانے کے لئے آپ نے کوشش فرمائی، تصوف میں ریاضتوں کو کم کر کے آسانیاں پیدا فرمائیں۔ آپ کی مساعی جمیلہ کے نتیجے میں اکبر کے باطل دین کا قلع قمع ہو گیا اور اس کے اثرات بھی ایک نسل کے اندر اندر مٹ گئے بلکہ آئندہ آنے والے حکمرانوں کے لیے بھی ایسی کسی مذموم حرکت کا دروازہ بند ہو گیا اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہندومت کی بیداری کی وجہ سے ہندوؤں کے اس خطرناک منصوبے (یعنی مسلمانوں کے ہاتھوں ہی اسلام کو ختم کرنا اور نیا دین جاری کروانا) کو خاک میں ملا دیا گیا۔ بقول اقبال

حاضر ہوا میں شیخِ مجدد کی لحد پر
 وہ حنا کہ ہے زیرِ فلکِ مطلعِ انوار
 اس خاک کے ذروں سے ہیں شرمندہ ستارے
 اس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صاحبِ اسرار
 گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
 جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیِ احرار
 وہ ہند میں سرمایہٴ ملت کا نگہباں
 اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار



ہے وہی تیرے زمانے کا امامِ برحق
 جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
 دکھائے تجھے موت کے آئینے میں رنخ دوست
 زندگی اور بھی تیرے لیے دشوار کرے

علامہ اقبال

10

علامہ حضرت

شیخ عبدالحق

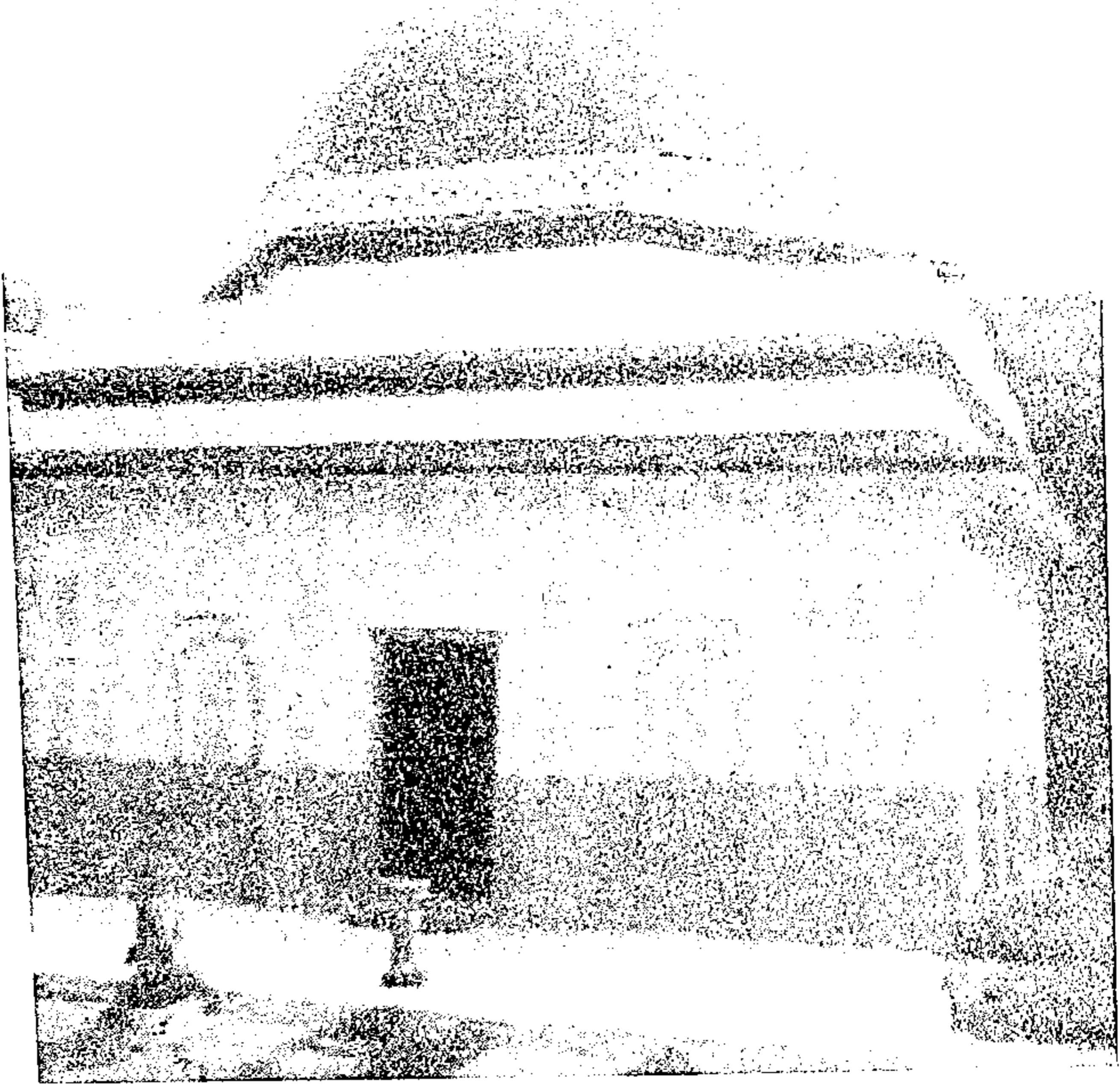
محدث دہلوی

رحمۃ اللہ علیہ

ولادت: 956ھ/1551ء، دہلی

○ 996ھ میں حرمین تشریف لے گئے

وفات: 1052ھ/1642ء، مہرولی، دہلی



آخری آرام گاہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، دہلی

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ 1551ء بمطابق 956ھ کو دہلی کے ایک معزز بزرگ اور صاحب علم شخص سیف الدین صاحب کے ہاں پیدا ہوئے، آپ کے والد نے اپنے ذوق کے مطابق آپ کی تربیت بھی انہیں بنیادوں پر کی۔ آپ علم کے بہت شائق تھے۔ آپ 996ھ میں حرمین تشریف لے گئے اور تحصیل علم کی تکمیل کی۔ تین چار سال کے قیام کے دوران آپ نے فن حدیث میں سند کا درجہ حاصل کیا اور تصانیف تحریر کیں۔ آپ کا وصال 1642ء بمطابق 1052ھ میں ہوا۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے زیادہ تر علمی کام کیا ہے اور علمی جہاد میں حصہ لیا ہے، آپ نے طویل زندگی پائی، سرزمین ہند میں علوم دینیہ یعنی قرآن و حدیث کی تعلیم میں حدیث کی باقاعدہ تعلیم و تدریس کا پودا آپ نے ہی لگایا اور نصف صدی تک اسے سیراب بھی کیا جس سے اس صنم خانہ ہند میں باصلاحیت لوگوں میں قرآن و حدیث کے علوم کی طرف دلچسپی پیدا ہوئی۔ آپ کے ہزاروں شاگردوں نے بعد میں اس جذبہ کو پروان چڑھایا اور دینی علوم کی مستقل بنیادوں پر تعلیم و تدریس کا آغاز کیا۔

آپ نے مغلیہ خاندان میں اکبر بادشاہ، جہانگیر بادشاہ اور شاہ جہان بادشاہ کا زمانہ پایا۔ آپ کا اور شیخ مجدد حضرت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کا زمانہ ایک ہی ہے بلکہ وہ آپ کے 13 سال بعد 1564ء میں پیدا ہوئے اور 1624ء میں وفات پا گئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو زیادہ کام کرنے کا موقع عطا فرمایا۔

دونوں شخصیات کے مزاج اور ذوق میں فرق ہے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے وقت کے مطلق العنان حکمران کے سامنے آکر مقابلے کیا جبکہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے

پس منظر میں رہ کر یہ کام کیا۔ شیخ مجدد نے مجاہدانہ انداز اختیار کیا اور جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنے والا جہاد کیا تو شیخ محدث نے شاگردوں کی ایک ایسی کھیپ تیار کر دی کہ وہ اسی مجاہدانہ جذبے سے سرشار تھی۔ شیخ مجدد نے وقت کے فرعون کو سامنے آ کر چیلنج کیا تو شیخ محدث نے عوامی رائے کو بیدار کر کے حکمران وقت کے خلاف اٹھایا۔ شیخ مجدد نے الحاد اور روشن خیالی کے سیلاب کے آگے بند باندھ دیا تو شیخ محدث نے آئندہ آنے والی نسلوں میں بھی ایسی گمراہی کے خلاف شعور پیدا کرنے کا منصوبہ شروع کیا۔ شیخ مجدد نے اُمت مسلمہ کو روشن خیالی، اباحت پرستی اور لادینیت کی حادثاتی موت سے بچایا تو شیخ محدث نے جان بلب اُمت کو توانا کرنے کی دوا کی۔ شیخ مجدد نے دو حکمرانوں کو خلاف اسلام کاموں پر لگام دی تو شیخ محدث نے لگاتار دو مسلمان نسلوں میں دینی علم کی مہمیز لگادی۔ شیخ مجدد نے حکمرانوں اور مقتدر طبقات میں دین اسلام کی تبلیغ کی تو شیخ محدث نے علماء حق کا طبقہ پیدا کر کے عوامی سطح پر اسلام کی حفاظت کی۔ شیخ مجدد نے احیائے سنت کا کام کیا تو شیخ محدث نے احیائے علم حدیث کا کام کیا، شیخ مجدد نے روحانی طاقت سے الحاد کا راستہ روکا تو شیخ محدث نے علمی سطح پر اس وار کو ناکارہ بنا دیا۔ شیخ مجدد، اللہ تعالیٰ کی شانِ رحمن کے مظہر تھے تو شیخ محدث اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحیم کا مصداق۔ الغرض شیخ مجدد، اللہ تعالیٰ کی جلالی شان کا پر تو تھے اور شیخ محدث، اللہ تعالیٰ کی صفتِ جمال کا مظہر۔ دین اسلام کی خدمت کے دورِ رخ تھے اور دونوں محاذوں پر کام وقت کی ضرورت تھی اور اسلام کی خدمت بھی مع ہر کسے را بہر کارے ساختند شیخ محدث رحمۃ اللہ علیہ نے سرزمین ہند میں علم حدیث کی ابتداء کی اور یوں دین کے علمی سرچشموں سے مسلمانان ہند کو روشناس کرایا۔

گزشتہ صفحات میں شیخ مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں یہ بات واضح ہو چکی ہے۔ کہ ہندومت 1000ء سے لے کر 1350ء تک اپنے فکری، نظریاتی اور سیاسی زوال کا شکار رہا۔ مسلمان فاتحین آئے اور پہلے تو انہوں نے سیاسی طور پر ہندوؤں کو شکست سے دوچار کیا۔ اس وجہ سے کہ ہندوستان بھر کے راجے مہاراجے ایسے اخلاقی زوال میں غرق تھے کہ جس سے انسانیت شرمسار تھی۔ بعد ازاں علمی اور روحانی سطح پر مسلمان صوفیاء نے آ کر کام کیا تو مقامی ہندو دھرم میں مقابلے کی سکت نہیں تھی سیاسی طور پر پہلے شکست خوردہ تھے علمی اور مذہبی طور پر مسلمان صوفیاء کے

آگے ڈھیر ہوتے چلے گئے ہندو مذہب کے اکابرین نے پس منظر میں جا کر جان بچائی۔

1206ء میں ہندوستان میں پہلی باقاعدہ علیحدہ مسلمان حکومت کا قیام ہے جس کے بعد اس کا ایک تسلسل ہے اس دوران صوفیائے کرام نے اسلام کی پاکیزہ سادہ فطری اور دلآویز تعلیمات کا ایسا پرچار کیا کہ صنم خانہ میں اسلام کی آغوش میں آنے والے ”يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا“ کا نقشہ پیش کر رہے تھے۔

ہندومت کے رہنماؤں اور اکابرین نے اس وقت اسلام کی سیاسی و عسکری اور علمی و روحانی قوت کا مقابلہ کرنے کے لیے دونوں میدانوں میں کام کرنے کا منصوبہ بنایا۔ سیاسی و عسکری میدان میں ہندومت نے میدان جنگ میں مقابلے کے بجائے خالص ہندو روایات کے مطابق (جس سے مسلمان پوری طرح واقف نہیں تھے) اور چانکیہ سیاست کی عین مطابق دوستی کے روپ میں دشمنی یعنی بظاہر دوستی اور درحقیقت انتقام کی روش اپنائی۔ مسلمان حکمرانوں کے قریب ہوئے اور خوشامد، چاپلوسی اور اپنی دفا داری کے اظہار کے روپ میں حکمرانوں تک رسائی حاصل کی۔ ہندو نے اس سلسلے میں عورت کے ذریعے انسانی کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور ہندو عورتوں نے مسلمان حکمرانوں رئیسوں اور فوجی اعلیٰ عہدیداروں کے گھروں تک رسائی حاصل کر لی۔

بابر نے 1528ء پانی پت کی تیسری لڑائی میں فتح پائی اور اس نے عظیم مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی اس سے پہلے حکمران خاندان 50، 60 سال کے عرصے میں تبدیل ہو رہے تھے، بابر نے ایک مستحکم حکومت کے ذریعے پورے ہندوستان کا انتظام سنبھالا۔ وقتی طور پر ہندو ذہن کو اس سے ایک دھچکا سا لگا۔ تاہم ایک ہی خاندان کی حکومت کا مطلب صرف ایک خاندان کو قابو کرنے اور قابو میں رکھنے سے پورے ہند کی تقدیر کو مٹھی میں کیا جاسکتا تھا۔ اسی اصول کے تحت بابر کے بعد ہمایوں آیا اور ہمایوں بے دخل ہو کر ایران چلا گیا وہاں سے چند سال بعد لوٹا اور اس نے پانی پت کی دوسری لڑائی میں فتح حاصل کر لی اور سلطنت مغلیہ بحال ہو گئی۔ 1556ء میں ہمایوں کی وفات پر اکبر نے نوعمری (بلکہ بچپن) میں ہی تخت نشینی اختیار کی۔ حالات کا گہرا مطالعہ کریں تو صاف نظر آتا ہے کہ ہمایوں کی شکست سے پہلے ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت تھی اور ہندو مغلوبیت کی وجہ سے دبے ہوئے تھے اسلام نے تاریخ میں کبھی لوگوں کو ذاتی سطح پر مسلمان بنانے کے لئے جبر

سے کام نہیں لیا ورنہ کم از کم ہندوستان میں 1000ء سے لے کر 1600ء تک سارے ہند کی انسانی آبادی مسلمان ہو چکی ہوتی۔ اس کے برعکس صورت حال یہ تھی کہ مسلمانوں کی 1000 سالہ حکمرانی کے دور کے باوجود 1947ء تک مسلمان کی آبادی %25 سے زیادہ نہیں تھی۔

ہمایوں کی ہندوستان میں ایک ”وفادار“ فوج کے ساتھ دوبارہ آمد اور فتح پانے کے بعد سلطنت مغلیہ کے احیاء اور استحکام کے کام سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب ہندوستان سے باہر کی کچھ قومیں بھی اسلام کے خلاف اور ہندو کی حمایت میں ریاستی رسہ کشی میں شامل ہو چکی تھیں۔

اکبر کا عہد آیا اور 1580ء سے لے کر 1605ء تک اس کا دور عروج ہے اس میں ہندو ’عورت‘ نہ صرف محلات میں خادماؤں کی حیثیت سے داخل تھی بلکہ ’حرم‘ میں شامل ہو چکی تھی چنانچہ اکبر، اس کے وزراء، رؤساء اور امراء سب کے ہاں ہندو عورتوں سے شادی کا رواج تھا خود اکبر کے ہاں ہندو عورتیں تھیں اور شہزادہ سلیم جو بعد میں ’جہانگیر‘ بنا ایک ہندو عورت کے بطن سے تھا اس ’جنسی حملہ‘ ہی کا زہریلا وار تھا کہ حکمران خاندان کی ’قلب ماہیت‘ ہو گئی۔

دوسری طرف علمی و روحانی میدان میں مقابلہ کے لئے ہندومت نے اسلام کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک اور منصوبہ بنایا اور نامعلوم ایسی کتنی کوششیں کی ہوں گی مگر جو کوشش اس دور میں سب سے زیادہ کامیاب رہی اور جس نے بعد میں ہندو کی مسلمان دشمنی کے ضمن میں بڑے دور رس نتائج بھی پیدا کیے ایک ایسے مذہب کا اجرا تھا جس میں کچھ تعلیمات ہندو مذہب کی ہوں اور کچھ شعائر اسلام سے لئے جائیں بظاہر شکل و صورت میں مسلمان سے مشابہت اختیار کی جائے جبکہ اس قوت کا سارا کنٹرول ہندو کے پاس رہے۔

اس میدان میں پہلی کامیاب کوشش یہ تھی کہ پنجاب سے ایک ہونہار نو جوان کو پہلے مسلمان بنایا گیا پھر اس کو تعلیم دلا کر مختلف اسفار پر روانہ کیا، مشرق میں آسام، بنگال، جنوبی ہندوستان، شمال میں تبت لداخ اور مغرب میں بغداد اور مکہ تک کے اسفار ظاہر کرتے ہیں کہ بظاہر وہ حقیقت کی تلاش میں تھا۔ مکہ تک رسائی کے لئے اس کا مسلمان ہونا یا کم از کم مسلمانوں کا روپ دھارنا ضروری تھا یہ ایک گہری سازش تھی واپس آ کر اس شخص نے یہ ظاہر کیا وہ بہت سے مذاہب (بشمول اسلام) کا مطالعہ کر کے ان کے حالات دیکھ آیا ہے اور اسے جو حقیقت ملی ہے وہ

یہ نیا 'سکھ مذہب' ہے یہ دراصل ہندو ذہن کی پیداوار اسلام کے مقابلے میں نیا مذہب تھا۔
 [سکھ مذہب کی اسلام دشمنی کی ایک دلیل یہ تھی کہ وہ مغلیہ سلطنت کے مسلمان حکمرانوں سے ہمیشہ
 دست گریباں رہے دوسرے سکھ دور حکومت میں مسلمانان پنجاب پر جو ظلم ہوئے وہ ظلم و ستم کی
 منفرد داستان ہیں پورے سکھ (70 سالہ) دور حکومت میں مسلمانوں کی عبادت گاہوں پر تالے
 تھے اذان اور نماز پر پابندی تھی۔ قرآن مجید لے کر باہر نہیں نکلا جاسکتا تھا۔ اسلامی شعائر پر بھی
 پابندی تھی شاہی مسجد لاہور رنجیت سنگھ کے دور حکومت میں گھوڑوں کا اصطبل تھا۔ 1937ء سے
 پہلے کی شاہی مسجد کی تصویر شاہی مسجد کے داخلی دروازے کے قریب آویزاں ہے پھر قیام
 پاکستان کے موقع ہندو کی شہ پر دہلی سے پاکستان آنے والے مہاجرین کا قتل عام اس سکھ دھرم کی
 ذہنیت اور سوچ کو ظاہر کرتا ہے جو ان کے دلوں میں مسلمان کے خلاف پوشیدہ ہے]

جناب گرو نانک کا زمانہ 1469ء - 1539ء ہے۔ اس میدان میں ہندومت کی
 کوشش کے باوجود کوئی مسلمان اس دام ہم رنگ زمین میں گرفتار نہیں ہوا شاید یہ ہوا ہو کہ ہندومت
 کے اندر اسلام سے قدرے متاثر طبقہ کے کچھ لوگ مسلمان ہونے کے بجائے سکھ مذہب کی طرف
 چلے گئے ہوں۔

یہ کوشش توقع سے بہت کم فائدہ مند ثابت ہوئی اس وجہ سے ہندو ذہن نے دوسرے
 محاذ میں سیاسی و عسکری سطح پر اپنے کام پر سارا زور لگا کر اپنے مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کی ہے
 اکبر نے اسلام سے منہ موڑ کر ہندومت عیسائیت یہودیت اسلام اور دیگر مذاہب کے
 کچھ شعائر لے کر ایک نیا دین 'دین الہی' جاری کر دیا اور اپنے آزاد خیال (LIBERAL) اور
 روشن خیال ہونے کا ڈھنڈورا پیٹا۔ جنسی آزادی (یا آوارگی) کی اجازت دی اور اس طرح اپنی
 سلطنت کے استحکام کا خواب دیکھا۔

تذیر کند بندہ تقدیر کند خندہ۔۔۔ اللہ تعالیٰ نے اکبر کے اس منصوبے کو شیخ
 مجدد رحمۃ اللہ علیہ اور اس کے بعد شیخ محدث رحمۃ اللہ علیہ کے ذریعے خاک میں ملا دیا۔

شیخ مجدد کی انقلابی اور حکمرانوں کے رُودر رُو تو حید کی دعوت اور 'دین الہی' کے ابطال
 کی گفتگو سے اکبر کی وفات 1605ء کے بعد جہانگیر کے دور حکومت میں ہی اسلام کا پلڑا بھاری

ہونا شروع ہو گیا اور جہانگیر نے شراب وغیرہ جیسی فبیح عادات ترک کر دیں، دین الہی کا سارا پرچار ختم ہو گیا اور یوں ہندو ذہن کے حکمرانوں پر عورت کے ذریعے کنٹرول حاصل کر کے اپنے مقاصد حاصل کرنے کا منصوبہ خاک میں مل گیا۔ یہ شیخ مجددی کی مساعی اور ان کی وفات کے بعد شیخ محدث کی تعلیمات اور اشاعت حدیث کے اثرات تھے کہ اب گلی گلی، قریہ قریہ، شہر شہر قرآن و حدیث کا تذکرہ تھا اور اسلام کی تعلیمات کی تبلیغ و اشاعت کا سلسلہ بہت وسیع ہو گیا تھا۔

چنانچہ شیخ محدث کی تعلیمی خدمات اور نصف صدی کی مسلسل محنت شاقہ کا حاصل تھا کہ جہانگیر کے بعد شاہ جہان جیسا حکمران آ گیا۔ اور شاہ جہان کے بعد اس کا بیٹا اورنگ زیب 1657ء میں برسر اقتدار آ گیا۔

یہ اسلامی تعلیمات کا اثر تھا اور ہندومت کے درپردہ اسلام دشمنی کے جذبات کا کہ شاہ جہان کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ایک ایسا کام کرا دیا جو آج تک ہندومت کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے۔

اکبر کی وفات سے شاہ جہان تک نصف صدی میں اکبر کے دین الہی سے اسلام کی طرف واپسی کے نتیجے میں حکمران طبقے اور عوام کے بود باش اور طور طریقوں میں انقلاب آ گیا۔ شاہ جہان کوئی زیادہ مذہبی حکمران نہیں تھا تاہم شیخ محدث کی محنت اور ان کی تعلیمات کا یہ اثر تھا کہ کہاں اکبر کے حرم میں سینکڑوں عورتیں اور وہ مذہب کی قید سے آزاد اور کہاں شہنشاہ ہند شاہ جہان کی صرف ایک منکوحہ بیوی۔ زمین آسمان کا فرق ہے۔ اسی ایک بیوی کے بطن سے اس کے چودہ بچے ہوئے۔ عفت و عصمت کی یہی داستان ہے کہ اس بیوی کی زچگی کے دوران وفات پر پورے ہند کے بادشاہ شاہ جہان کو دلی صدمہ ہوا جو ایمان کے اعتبار سے فطری بھی تھا۔ اس نے اپنی متوفیہ بیگم کی یاد میں ممتاز محل کی یادگار تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ ایک شاہی فیصلہ تھا دینی اعتبار سے اس کی حمایت نہیں کی جاسکتی تاہم قدرت نے اس تعمیراتی شاہکار کے ذریعے ہندومت کے چہرے پر ایک زوردار طمانچہ مارا جس کے اثرات وہ آج بھی محسوس کرتے ہیں اور شاہ جہان کو برا بھلا کہتے ہیں اور بعض نادان مسلمان بھی اس ہندو سوچ میں شامل ہو جاتے ہیں۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ 500ء سے لے کر 1000ء تک ہندوستان میں ہندومت

کے عروج کا دور ہے اور دنیاوی آسودگی اور دولت کی ریل پیل کا بھی۔ اس دور میں ہندو ثقافت اور ان کی مذہبی اقدار کا آرٹ اور فن سنگ تراشی کے شہ پاروں میں ظہور ہے اور وہ ظہور یہ ہے کہ وسطی ہندوستان، سومنات، راجپوتانہ سے لے کر پورا مشرقی بھارت اور اس کے باہر مشرق بعید تک کی مذہبی عبادت گاہوں کی تعمیرات کا زمانہ یہی ہے اور ان مذہبی عمارات میں جہاں صاف ظاہر ہے بچے، بوڑھے، جوان، عورتیں، مرد سب آتے ہیں اور عبادت کا ماحول ہوتا ہے اور مذہب کا لحاظ بھی۔ تاہم عام آدمی سوچ بھی نہیں سکتا کہ ہندو ذہن نے اس دور کے اپنے مندروں کی تعمیر میں اپنے سینے اور ذہن میں پوشیدہ، بے شرمی اور بے حیائی کے جذبات کے اظہار کی انتہا کر دی اور مذہبی عمارات میں سنگ تراشی کے ذریعے بے حیائی کے ایسے مجسمے تیار کر دیے کہ کوئی باضمیر اور شریف النفس انسان اس کو دیکھنا بھی گوارا نہ کرے کجا یہ کہ بچیاں عورتیں اور پورا خاندان دیکھے۔ (مغرب آج بے حیائی کر رہا ہے تو اسے کم از کم مذہب کا نام نہیں دے رہا جبکہ ہندوؤں کے ہاں یہ بے حیائی مذہب کا حصہ اور روحانی درجات کا ذریعہ ہے۔ اسی لئے آج کا مغرب ہندو اور ہندوستان کا ”بے دام مرید“ اور پرستار ہے۔)

یہ زمانہ حضرت شیخ محدث رحمۃ اللہ علیہ کا ہے اور انہیں کی بے لوث تعلیمات کا اثر تھا جو پورے ہندوستان میں عوام پر بھی تھا اور خواص پر بھی اور عمائدین سلطنت پر بھی حتیٰ کہ بادشاہ وقت کی سوچ پر بھی۔

اسلام کی ثقافت جو اسلام کی عقائد اور تعلیمات کے نتیجے میں تیار ہوئی ہے اور آرٹ، فن سنگ تراشی اور خطاطی میں ظاہر ہوتی ہے۔ ممتاز محل کا یہ مقبرہ ایک بادشاہ کا اپنی ایک محبوبہ بیوی کی یاد میں محبت کی نشانی کے طور پر تعمیر ہوا ہے۔ دنیاوی اعتبار سے اس میں یونان کے فنواروں، یورپ کے سنگ تراشی کے شہ پاروں اور ہندوستان کے ننگ شرم و حیا، مذہبی عمارات کی طرح بھی ہوتا تو بھی کہا جاسکتا تھا کہ یہ تو ہے ہی ”محبت“ کی نشانی۔ ہندو مذہب اور ثقافت اور مسلم عقائد اور سوچ کا فرق راجپوتانہ اور قنوج کے ان مندروں کے مقابلے میں مسجد کے پاکیزہ اور چاندنی کی طرح خشک ماحول سے واضح ہے ہی مسلمانوں کا کعبہ اور اس کا اندرون بھی اسی طرح پاکیزہ اور روح پرور ہے بلکہ مسلمان کے ضمیر کی طرح صاف اور ہر طرح کی کثافت سے مُبرا۔ حتیٰ کہ مسلمان

کی محبت کی یہ نشانی بھی پاکیزہ ملکوتی جذبات کی عکاس ہے قارئین حیران ہونگے اس تعمیراتی عجوبہ میں سفید پتھر پر قرآنی آیات کُندہ ہیں، پھول ہیں، محرابیں ہیں، فوارے ہیں، بہتا پانی ہے۔ تاج محل کے ایک طرف مہمانوں کے لئے مسجد بنائی گئی ہے تو دوسری طرف توازن (SYMMETRY) کے لئے اسی شکل کا مہمان خانہ بنایا گیا ہے شاہ جہان اور اس کی بیوی کی دیواری تصویر ہے جو بازار میں بھی مطبوعہ ملتی ہیں بس۔۔۔ یہ تعمیراتی شاہکار ہندومت کی سفلی تعلیمات اور ذہنیت کے لئے طمانچہ اور اتمام حجت کا درجہ رکھتا ہے۔ ہندوستان کے نقشے پر آگرہ پر پرکار کی نوک رکھ کر 800KM نصف قطر کا دائرہ لگائیں تو وہ سارے مقامات اس کے اندر آجائیں گے جس میں سب سے زیادہ ہندو مذہبیت اور ثقافت کے بے حیائی کے مجسمے ہیں جسے دیکھ کر انسانیت کا سر شرم سے جھک جاتا ہے اور اس کے درمیان میں محبت کی یہ یادگار بھی ہے جو پاکیزہ انسانی جذبہ کی آئینہ دار ہے۔ سچ ہے ع فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

اس عجوبہ روزگار کی تعمیر جس سال مکمل ہوئی وہ شیخ محدث رحمہ اللہ کی وفات کا سال ہے۔ شیخ محدث رحمہ اللہ کی علمی خدمات میں ”اشعث اللمعات“ جو مشکوٰۃ شریف کی شرح ہے، بہت اہم تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ ”تاریخ مدینہ“ اور ”مدارج النبوة“ بھی ہیں لیکن آپ کی معرکہ آرا تصنیف ”اخبار الاخیار“ ہے جس میں آپ نے ہندوستان کے اولیاء اور بزرگوں کے حالات لکھے ہیں جہاں گنیر بادشاہ نے اس کتاب کی بہت تعریف کی تھی۔





صاحب ملک عظیم، درویش بادشاہ

حضرت محی الدین

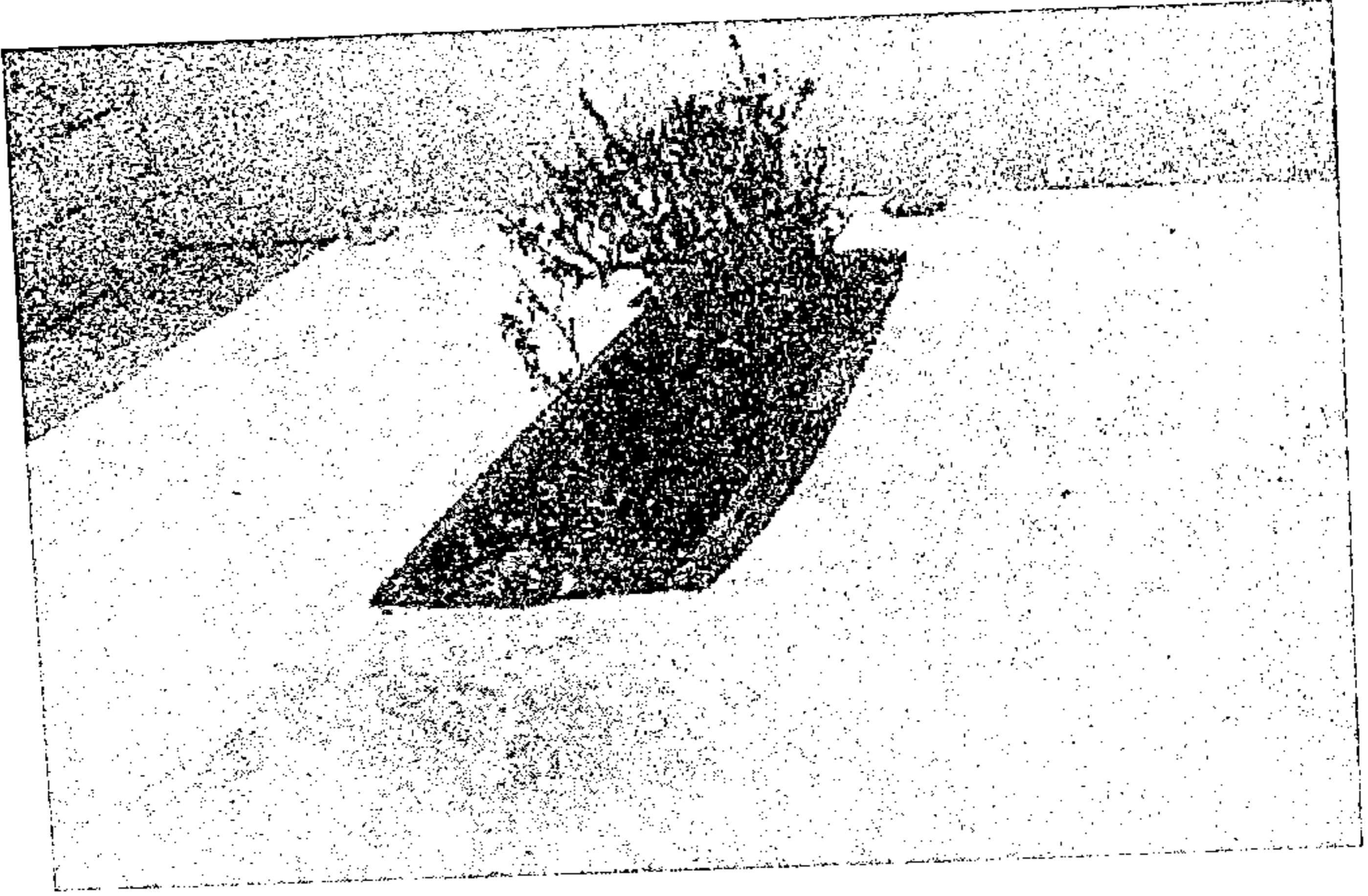
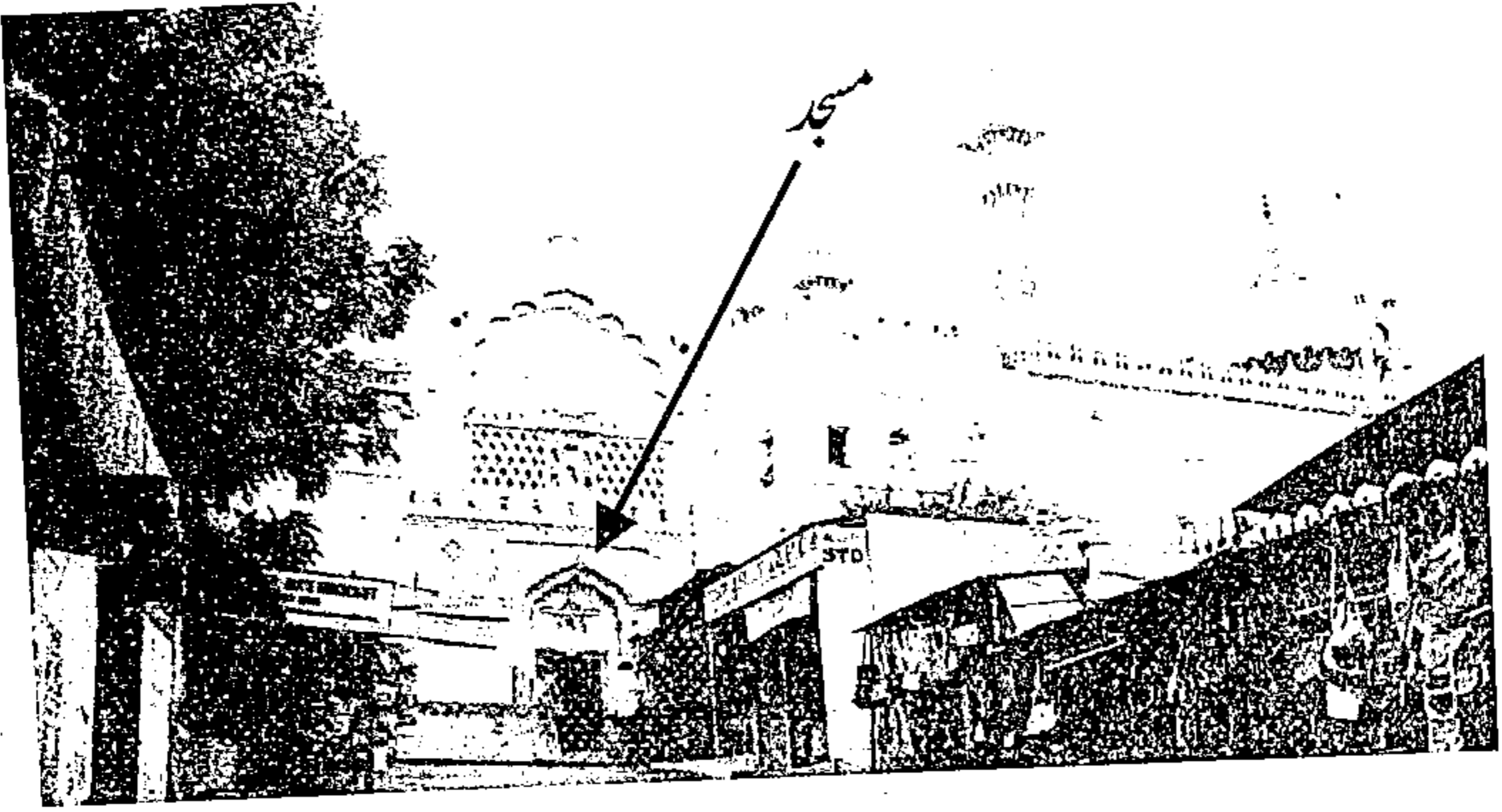
اورنگ زیب عالمگیر

رحمۃ اللہ علیہ

ولادت: 1027ھ / 1618ء (گجرات، بھارت)

1657ء میں سلطنت مغلیہ کے تخت پر جانشین ہوئے

وفات: 1118ھ / 1707ء



آخری آرامگاہ: اورنگزیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے!
سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے!

حضرت محی الدین اورنگ زیب 3 نومبر 1618ء کو شاہ جہاں کے ہاں ملکہ ممتاز محل کے بطن سے گجرات میں پیدا ہوئے۔ 1657ء سے 1707ء تک کابل سے لے کر آسام تک حکومت کی اور 3 مارچ 1707ء کو نصف صدی تک 'درویشانہ بادشاہت' کا تحفہ دے کر دنیا سے رخصت ہوئے۔ اتنی وسیع سلطنت اور اس کے انتظامی، سیاسی اور فوجی امور کی نگہداشت کے باوجود اس مرد جلیل نے ٹوپیاں سی کر اور قرآن مجید کی کتابت کر کے معمولی آمدنی سے ذاتی اخراجات چلائے ہیں کہ تاریخ انسانی میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

سترہویں صدی عیسوی میں عالمی حالات و واقعات کا بہاؤ کس رخ پر تھا؟ اس کا مختصر تذکرہ شیخ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات و واقعات میں گزر چکا ہے تاہم چند پہلوؤں پر دوبارہ روشنی ڈالنا ضروری ہے۔

دین و مذہب کی تاریخ پر جن لوگوں کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ تاریخ بنیادی طور پر 'خیر' اور 'شر' کے درمیان کشمکش اور تصادم کا ہی دوسرا نام ہے کبھی یہ کشمکش دھیمے انداز میں رہی ہے جسے آج کل COLD WAR کہتے ہیں اور گا ہے گا ہے یہ کشمکش تصادم کی شکل اختیار کر لیتی رہی ہے جس سے جنگ کی صورت حال پیدا ہو جاتی رہی ہے۔

پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد 'خیر' و 'شر' کی کشمکش کے دو فریق بالکل واضح ہو کر سامنے آ گئے ہیں اور گزشتہ چودہ صدیوں کی تاریخ دراصل بنی اسرائیل اور مسلمان یا یہودیت اور اسلام یا بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل کی جنگ کا نام ہے۔

یہودیت نے کبھی سامنے آ کر جنگ نہیں بلکہ ہمیشہ دوسروں کو ابھار کر اسلام کے مد مقابل کھڑا کر کے اپنا اٹو سیدھا کرنے کی کوششیں جاری رکھی ہیں۔ خلافت راشدہ کے

دوران میں جب اسلام کو سیاسی استحکام ملا اور فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا تو اسلام کی تعلیمات اور سیاسی غلبے اور دراصل 'فلاحی ریاست' کا تصور ساری دنیا میں پھیل گیا تاہم یہودی مسلمانوں سے پہلے ہی 70ء میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بزعم خویش سولی کے تختے تک پہنچانے کے جرم کی وجہ سے ٹائٹس رومی فاتح کے ہاتھوں زلت اٹھا کر فلسطین سے در بدر ہو چکے تھے اور دنیا کے تمام معروف سیاسی، علمی اور تہذیبی مراکز میں قدم جمانے میں کامیاب ہو چکے تھے اصفہان، جنوبی ہندوستان، روس، عراق، ترکی، مشرقی و مغربی یورپ، شمالی افریقہ، حجاز وغیرہ میں یہودی آبادیاں (SETTLEMENTS) دوسری اور تیسری صدی عیسوی کی ہیں گویا 'خیر' کی توسیع و اشاعت سے پہلے 'شر' متوقع مقابلے کے لئے پوزیشن سنبھال چکا تھا۔

اسلام کے مد مقابل اس طبقے یا بالفاظ دیگر آسمانی وحی سے بیزار اور اس کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے درپے اس طبقے نے کئی طرح سے اسلام کو گھیرا ڈالنے کے جتن کیے ہیں جن کا ذکر گزشتہ صفحات میں آچکا ہے۔ 1000ھ کے قریب دوسری ہزاری کے آغاز پر اس طبقے میں دوبارہ ایک جوش پیدا ہوا ہے اور آسمانی ہدایت کی مخالفت میں سرگرمیاں عروج پر پہنچ گئی ہیں۔

جنوبی ایشیا میں 800ء سے لے کر 1400ء تک ہندوؤں نے اسلام کا سیلاب روکنے کے لئے کئی ہتھکنڈے استعمال کیے ہیں جن میں سکھ مذہب کا کھڑا کر دینا اس کا نقطہ عروج تھا تاہم اس کے پیچھے ہندو ذہن کا ایک فلسفہ تھا کہ مسلمان کو کسی طرح مقامی مذہب میں مدغم کر دیا جائے؛ لہذا بھگتی تحریک (BHAKTI MOVEMENT) کا آغاز ہوا اس کے پرچاروں نے ایسے خیالات کا پرچار کیا کہ آسمانی مذاہب سب ایک ہیں ان کا منبع ایک ہے اور تعلیمات بھی ایک ہیں لہذا کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کوئی رحمن کہہ کر اللہ کو پکارے یا رحیم کہہ کر، پر ماتما کہہ کر یا بھگوان کہہ کر یا یزدان کہہ کر مخاطب کرے یا ایشور کے نام سے ہم کلام ہو۔ لہذا شدت پسندی کا خاتمہ اور تمام مذاہب کی یکساں پذیرائی ہونی چاہیے اور سب کو ایک دوسرے کا احترام کرتے ہوئے ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا چاہیے اور تنقید کا نشانہ نہیں بنانا چاہیے۔

اس تحریک کے عوامی ہونے میں کوئی شک نہیں تاہم کئی بڑی شخصیات بھی اس سیلاب میں بہ گئیں اور مسلمانوں میں سے بھی کئی شخصیات نے اس کا پرچار کیا۔ سکھ مذہب کا اجرا اسی کی

ایک معین شکل تھی جو عسکریت پسندی اور مسلمانوں کو سیاسی سطح پر کمزور کر کے حکومت سے بے دخل کرنا چاہتے تھے؛ اسی لئے سکھوں کے تمام گرو تو مسلمان حکومتوں سے ہمیشہ ٹکراتے رہے اور اکثر و بیشتر شکست کھاتے رہے (آخری سکھ گرو، گوبند سنگھ اور نگزیب کے دور میں مارا گیا) اسی لئے مسلمان سکھوں سے دُور بھی رہے لیکن اس تحریک کے زیر اثر بہت سے لوگ صوفیا کے روپ میں اس فلسفہ کو قبول کر کے اس کے پرچارک بن گئے۔ مسلمانوں کی دوسری ہزاری (1596ء یا 1000ھ) کے لگ بھگ اس تحریک نے زور پکڑا اور مسلمانوں میں سے ہی اکبر جیسا حکمران پیدا ہو گیا جس نے دین الہی کو جاری کر کے تمام مذاہب کو خوش بھی کر دیا اور ساتھ بھی ملا لیا۔ اگرچہ ہندو تو یہ سمجھتا ہے کہ اس نے اکبر کی شکل میں مسلمانوں کو رام کر لیا تھا۔ تاہم یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اکبر نے اس بھگتی تحریک کا اثر قبول کر کے تمام حکومت مخالف عناصر کو ساتھ ملا لیا اور اپنی سلطنت کو دوام بخشا ہے۔ واللہ اعلم

مغلیہ سلطنت کے فرمانروا جہانگیر جلد ہی اس تحریک کے طلسم سے باہر آ گیا اور اس نے شیخ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر توبہ کر لی اور شراب وغیرہ سے توبہ کر کے ایک حد تک سدھر گیا۔ تاہم اس تحریک کا اثر پھیلتا بڑھتا چلا گیا چنانچہ جہانگیر کے بعد شاہ جہاں آیا تو اس تحریک نے شاہ جہاں کے بیٹے داراشکوہ کو اس قدر متاثر کیا کہ وہ اس کا پرچارک بن گیا۔ ہندو ذہن اور بھگتی تحریک کے کارپردازان (MASTER MINDS) نے یہ کوشش کی کہ اگر شاہ جہاں کے بعد داراشکوہ کو حکمران بنا دیا جائے تو یہ تحریک کامیاب ہو جائے گی مگر ”تدبیر کند بندہ، تقدیر کند خندہ“ خالق کائنات کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ شیخ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی محنت کے اثرات اتنی جلدی ختم ہونے والے نہیں تھے۔ اللہ نے اورنگ زیب عالمگیر کو آگے کر دیا اور داراشکوہ کی جگہ شاہ جہاں کے تیسرے بیٹے نے باپ کے بعد تاج و تخت سنبھال لیا۔ دراصل اورنگ زیب صحیح راسخ العقیدہ مسلمان تھا اور اس نے بھانپ لیا تھا کہ میرا بڑا بھائی داراشکوہ بھگتی تحریک سے شدید متاثر ہے جس سے اسلام کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے لہذا اس نے آگے بڑھ کر داراشکوہ سے جنگ کر کے جانشینی اور حکومت چھین لی اور باپ کو بھی قید کر دیا۔

ہندو ذہن اس عمل کو کبھی ہضم نہیں کر سکتا تھا لہذا انہوں نے اورنگ زیب کو ظالم

غاصب اور نامعلوم کیا کیا کہا ہے۔ تاہم ایک مسلمان کی حیثیت سے سوچیں تو سمجھ میں آئے گا کہ آخر ہندو کو داراشکوہ کے حکمران بننے سے کیا دلچسپی تھی؟ دلچسپی یہی تھی کہ انہوں نے جتن کر کے ایک منصوبہ کے تحت ایک حکمران تراشا تھا جو تخت شاہی پر متمکن نہ ہو سکا بلکہ اورنگ زیب عالمگیر کی شکل میں اسلام کا ایسا محافظ سامنے آ گیا جس نے اس تحریک کے اثرات کو غیر مؤثر بنانے میں بڑا کام کیا اور کم از کم ایک صدی پیچھے دھکیل دیا۔

اس تحریک کا اثر تھا کہ مسلمانوں میں سے 'مادھولال حسین' جیسے نام سامنے آ گئے جو پہلی نظر میں دیکھیں تو مادھو، لعل اور حسین تین مختلف مذاہب کے اثرات اپنے اندر رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ لاہور کے مشہور بزرگ حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ کو بلا کر سکھ گردوارہ امرتسر (جو بعد میں سکھ تحریک کا مرکز بنا اور 'گولڈن ٹمپل' کے نام مشہور ہوا) کا سنگ بنیاد رکھوایا گیا تا کہ مسلمان عوام کو دھوکہ دیا جا سکے۔ خدا نخواستہ یہ تحریک کامیاب ہو جاتی تو مسلمانوں کے نام کے ساتھ کرشن، سنگھ اور دیگر الفاظ کے سابقہ لاحقے نظر آتے جیسے آج کل بھارت میں شروع ہو چکا ہے اور تھری سی (COMMON CIVIL CODE) کے نام سے جو تحریک مسلمانوں کے فیملی لاز کو ختم کرنے کے لئے چل رہی ہے وہ آج سے دو صدیاں پہلے کامیاب ہو چکی ہوتی۔

وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰی اَمْرِہٖ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ (یوسف - 21)

”اور اللہ اپنے کام پر غالب ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے“

دشمنوں کی سرگرمیوں کا دوسرا بڑا مرکز سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی میں یورپ تھا۔ ان سرگرمیوں کے اسباب و نتائج پر مختصراً ترتیب وار چند اشارے پیش خدمت ہیں:

(1) سپین (ہسپانیہ یا اندلس) میں مسلم اقتدار 711ء سے بڑا مستحکم چلا آ رہا تھا جہاں یہود بھی بڑی آسودگی اور امن سے رہ رہے تھے۔ مشرقی یورپ میں عیسائیت کا غلبہ تھا اور یہ دور مسیحی یورپ کا DARK AGES کا دور ہے۔

(2) 1453ء عثمانی حکومت نے آگے بڑھ کر قسطنطنیہ جو یورپ کا مشرقی شاہدرہ کہلاتا تھا، فتح کر لیا اور مزید پیش قدمی کر کے مشرقی یورپ کا بڑا حصہ بھی اسلامی حکومت میں شامل کر لیا ایک وقت میں مسلمان فوجیں فرانس کے قلب تک پہنچ گئی تھیں۔

(3) رومی دارالحکومت قسطنطنیہ کے ہاتھوں سے چلے جانے سے مسیحی یورپ اور بنی اسرائیل (یہود) میں کھلبلی مچ گئی اور غصے اور بدحواسی میں انہیں اس کے سوا چارہ نظر نہیں آیا کہ سپین میں زوال پذیر مسلم اقتدار کو ختم کر کے مسلمانوں کو بھی ختم کر دیا یا زبردستی عیسائی بنا لیا گیا یا شمالی افریقہ کے ساحلوں پر اتار دیا گیا۔ سقوط غرناطہ کا یہ واقعہ 1492ء کا ہے۔

(4) اسی دور میں سپین میں مسلمانوں کی سائنسی ترقی اور علمی برتری مسیحی یورپ کے ہاتھ آگئی اور یہود نے اس علمی وراثت کو آنے والی صدیوں میں ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا ہے۔

(5) جب یورپ میں مسیحی اور یہودی آمنے سامنے ہوئے تو یہود نے اپنی سرشت اور تاریخ کے مطابق خود سامنا کرنے اور شکست و ریخت سے دوچار ہونے کی بجائے عیسائیوں کی اکثریت میں سے ہی ایک پروٹسٹنٹ خیالات کا حامی (یعنی اپنے ہی ایجاد کردہ کیتھولک عیسائی عقائد کے خلاف) نیا فرقہ کھڑا کر دیا اور بڑی جدوجہد سے اس کا وجود اور اس کے تحت عیسائیت سے آزاد بہت سے قوانین بھی منظور کرائے جن میں سب سے بڑا اثرہ سود کی حرمت کے خاتمے کی شکل میں سامنے آیا۔

(6) یورپ میں سائنسی ترقی اور علمی برتری کی بنیاد پر یورپی اقوام میں احساس برتری پیدا ہوا تو سیاسی اور فکری پھیلاؤ کا مرحلہ آگیا۔ یورپ کے مغرب میں سمندر بحر اوقیانوس تھا اور مشرق میں عظیم سلطنت عثمانیہ اور جنوب میں شمالی افریقہ بھی بہت دور تک عثمانی مقبوضات تھے جبکہ شمال میں منجمد سمندر۔ اس صورت حال میں نئی دنیاؤں کی تلاش کا مرحلہ سامنے آیا اور یورپ کے لوگ سیاحوں کی شکل میں بحری راستوں پر نکل کھڑے ہوئے اور اس میں کوئی شک نہیں ”جوئندہ یا بندہ“ جو محنت کرتا ہے وہ محنت کا پھل پاتا ہے یورپ کے ان سمندری سیاحوں نے جا کر امریکہ پر قبضہ کر لیا (1498ء) جو بڑی وسیع نئی دنیا تھی اور اسٹریلیا پر قبضہ کر لیا اور دنیا کے متعدد بے آباد جزیروں پر بھی قابض ہو گئے۔

(7) اسی پس منظر میں 1498ء میں ہی واسکو ڈی گاما نے مسلمان بحری ماہرین کی زیر نگرانی جنوبی افریقہ سے گھوم کر بھارت اور مشرق آنے کا سمندری راستہ دریافت کر لیا۔ جس سے سلطنت عثمانیہ کے گرد چکر کاٹ کر لمبے راستے ہی سے سہی جنوبی ایشیا تک رسائی ممکن ہو گئی اور یورپی عوام نے تجارتی منڈیوں کی تلاش میں یہاں آنا شروع کر دیا اور بنگال کے پاس ساحلی علاقوں پر ڈیرے

ڈال دیے اور تجارت کو فروغ دینے کی سرگرمیوں میں مشغول ہو گئے۔ 1600ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی (E.I.C) قائم ہوئی جو بعد میں پورے ہندوستان پر قابض ہو گئی۔ ہمارے پرانے شہروں میں کمپنی باغ اسی دور غلامی کی یادگار ہیں۔

(8) تجارت اور نئی منڈیوں کی تلاش میں پورپی اقوام کے نمائندے پورے ہندوستان میں پھیلے اور دہلی تک بھی رسائی حاصل کر لی۔ جب انسان محنت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ راستے خود بخود پیدا کر دیتا ہے اور جب قوم سو جاتی ہے اور کاہل ہو جاتی ہے اور نام نہاد توکل اختیار کر لیتی ہے تو وسائل ترقی کے پہلے سے موجود دروازے بھی بند ہو جاتے ہیں یا ہاتھوں سے چھن جاتے ہیں۔

عظیم مغل بادشاہ شاہ جہاں بیمار ہوا تو اس کے علاج میں مقامی حکماء اور اطباء کو کوئی کامیابی نہ ہوئی بادشاہ بہت پریشان تھا کہ ایک یورپی ڈاکٹر دہلی میں موجود تھا جس نے پیش کش کی اگر اسے علاج کا موقع دیا جائے تو وہ علاج کر سکتا ہے اس نے بادشاہ کا مختصر سا علاج (OPERATION) کیا اور بادشاہ صحت مند ہو گیا جس سے شاہ جہاں نے اُسے مشرقی بادشاہوں کی روایت کے مطابق کہا: مانگو جو مانگتے ہو؟ اور اس نے انعام کے طور پر صرف یہ مانگا کہ ہم پر دیسی لوگ ہیں تجارت کی غرض سے آئے ہیں منافع زیادہ نہیں ہے ہمیں مقامی ٹیکس (IMPORT TAX) معاف کر دیے جائیں بادشاہ نے سادگی میں اس بات کی منظوری دے دی جس سے یورپی تاجروں کے لئے اسلحہ لانے کے راستے کھل گئے اور انہوں نے جلد ہی اپنی آبادیوں کو اسلحہ سے بھر دیا اور ہندوستان پر سیاسی تسلط اور قبضے کے خواب دیکھنے شروع کر دیے۔

اس پس منظر میں جنوبی ہند میں مغلیہ سلطنت کا بطل جلیل حضرت محی الدین اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ برسر اقتدار آ گیا۔ ایک طرف اُسے مسلمانوں کے اندر بد عملی اور دین سے دوری کے سبب فکری انحطاط کا سامنا تھا۔ دوسری طرف مغلوں نے ایک صدی کے اقتدار کے باوجود شریعت اسلامی کا کامل نفاذ نہیں کیا تھا۔ اورنگ زیب اس میدان میں بھی مخلص تھا کہ اسلام کے تمام عدالتی قوانین نافذ ہوں اور انصاف کا بول بالا ہو اور مسلمان حکومت کی ذمہ داری امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا تقاضا پورا ہو۔ تیسری طرف اُسے ہندوستان کی اکثریتی مذہب ہندو ازم کی طرف سے بھگتی تحریک کے وار خالی جانے اور دارا شکوہ کے اقتدار پر قابض

ہونے سے محروم رہ جانے کا شدید صدمہ اور ردِ عمل کا خدشہ تھا۔ اور چوتھی طرف سکھ گرووں کی مسلسل بغاوتوں کا سامنا تھا اور وہ بالخصوص موجودہ پنجاب اور سرحد کو قبضہ میں لے کر مغلیہ سلطنت کا زمینی رشتہ افغانستان، ایران اور ترکی کی مسلم دنیا سے کاٹ دینا چاہتے تھے تاکہ مسلمانوں سے سختی سے نمٹا جاسکے۔

اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ نے موقع دیا اور طویل عرصہ (نصف صدی) کی حکمرانی دی، وسیع و عریض سلطنت دی تو صلاحیتیں بھی وافر عطا فرمائیں تاکہ وہ صحیح انداز میں اور صحیح نہج پر دین کی خدمت کر سکے۔

ذیل میں اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کی نصف صدی کے چند کارنامے اشارات کی شکل میں ترتیب وار درج کیے جاتے ہیں:

(۱) اورنگ زیب نے اپنی طویل تخت نشینی کے دور میں زیادہ وقت مختلف مہمات میں گزارا۔ 1662ء میں اس نے مغربی آسام کا محاصرہ کیا جو 1667ء میں اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ 1666ء میں اس نے چٹاگانگ اور 1667ء میں کابل کی بغاوتوں کو فرو کیا۔ دوسری طرف اُسے کابل پر زیادہ توجہ دینا پڑی۔ 1672ء اور 1681ء میں دوبارہ اس کو پٹھانوں کی شورش کا سامنا کرنا پڑا۔ 1679ء میں اس نے مردار (جودھ پور) اور میواڑ (اودھے پور) کی سلطنتوں پر دو کامیاب حملے کیے ان میں سے مردار اس کے قبضہ میں آ گیا لیکن میواڑ کے ساتھ 1681ء میں معاہدہ امن طے ہوا۔ 1685ء میں اس نے بیجا پور اور 1686ء میں گول کنڈہ کی ریاستوں پر دوبارہ کامیاب حملے کیے اور انہیں سلطنت مغلیہ میں شامل کر لیا یوں پہلی بار سلطنت مغلیہ ساحل چٹاگانگ سے لے کر کوہ ہندوکش کے دامن تک پھیل گئی۔

اگلے کئی برس اس نے سلطنت کے انتظام و انصرام میں گزارے مگر بد قسمتی سے وہ ایک اچھا منتظم ثابت نہ ہو سکا۔ مرکز سے مسلسل غیر حاضری نے مقامی سرداروں کو سر اٹھانے کا موقع دیا۔ خصوصاً مرہٹوں نے اسے کبھی بھی چین سے نہ بیٹھنے نہ دیا۔ اکبر کے برعکس اورنگ زیب ایک پکڑتی العقیدہ مسلمان تھا جبکہ اس کا بھائی داراشکوہ بلخاندانہ عقائد کا حامل سمجھا جاتا ہے اس نے اسلامی قوانین کو اقوالِ ائمہ کی روشنی میں نافذ کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں نظام عدلیہ میں بے شمار

تبدیلیاں کیں، مختلف مجموعہ کے فتاویٰ مرتب کرائے اس بنا پر بہت سے آزاد خیال مسلمان اور متعصب ہندو اس کے مخالف ہو گئے۔ مسلمانوں کو سب سے بڑا اعتراض اس بات پر تھا کہ اورنگ زیب نے سکھ پر سے کلمہ طیبہ کے حروف حذف کرنے کا حکم دیا تھا اور ہندو کو اس بات پر چڑھتی کہ اس نے ذبیحہ گائے اور ہندوانہ طرز سلام کے متعلق اکبر کے قوانین کو منسوخ کر دیا تھا۔ ہندوؤں نے اس پر بت شکنی اور مندر شکنی کے الزامات بھی عائد کیے ہیں۔

(ج) عالمگیر نے ایسی تمام رسوم کو جو غیر اسلامی تھیں یا اسلام کے منافی تھیں، بند کر دیا اور سب سے پہلے اس نے دربار میں اصلاحات کیں۔ سالگرہ اور تاج پوشی کے جشنوں میں سادگی پیدا کی، درباری نجومی موقوف کر دیے، جھروکے میں بیٹھنے کی رسم ختم کر دی، جشن نوروز بند کر دیا، الہی تقویم منسوخ کر کے اسلامی تقویم رائج کی، اس کے علاوہ محرم کے جلوس وغیرہ بند کرائے۔ قمار بازی، عصمت فروشی، شراب نوشی بند کر دی، موسیقی کے غیر معتدل اثر کی وجہ سے لوگ شمشیر و سنان بھول کر طاؤس و رباب میں گم ہو چکے تھے، عالمگیر نے موسیقی بھی بند کرادی۔

مسلم عوام کو شریعت کا پابند بنانے کے لئے اس نے بڑے مستعد محتسب مقرر کیے، ائمہ مساجد کی تطہیر کی، اسلامی فقہ مدون کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی جس نے عالمگیری کی سرپرستی میں فتاویٰ عالمگیری مرتب کیا، جو بین الاقوامی شہرت کا حامل مجموعہ ہے۔

(ج) عالمگیر بہت بلند کردار کا مالک تھا، اس کی زندگی اسلامی روایات کے عین مطابق تھی، وہ تمام مذہبی واجبات کا سختی سے پابند تھا، زندگی عیش و آرام سے کوسوں دور تھی، لباس اور خوراک بڑی سادہ تھی، اس نے سرکاری خزانہ کو ہمیشہ قومی امانت سمجھا اور کبھی ایک پیسہ نہ لیا، اپنے ذاتی مصارف پورے کرنے کے لئے وہ اپنے ہاتھ سے ٹوپیاں سینتا اور قرآن مجید لکھتا اور اسی اصول پر اس نے تمام زندگی بسر کی، وہ ایک صوفی تاجدار تھا، اس کا تصور حکومت بہت اعلیٰ تھا۔ وہ کہتا تھا کہ خدا مجھے اس دنیا میں اس لئے لایا کہ میں اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے زندہ رہوں اور محنت و مشقت اٹھاؤں۔ میرا فرض ہے کہ اپنی راحت کا خیال صرف اس حد تک کروں جس حد تک اسے میری رعایا کی خوشی حاصل ہو۔



12

حکیم الامت، مجددِ ملت، داعی اتحادِ امت

حضرت عظیم الدین

شاہ ولی اللہ

رحمۃ اللہ علیہ

ولادت: 1114ھ/1703ء

- 1732ء حرمین سے واپس تشریف لا کر اپنے والد ماجد کے قائم کردہ مدرسہ رحیمیہ میں درس و تدریس کے سلسلہ کے آغاز کیا۔
- 1737ء میں قرآن پاک کا فارسی میں ترجمہ کیا۔

وفات: 1176ھ/1762ء



قبرستان مہندیاں دہلی میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا مزار مبارک۔ ان کے مزار کے پاس
جانب ان کے فرزند اور قرآن حکیم کے مترجم شاہ رفیع الدین محدث محو خواب ابدی ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ مغل فرمان روا اور نگزیب عالمگیر کے سنہری عہد کے آخری سالوں میں 1703ء میں ایک علمی خاندان کے چشم و چراغ شاہ عبدالرحیم کے ہاں دہلی میں پیدا ہوئے اور مغلیہ سلطنت کے زوال کے پُر آشوب زمانے میں، جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے لیے خارجی لحاظ سے مرہٹہ قوت کی متشددانہ کاروائیوں وغیرہ اور داخلی طور پر بے عملی کے خلاف جدوجہد میں زندگی گزار کر (قمری لحاظ سے) 63 سال کی عمر میں خالق حقیقی سے جا ملے۔

اٹھارھویں صدی جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے لئے بڑی کٹھن اور مشکلات سے گھری ہوئی صدی ہے ہر چہا طرف سے بڑے مہیب اور خوفناک خطرات نے اُمتِ مسلمہ کو گھیر لیا تھا۔

● ایک طرف یورپی استعمار اپنے مکروہ عزائم کے ساتھ وسعت پذیر تھا اور 1600ء میں تشکیل دی گئی EIC (EAST INDIA COMPANY) بنگال کے پورے ساحلی علاقوں پر قابض ہوتی جا رہی تھی، مقامی لوگوں میں ہندو محکوم تھے اور مسلمانوں سے زخم خوردہ بھی تھے؛ لہذا وہ انگریز کے فطری حلیف تھے اور اس دوستی میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ یہاں تک کہ EIC نے 1750ء کے لگ بھگ یہ جرأت کی کہ اس نے بنگال پر قبضے کا منصوبہ بنایا اور 1753ء میں بنگال کے حکمران نواب سراج الدولہ سے لڑ کر انہوں نے بنگال پر قبضہ کر لیا۔ ہندو کا کردار سخت منافقانہ رہا۔ مسلمانوں میں سے بھی ایک گروہ نے انگریز سے مراعات اور بہتر مستقبل کے عوض اپنے ہی مسلمان بھائیوں سے غداری کر کے اس اقدام کو ممکن بنایا۔ مشہور شعر

جعفر از بنگال و صادق از دکن

نگ دین نگ قوم نگ وطن

میں جعفر از بنگال سے مراد نواب سراج الدولہ کے خلاف انگریزوں سے ساز باز کر کے شکست کا سبب بننے والے میر جعفر تھے۔

○ دوسری طرف ہندو قوم جو گزشتہ دو تین صدیوں سے بیدار ہو کر اپنی قوتوں کو مجتمع کر کے مسلمانوں سے انتقام لینے کے منصوبے بنا رہی تھی۔ پہلے اس نے مذہبی میدان میں سکھ مذہب کھڑا کر کے مسلمانوں کی تعلیمات کا کچھ حصہ اپنے اندر سمو کر مقامی آبادی کے مسلمان ہونے کے عمل کو روکنے کی سعی لا حاصل کی تھی۔ سکھ تحریک دراصل مذہبی کم اور سیاسی تحریک زیادہ تھی ورنہ اس کے ہاتھ میں کرپان کی بجائے 'مالا' ہوتی اور سکھ 'گرو' مسلسل تین صدیاں مغل حکمرانوں سے برسر پیکار نہ رہتے بلکہ دوسرے مذاہب کی طرح اپنی مذہبی سرگرمیوں میں مصروف رہتے۔ اس حقیقت کا انکار ممکن نہیں کہ سکھ مذہب کے اہم گرو مغل حکمرانوں سے مسلسل حالت جنگ میں رہے اگرچہ کامیاب نہیں ہو سکے۔ مغل سلطنت کے زوال کے وقت اور اس کے بعد انہوں نے زور پکڑا اور پنجاب، سرحد اور کشمیر کے بعض علاقوں میں اپنی حکومت قائم کر لی۔

○ تیسری طرف ہندو قوم جنوبی ہند سے مرہٹہ قوت تیار کر کے مغلیہ سلطنت پر قبضے کا خواب دیکھ رہی تھی اور موقع کے انتظار میں تھی۔ مغل بادشاہ اورنگزیب نے اس مرہٹہ قوت کو 25 سال تک دکن تک محدود رکھا اور اس طویل جنگ میں وہ اپنی 50 سالہ حکمرانی کے دوران 25 سال دارالحکومت سے باہر اس فتنہ کو ختم کرنے میں مصروف رہا تھا۔ اس سے اس فتنہ کی شدت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اورنگزیب عالمگیر کی وفات (1707ء) کے بعد آہستہ آہستہ یہ فتنہ دوبارہ اٹھا اور دہلی تک اس کی زد میں آ گئے۔

○ چوتھی طرف روسی ترکستان کے علاقے میں نادر شاہ نامی بادشاہ نے ہندوستان کا رخ کیا اور مغلیہ سلطنت کی کمزوری کی وجہ سے وہ دہلی پر حملہ (1739ء) کر کے وہاں لوٹ مار کرنے میں کامیاب ہو گیا اگرچہ اس نے مستقل قیام کی کوشش نہیں کی اور جلدی واپس چلا گیا۔ نادر شاہ کے اس حملہ سے مغلیہ سلطنت کی داخلی کمزوریوں کا بھرم کھل گیا اور انتظامی بد نظمی اور سیاسی خلفشار عروج پر پہنچ گئے۔ مرکز گریز عناصر اور مرہٹہ قوت کو اس سے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے راستہ صاف نظر آیا اور اس طرح مرہٹہ قوت کی سرگرمیاں بڑھ کر دہلی تک پہنچ گئیں۔

○ پانچویں طرف مسلمانوں کے اندر باہمی خلفشار اور فکری انتشار کے ساتھ بے عملی اور حکمرانوں کی دیکھا دیکھی عام آسودہ حال طبقے میں بھی عیش پرستی، لہو و لعب، آرام پرستی، جوا اور شراب جیسی لعنتیں در آئی تھیں۔ مسلمان عوام کے ساتھ ساتھ مسلمان حکمران طبقہ — خاندان مغلیہ بھی داخلی انتشار کا شکار ہو گیا۔ مغل بادشاہ اکبر کی بے دینی اور ارتداد کے رد عمل میں مسلمانوں میں ایک عمومی بیداری پیدا ہوئی اور اہل علم و اہل دانش مخلص حضرات نے اسلام کی خدمت کو اپنا شعار بنایا جن میں شیخ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے نام بہت نمایاں ہیں اس مثبت کام کا نتیجہ یہ نکلا کہ آہستہ آہستہ مغلیہ خاندان میں تبدیلی کے آثار نمایاں ہو گئے اور ایک صدی کے اندر ہی بات جہانگیر کی شراب و کباب سے توبہ سے لے کر اورنگزیب عالمگیر کے فتاویٰ عالمگیری کی شکل میں اسلامی قوانین کے مکمل نفاذ تک جا پہنچی۔ ذاتی کردار کے اعتبار سے بھی اورنگزیب کا معاملہ مسلمان بادشاہوں میں بھی نہایت اعلیٰ درجے کا تھا اور اپنی مثال آپ تھا۔

یہ بات اسلام دشمن لوگوں کو ہضم نہیں ہو سکتی تھی۔ لہذا مسلمانوں کے اندر سے مرکز گریز عناصر کوشہ دی گئی اور آخری حربے کے طور پر ایوان سلطنت میں خلفشار پیدا کرنے کے لئے کوششیں تیز ہو گئیں۔ ہوا یہ کہ فتاویٰ عالمگیری چونکہ اہل سنت کے متفقہ عقائد کا مجموعہ تھا اور مسلمانوں کی عظیم اکثریت %99 کی سوچ کا عکاس تھا اس کو ختم کرنے کے لئے اسلام دشمن قوتوں نے کاری وار کیا اور اہل سنت کے مقابلے میں شیعہ مسلک کو فروغ دینے کا کام شروع ہوا اور اس کی انتہا یہ کہ اورنگ عالمگیر کا بیٹا محمد معظم عالم شاہ بہادر شاہ اول جب حکمران ہوا۔ جو کہ خود بھی بڑا عالم فاضل تھا۔ اس نے یہ سرکاری اعلان جاری کر دیا کہ اس نے بھرپور مطالعہ کے بعد مذہب شیعہ کو 'حق' جان کر اس کو اختیار کر لیا ہے۔ اس فیصلے سے خود مقتدر حلقے میں خلفشار پیدا ہو گیا اور خاندان مغلیہ جو دو صدیوں سے اہل سنت کے مسلک پر چلا آ رہا تھا اور اسلامی شریعت کا نفاذ اس کا نقطہ عروج تھا۔ اس کی ساری محنت اور کام زمین بوس ہو گیا اور خاندان مغلیہ کے اندر گھر گھر بحث و تمحیص کے دروازے کھل گئے اور صلاحیتیں تقسیم ہو گئیں جس سے حکومتی استحکام میں تزلزل آ گیا اور مغلیہ اقتدار بے لنگر کے جہاز کی طرح ہچکولے کھانے لگا اور حکمران یکے بعد

دیگرے تیزی سے بدلنے لگے۔ تا آنکہ — اسی بد نظمی، افراتفری اور ذاتی اغراض کی جنگ کے پیش نظر افغانستان سے نادر شاہ نے حملہ کر کے دہلی کو تاخت و تاراج کر دیا اور قتل عام کیا، لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہوا مگر حالات کی ناسازی کے باعث وہ جلد ہی واپس لوٹ گیا۔ خاندان کے اس داخلی مذہبی انتشار نے مغلیہ حکومت کے زوال میں بہت بنیادی کردار ادا کیا اور اسلام دشمن عناصر کے لئے کامیابیوں کا راستہ کھول دیا۔

یہ وہ زمانہ ہے جب شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے شعور کی آنکھ کھولی اور حالات کا بغور مشاہدہ کیا۔ شاہ صاحب نے حج بیت اللہ کے لئے حرمین شریفین کا سفر کیا اور حصول علم کی خاطر وہاں کچھ عرصہ رُکے رہے۔ وہاں ان کی ملاقات شیخ محمد بن عبدالوہاب سے رہی جو شاہ صاحب کی طرح شیخ محمد حیات سندھی رحمۃ اللہ علیہ سے حصول علم کر رہے تھے، اس قیام کے دوران شاہ صاحب کو بلادِ اسلامیہ سے آنے والے اہل علم و دانش سے تبادلہ خیالات کا بھرپور موقع ملا اور ایران، ترکستان، افریقہ، انڈونیشیا، ملائیشیا، ترکی غرض عالم اسلام کے مسلمانوں کے حالات و خیالات جاننے کا موقع ملا۔ شاہ صاحب نے انہی مواقع سے فائدہ حاصل کر کے اُمت مسلمہ کے لئے آئندہ کے لائحہ عمل اور اس کی تیاری کے لئے اپنی تصنیفات کا سہارا لیا اور اپنے شاگردوں کو اس کے لئے تیار بھی کر دیا۔

عالمی حالات پر نگاہ رکھتے ہوئے جب شاہ صاحب نے وطن واپس پہنچ کر جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے حالات کو دیکھا تو انہیں مسائل کا ایک انبار نظر آیا۔ چنانچہ انہوں نے کمال پامردی سے دہلی میں مقیم ہو کر ان حالات کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور انہوں نے جن اہم امور پر توجہ دی ان میں سے چند حسب ذیل ہیں:

● مسلمانوں کی عمومی رہنمائی اور بیداری کے لیے قرآن مجید کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔ یہ بات یاد رہے کہ اس دور میں مسلمانوں کی سرکاری زبان فارسی تھی اور تمام اہل علم فارسی جانتے تھے اس کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے۔ (اگرچہ بے عمل علماء و صوفیاء اور جاہل عاملوں اور تعویذ گنڈا کرنے والے طبقات میں اس سے بے چین پھیل گئی اور شاہ صاحب پر قاتلانہ حملہ بھی کرایا گیا۔)

○ قرآن مجید پر اہل علم کے غور و فکر کے لئے بنیادی اصولوں کی وضاحت فرمائی اور ”الفوز الکبیر فی اصول التفسیر“ نامی کتاب تحریر فرمائی جو آج بھی اپنے موضوع پر ایک مستند تحریر تصور کی جاتی ہے۔

○ یورپی استعمار کی آمد پر مسلمانوں کی زبوں حالی اور اسلامی حکومت کے زوال سے مسلمانوں کے غیروں کے غلام بن جانے کا خدشہ نظر آ رہا تھا۔

اس میدان میں ہندوؤں کا مسلمانوں کے خلاف یورپی استعمار کا ساتھ دینے اور مکمل طور پر اس کا دست و بازو بننے کے بھرپور مواقع سامنے تھے جب کہ مسلمانوں میں چار صدیوں کی حکمرانی کے باعث کردار کی کمی اور قائدانہ صلاحیتوں کا فقدان نوشتہ دیوار تھا۔ مغلیہ خاندان میں کوئی شخصیت ایسی نہ تھی جو سلطنت کو سنبھال سکے اور شکست و ریخت سے بچا سکے۔ مسلمانوں میں حکومتی زوال کے باعث فرقے اور گروہ بندیاں اور علاقائیت سراٹھار ہی تھی۔ مسلمان علماء و صوفیاء بالعموم اصلاحی اور تعمیری کام سے غافل تھے۔ شریعت اور تصوف، ظاہری علوم اور باطنی علوم، عشق و عقل، فقہی مذاہب کے اختلافات اور تصوف و روحانی مسالک کے مابین صرف دوری ہی نہیں بلکہ عدم برداشت کے رویے وقت کے ساتھ ساتھ تیزی سے بڑھ رہے تھے۔ ان حالات میں شاہ صاحب نے فقہی مسالک میں اعتدال کی راہ اپنانے کے لئے ایک کو غلط اور دوسرے کو صحیح قرار دینے کے طریقے کی بجائے بقائے باہمی کے اصول کو فروغ دیا جو عین انصاف کا تقاضا اور شریعت حَقِّہ کا مقصود بھی تھا چنانچہ آپ نے ”الانصاف فی بیان سبب الاختلاف“ نامی کتاب لکھ کر اہل علم کی اس جانب رہنمائی فرمائی۔

○ شیخ مجدد عظیمیؒ کی طرح آپ نے تصوف کے میدان میں بھی شریعت کی پابندی کا اصول اپنایا اور اس کو عام کر کے اسلامی معاشرے کی اصلاح کی کوشش فرمائی۔ نظریہ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے ضمن میں بھی دونوں نقطہ ہائے نظر میں موافقت اور تطبیق کا راستہ اختیار کر کے امت کو مزید تقسیم اور خلفشار سے بچالیا۔

○ مغل حکمران ہمایوں کی ایران سے نظریاتی فوج کے ہمراہ واپسی اور حکومت کی بحالی کے بعد ایک صدی تک شیعہ مسلک برصغیر میں پس پردہ رہا اور اپنے منفرد اعتقادات کا پرچار کرتا رہا

مگر اورنگزیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے بعد بادشاہ کے شیعہ مسلک اختیار کر لینے کے اعلان سے یکا یک حالات بدل گئے اور لوگ شیعہ مسلک اختیار کرنے لگے اور ان کے مخصوص نظریات عام ہونے لگے جب کہ اہل سنت عوام اور خواص پہلے پہل اس سے بے خبر رہے۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس میدان میں مسلمان امت کی بہتری کے لئے اور مسلمانان ہند کی بقا کی خاطر مسلک اہل سنت کا مدلل دفاع فرمایا اور علماء و خطباء اہل سنت اور صوفیاء و واعظین کے ہاتھ میں دلائل کا ایک ایسا دبستان دے دیا جو آج تک اہل سنت کی دل کی آنکھوں کے لئے سرمہ کے طور پر اکسیر کا درجہ رکھتا ہے۔ ہماری مراد شاہ صاحب کی تصنیف لطیف ”قرۃ العینین فی فضلیۃ الشیخین“ سے ہے جس میں شاہ صاحب نے کمال مہارت سے دور نبوت صلی اللہ علیہ وسلم کے خیر القرونِ قریبی سے متصل بعد خلافت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور خلافت عمر رضی اللہ عنہ کو حق ثابت کیا اور ان کی فضیلت کو مدلل و مبہر بن کر دیا کہ آج بھی روز اول کی طرح روشن کتاب کا درجہ رکھتی ہے۔ پھر فضیلت علی ترتیب الخلافت کو بھی عوام کے ذہن میں اتارنے کی کامیاب کوشش فرمائی۔ (اس ضمن میں آپ کے فرزند ارجمند شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے ”تحفہ اثنا عشریہ“ لکھ کر اہل سنت کی ترجمانی کا حق ادا کر دیا اور عوامی سطح پر بھی احقاقِ حق کا فریضہ ادا کر دیا)

○ سب سے اہم معاملہ جس پر شاہ صاحب نے کام کیا اور یہ کام شاہ صاحب جیسا عبقری اور GENIUS ہی کر سکتا تھا کہ جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کے حکومتی زوال کے جلو میں ایمانی کیفیات کا زوال اہل علم کو نظر آ رہا تھا، اس کے لئے نہایت وقیع اور حد درجہ قابلِ قدر کام کیا اس شعبہ میں ان کے تعمیری کام کے دو حصے ہیں: (1) سیاسی و فلاحی کام (2) علمی اور تصنیفی کام علمی دنیا میں یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ مخصوص خارجی حالات کے اعتبار سے جب بھی کوئی کام کیا جاتا ہے تو وہ دو طرح کی امکانی صورتیں ہوتی ہیں: کچھ لوگ طبعاً مثالیت پسندی (IDEALISM) کی طرف میلانِ طبع رکھتے ہیں وہ اسی طرح کی سوچ کے تحت آگے بڑھتے ہیں اور اسی طرز (IDEALISTIC APPROACH) پر اپنے فکر کی بنیاد رکھتے ہیں۔ جب کہ کچھ لوگ نفسیاتی طور پر واقعیت پسند (REALIST) ہوتے ہیں ان کی سوچ واقعیت پسندی اور خارجی معروضی حالات کے تحت ہی کسی کام کی عملی تفصیلات طے کرتی ہے۔ یہ سوچ REALISM

اور یہ طرز فکر REALISTIC APPROACH کہلاتی ہے۔ جب کہ کچھ مردانِ کار جو اپنی سوچ کو بھی بلند رکھتے ہیں اور عملی اقدامات کے طور پر ہوا میں قلعے تعمیر نہیں کرتے بلکہ واقعاتی اور حقیقی ماحول کے مطابق عملی اقدامات کرتے ہیں۔ گویا IDEALISM اور REALISM کے درمیان چلتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے مسلمانوں کے اقتدار کی کشتی کو بھنور میں دیکھا ہے اور یورپی استعمار کی پیش رفت کے تحت مسلمان امت کے وجود کو لاحق خطرات (جو سپین کے مسلمانوں جیسے بھی ہو سکتے تھے) سے نکالنے کے لئے فوری عملی اقدامات بھی کیے ہیں اور اسلام کے حقیقی اجتماعی تصور خلافت و حکومت کو از سر نو بحال کرنے کے لئے فکری سطح پر اعلیٰ معیار کا مواد فراہم کیا ہے نیز اس کے لئے ضروری جذبہ عمل کے طور پر جہاد کے لئے بھی کام کیا ہے۔

1 جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے فوری مسائل کا حل

اصلاحی اور تبلیغی نوعیت کے کام کے علاوہ شاہ صاحب نے مسلمانوں کو درپیش ہنگامی نوعیت کے مسائل کا حل بھی نکالنے کی کوشش فرمائی تھی آپ نے بہت سے نوابوں اور مشہور سیاسی لوگوں کو خطوط لکھے اور ہندوؤں کی مرہٹہ قوت کے احیاء، یورپی استعمار یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی کے اثر و رسوخ میں بے پناہ اضافہ اور سمندری راستوں پر قبضہ کے علاوہ مغلوں کی باہمی رنجشوں اور رقابتوں کے ساتھ شیعہ سنی تقسیم پر بھی قلم اٹھایا ہے اور مسلمانوں کے دینی اتحاد کے ساتھ صاحب حیثیت امراء اور نوابین کو اسلام اور اسلامی شعائر پر آمادہ عمل کرنے کی سعی بھی کی ہے۔

اس سلسلے میں سب سے اہم خط و کتابت آپ نے والی قندھار احمد شاہ ابدالی رحمۃ اللہ علیہ سے کی ہے جو پہلے ملتان کے گورنر رہ چکے تھے اور اب قندھار کے حاکم تھے۔ شاہ صاحب نے انہیں مغلوں کے سیاسی زوال اور مرہٹہ قوت کے دوبارہ سر اٹھانے کی طرف توجہ دلائی اور لکھا کہ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی حفاظت کے لئے یہاں کوئی شخصیت اور قوت موجود نہیں ہے آپ آئیں اور امتِ مسلمہ کے اس حصے کو مرہٹہ قوت کے انتقامی جذبات سے بچائیں۔ چنانچہ اپنی والدہ کی فرمائش پر وہ ہندوستان آیا اس کے پاس بیس ہزار جاٹ تھے اور بھاری توپ خانہ تھا (جو جرمن ساخت کا تھا)۔ مقامی طور پر شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی دعوت پر مزید 70، 80 ہزار افراد نے اس جہاد

میں شرکت کی۔ جنوری 1761ء میں پانی پت کے میدان میں تیسری لڑائی مرہٹہ قوت اور احمد شاہ ابدالی کے درمیان لڑی گئی جس میں مرہٹہ قوت کو شکست فاش اور مسلمانوں کو واضح فتح ہو گئی، جس سے مسلمانوں میں ایک حوصلہ ولولہ جینے کی امنگ اور اللہ کے دین کی خاطر جہادی جذبات کی آبیاری ہوئی۔ احمد شاہ ابدالی واپسی پر وہ توپیں پنجاب میں ابھرتی ہوئی سکھ قوت کے سرکردہ سردار رنجیت سنگھ کو بخشش میں دے گیا، جس سے اس نے اپنے مخالفوں پر سیاسی اور فوجی برتری حاصل کر کے ایک وسیع سکھ حکومت قائم کر لی جو 1846ء تک قائم رہی۔ (یاد ہے کہ سکھوں نے تقریباً ستر سال کابل سے لے کر دہلی تک حکومت کی ہے، سردار رنجیت سنگھ نے پچاس سال حکمرانی کی اور کشمیر سے ملتان تک اس کی فرمانروائی میں تھے۔ احمد شاہ ابدالی کی خیر سگالی کا جواب یہ تھا کہ ان کے دور حکومت میں مساجد پر تالے تھے، اذان نماز پر پابندی تھی، کوئی اذان نہیں دے سکتا تھا، قرآن مجید لے کر باہر نہیں نکل سکتا تھا، شاہی مسجد لاہور گھوڑوں کا اصطبل تھا اور سارا قیمتی پتھرا تار کر امر ترس لے جایا جا چکا تھا۔ مسجد کی موجودہ تعمیر تو 1937ء۔ 1960ء تک مسلمانوں کے چندے سے ہوئی ہے۔) پانی پت کی اس لڑائی میں مسلمانوں کی فتح کے نتیجے میں مسلمان سرائٹھا کر چلنے کے قابل ہو گئے۔

2 علمی اور تصنیفی کام

مغلیہ حکومت کے زوال اور عملی طور پر حصے بخرے ہو جانے کی وجہ سے اسلام کا اجتماعی نظام اور شرعی احکام کا نفاذ ختم ہو گیا۔ اس کے لیے شاہ صاحب نے علمی کام بھی کیا کہ مسلمانوں کو دوبارہ حکومت کے حصول کے لئے کوشاں ہونا چاہیے اور اس کے لئے دور جدید میں جبکہ مغرب اور مشرق وسطیٰ میں انسانی بیداری اور جدید سوچ کے تحت انسانی حقوق اور حکومتوں کے بننے بگڑنے میں عوام کے عمل دخل کی اہمیت بڑھ گئی تھی جس کے بارے میں مغربی مفکرین سے کہیں پہلے شاہ صاحب نے معاشی میدان میں 'ارتقا قات' کا فلسفہ پیش کیا اور انسانی ضرورتوں اور خواہشوں اور ان کی تکمیل کی درجہ بندی کردی اور اسلام کے عادلانہ نظام میں دولت کی صحیح تقسیم کی وضاحت فرمائی اور 'فک کل نظام' ہر ظالمانہ نظام کو تہس نہس کر دو! کا نظریہ پیش کیا۔

ان کی ان ساری مساعی کا مدار اور محور قرآن مجید اور سنت رسول تھا اسی لئے اس ربط

تعلق کی وضاحت اور اسلامی احکام کی حکمتیں واضح کرنے کے لئے خواص و عوام کے لیے ”حجة اللہ البالغہ“ کے نام سے حکمت دین کی شرح اور تفسیر پر کتاب لکھی جو اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ میں اپنے موضوع پر واحد کتاب ہے جس میں آپ نے اللہ تعالیٰ کے احکام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام و سنن کی حکمتیں کمال حکمت سے واضح فرمائیں اور ان کا انطباق دورِ حاضر کے تمدنی، معاشی، معاشرتی اور نفسیاتی مسائل کے ساتھ کر کے ایمان کی مضبوطی کے لئے مستحکم بنیادیں فراہم کر دیں جس سے امت کے ذہین عناصر کو بہت تقویت ملی۔

آپ ایک عمیق تھے اور اپنے ماحول کے اعتبار سے بہت آگے کی باتوں پر غور کرتے تھے، آپ نے اسلام کے مستقبل کے بارے میں بڑی پُر امید باتیں کیں۔ اسلام کے عالمی غلبہ اور اس کے عادلانہ نظام کے ہمہ گیر اظہار کی نوید سنائی۔ آپ نے اس بات پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہندوستان کے باسیوں میں اونچی ذات کے ہندوؤں نے آخر اسلام کیوں قبول نہیں کیا؟ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ ہمارے مسلمان حکمرانوں نے اسلام کی با مقصد تبلیغ اور عادلانہ اجتماعی نظام کے ساتھ خلافت اسلامی کے کفالت کے نظام کا نمونہ آخر ہند کے در نشینوں کو دکھایا ہی کب ہے کہ ان پر اتمامِ حجت ہو سکے۔ آپ نے لکھا کہ جب اسلام کا مستقبل میں غلبہ ہوگا اور اس کی حقیقی تعلیمات پر مبنی خلافت کے نظام کے تحت سماجی، سیاسی اور معاشی تعلیمات پر عمل درآمد ہوگا اور کفالت عامہ کا تصور جلوہ گر ہوگا تو۔۔۔ اونچی ذات کے اکثر ہندو یقیناً اپنے اندرونی خلوص اور نیکی کی وجہ سے دامنِ اسلام میں پناہ لیں گے۔ واللہ اعلم

الغرض۔۔۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ آج کے دورِ جدید کے آدمی محسوس ہوتے ہیں، ان کی ذات اور ان کے خاندان سے ایک تحریک اٹھی اور اس کے کئی گوشے سامنے آئے اور یقیناً پاکستان کے قیام اور انگریزوں کی غلامی سے آزادی میں ان کے افکار کا بڑا عمل دخل ہے۔



3 صدیاں اور 3 عظیم گواہیاں

(وفات 1761ء) کے اس فرمان کے مطابق کہ ”مستقبل میں جب اسلام کی تعلیمات پر

شاہ ولی اللہ

اجتماعی سطح پر عمل ہو کر ہندو مذہبی طبقہ پر اتمامِ حجت ہوگا تو ان کی عظیم اکثریت اسلام کے دامن میں پناہ لے گی“

نے 170 سال بعد خطبہ الہ آباد (1930ء) میں یہ ارشاد فرمایا کہ ”اگر برطانوی ہند کے

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال

مسلمانوں کو شمال مغرب کے مسلم اکثریت کے علاقے میں علیحدہ سلطنت کے قیام کا موقع مل گیا تو ہمارے لیے ممکن ہوگا کہ اسلام کے عدلِ اجتماعی کی تعلیمات کا ایک نمونہ دورِ حاضر میں دکھاسکیں جس پر عرب دورِ ملوکیت میں پردے پڑ گئے تھے۔“ اس کی تائید فرمائی۔ اور اس کے 70 سال بعد.....

نے 1998ء میں دورہ افغانستان کے بعد پشاور میں یہ کہہ کر اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی کہ اگر

فرزند اقبال
ڈاکٹر جاوید اقبال

ایسا ہو جائے کہ طالبان کی طرح ایک دو اور مسلم ممالک (بالخصوص پاکستان) اسلام کے عدلِ اجتماعی کی تعلیمات کا نمونہ دکھادیں تو امن و سکون اور معاشی عدل کی فراہمی کی بنا پر ساری دنیا (بشمول بھارت) از خود مسلمان ہو جائے گی۔

اللَّهُمَّ عَجِّلْ لَنَا هَذَا آمِينَ

13

فاتح ہند، مردِ درویش، مجاہدِ اسلام

حضرت

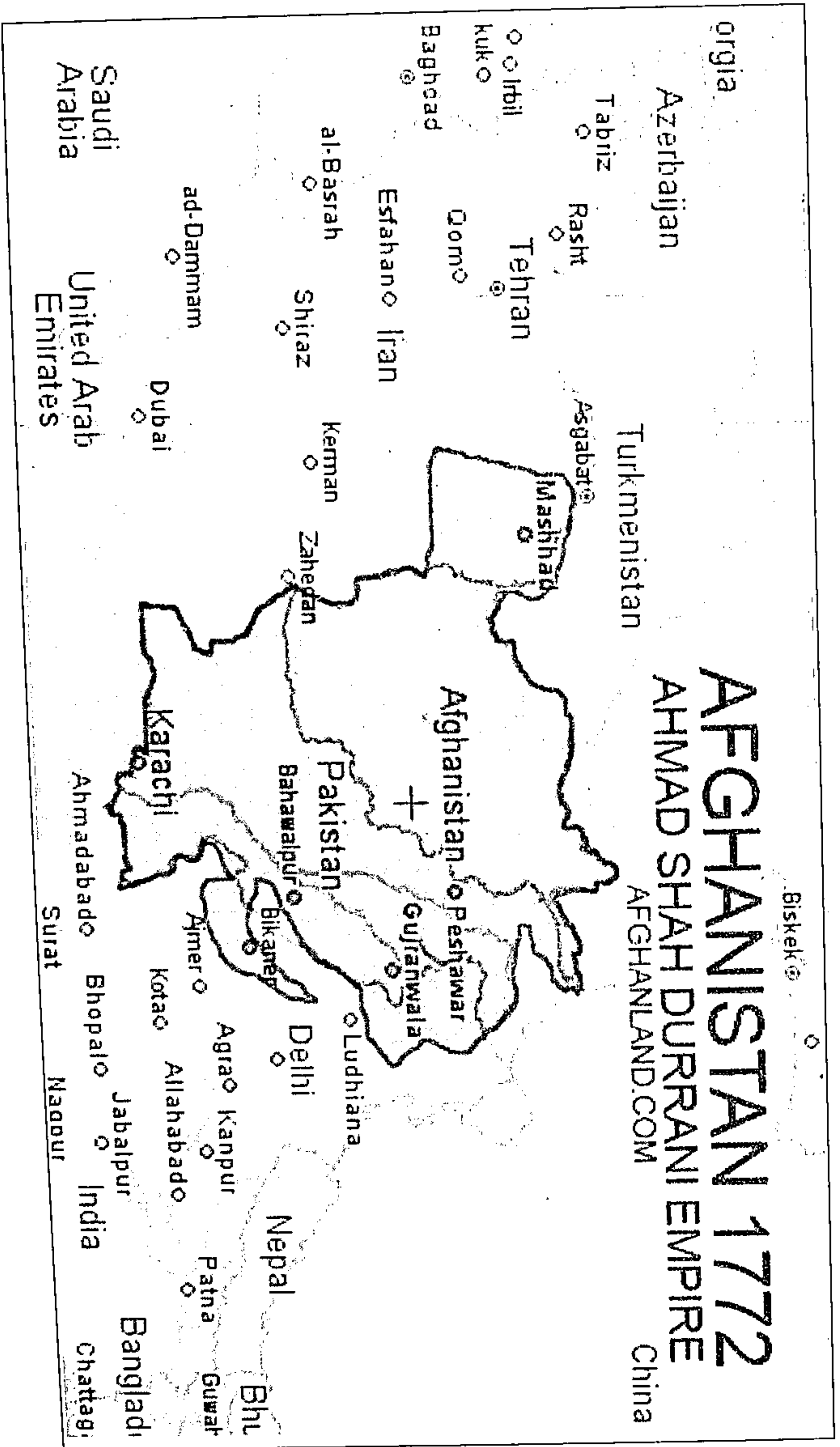
احمد شاہ ابدالی

رحمۃ اللہ علیہ

ولادت: اٹھارھویں صدی کے اوائل میں ہوئی

○ 1761ء میں مرہٹوں کو شکست دی

وفات: 1184ھ / 1773ء قندھار



احمد خان نام تھا اور آپ درّانی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے آپ کی پیدائش کب ہوئی؟ اور کہاں ہوئی؟ اس کے بارے میں حتمی رائے نہیں دی جاسکتی۔ ملتان کینٹ میں ایک تاریخی منقش محراب ہے جو احمد شاہ ابدالی کی جائے پیدائش کی نشان دہی کرتی ہے مگر یہ محل نظر ہے۔ آپ قندھار افغانستان کے حاکم تھے اور دینی مزاج کے حامل اور عادل و منصف بادشاہ تھے۔ آپ کی وفات 1773ء میں قندھار میں ہوئی۔ آپ کی عمر یقیناً 60-70 سال تھی، لہذا آپ کی ولادت اٹھارھویں صدی کے اوائل میں ہوئی۔

اٹھارھویں صدی عیسوی

اٹھارھویں صدی عیسوی کا زمانہ سیاسی اعتبار سے دنیا بھر کے لئے تاریخی اہمیت کا حامل ہے اور بعض اہم سائنسی ایجادات و اکتشافات کا زمانہ بھی ہے۔

1- سولہویں صدی (1501ء تا 1600ء) یورپ میں سود کے نظام کی ابتداء اور بنک آف انگلینڈ (1545ء) کے قیام کی وجہ سے اہم ہے، یہی بنک بعد میں ساری دنیا میں بنکاری کی ”ماں“ ثابت ہوا اور سودی معیشت کی لعنت کا نقطہ آغاز بھی۔

2- یورپی احیاء العلوم (RENNIASANCE) کے زیر اثر چرچ سے علوم اور سائنس کی علیحدگی ہوئی جس کے نتیجے میں آہستہ آہستہ اٹھارھویں صدی تک مذہب اور سائنس کی دوری کے بعد مذہب اور ریاست کی علیحدگی بھی ہو کر رہی اور فرانس کے جمہوری انقلاب کے پردے میں دراصل عوامی آزادی، عوامی رائے، ووٹ اور الیکشن کی آڑ میں ریاست اور اس کے چلانے کے لئے مذہب کی بجائے عوامی رائے اور اکثریت کے فیصلوں کو اہمیت حاصل ہو گئی۔ مذہب کو چرچ (CHURCH) تک محدود کر دیا گیا اور مذہبی زعماء (POPES) کے اختیارات کو بھی محدود کر دیا

گیا۔ سیاست اور حکومت کی رہنمائی کے لئے سیکولرازم سامنے لایا گیا اور انسانوں کے لئے قانون سازی کی بنیاد مذہب کی بجائے اب سائنسی تحقیقات قرار پائیں جبکہ ان سائنسی تحقیقات کی ڈور صہیونی قوت کے پاس ہے۔

3- یورپی اقوام میں گزشتہ دو ہزار سال سے بحری سفر (نیوی NAVY) اور سمندری تجارت کی اہمیت رہی ہے شروع میں اس کی بڑی وجہ غالباً زمینی وسائل رزق کی کمی تھی اٹھارویں صدی کے آتے آتے یورپی اقوام کے بحری بیڑے کڑھ ارض کے تمام سمندروں پر بلا شرکت غیرے دندناتے پھرتے تھے اور بحری طاقت میں ان کا کوئی مقابل نہ تھا۔ یورپ کی اس بحری طاقت میں اضافہ کے اہم نکات یہ ہیں:

○ یورپ میں مسلمانوں کے زوال (سقوط غرناطہ 1492ء) کے ساتھ ہی اس سارے علاقے برطانیہ، فرانس، اٹلی، پرتگال اور شمالی اور مغربی افریقہ کے ساحلی ممالک کی بحری طاقت جو پہلے مسلمانوں کے پاس تھی (اور مسلمان دنیا بھر میں تجارت پر قابض تھے) یورپی اقوام کے ہاتھ چلی گئی۔

○ 1492ء میں کولمبس نامی پرتگالی شخص نے ایک مسلمان گائیڈ کے ساتھ سفر کر کے امریکہ تک رسائی حاصل کی تو وہاں پہلے سے مسلمان اور دیگر اقوام آباد تھیں تاہم یورپ نے امریکہ کی دریافت کا تاج کولمبس کے سر پر رکھ دیا۔ یہ سفر پر خطر بھی تھا اور طویل بھی۔ مراکش کے ساحل سے امریکہ کا مشرقی ساحل 2900 کلومیٹر ہے اس طرح یورپی اقوام کے بحری اسفار کے لئے نیا راستہ کھل گیا۔

○ یورپی اقوام پہلے مشرق کی طرف زیادہ آزادی سے نہیں جاسکتی تھیں اس لئے کہ چار ہزار میل تک مسلم حکومتیں پھیلی ہوئی تھیں انفرادی طور پر کچھ سیاح آتے رہے اور معلومات لے کر واپس وطن لوٹتے رہے تا آنکہ 1498ء میں واسکو ڈی گاما نامی ایک یورپی ملاح نے ایک مسلمان گائیڈ کی رہنمائی میں افریقہ کے مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ جنوب کا سفر کرتے ہوئے اس امید (جنوبی افریقہ) کے پاس واپس شمال کا راستہ دریافت کر لیا اور اس طرح یورپی اقوام کے لئے بحری راستے سے (اگرچہ یہ راستہ زمینی راستے سے دو گنا تھا) جنوبی ایشیا اور مشرقی بعید کے ممالک

تک رسائی حاصل کر لی۔

○ یورپی اقوام کو پہلے ہی معلوم تھا کہ مشرقی ممالک بالعموم اور جنوبی ایشیا بالخصوص ”سونے کی چڑیا“ ہے اور زرعی اور تجارتی لحاظ سے بہت آسودہ حال اور خوش حال علاقہ ہے لہذا بحری راستہ دریافت ہوتے ہی یورپی اقوام مشرقی ممالک کی طرف ٹوٹ پڑیں۔

○ یورپ سے امریکہ کی ”نئی سرزمین“ اور ”خوابوں اور آزادی کی سرزمین“ کی طرف بھی لوگوں نے سفر کیا ہے مگر اس طرف صرف اپنے اپنے علاقے کے بدمعاش، بھگوڑے، جرائم پیشہ اور حکومتوں کو مطلوب افراد گئے ہیں تاکہ وہ بھی آزادی کی فضا میں سکھ کا سانس لے سکیں۔ تاہم مشرقی ممالک کی طرف یورپی اقوام نے تجارت کی غرض سے سفر کیے اور نہایت غیر محسوس طریقے پر علاقوں پر قابض ہوتے چلے گئے۔

○ مغل بادشاہ اکبر کے زمانے (1556-1605ء) تک یہ یورپی اقوام سمندری راستوں پر اس قدر قابض تھیں کہ کوئی دوسرا دخل نہیں دے سکتا تھا۔ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی خوشحالی اور دیگر جغرافیائی وجوہات کی بنا پر یہاں بحری قوت میں ترقی نہ ہو سکی۔ زمینی راستے ہمیشہ مخدوش رہتے تھے اور جا بجا جنگیں جاری رہتی تھیں اور راستے پر خطر تھے۔ اکبر کی پھوپھی نے حج کرنا چاہا تو یورپی بحری قزاقوں کو بھاری رقم دے کر یہ سفر ممکن ہو سکا۔

○ یورپ میں سائنسی ترقی، ایجادات اور صنعتی مصنوعات کے فروغ نے اس جذبے کو اور مہمیز دی اور یورپی مصنوعات کی کھپت اور فروخت کے لئے فرانسسسی، اطالوی، ڈچ اور برطانوی بحری مہم جو پوری دنیا میں نکل کھڑے ہوئے۔ لوٹ مار کر خود بھی کھانا اور لوٹ کر سال دو سال بعد گھر لوٹنا تو گھر والوں کے لئے بھی وافر وسائل لے آنا یہ ان بحری مہموں کا حاصل تھا۔

○ اس وسیع مہم جوئی کا ایک مثبت نتیجہ یہ نکلا کہ یہ مہم جو ہر دفعہ جب لوٹتے تھے اور دنیا میں جوئے جزیرے اور آبادیاں دریافت کرتے تھے ان کی معلومات واپس آ کر حکومت کے حوالے کرتے تھے۔ لہذا اس طرح یورپی حکومتوں کے پاس اٹھارویں صدی کے آخر تک دنیا بھر کے سمندروں، ساحلوں، بے آباد علاقوں، جزیروں وغیرہ کے بارے میں بہت ساری معلومات جمع ہو چکی تھیں۔ یہ معلومات جغرافیائی اور معاشرتی بھی تھیں جس میں اس جزیرے کا طول بلد، عرض

بلد، رقبہ، زمینی ساخت، دریا، پہاڑ، میدان، ریگستان، فصلیں، مشہور معدنیات، لوگوں کا رہن سہن وغیرہ شامل تھیں، تاریخی اور مذہبی معلومات بھی جمع ہو گئیں اور قبائل، نسلیں اور زبانوں کے بارے میں ابتدائی مرحلہ میں قابل لحاظ مواد جمع ہو گیا۔

○ اٹھارھویں صدی کے آخر تک دنیا بھر کے تمام جزیرے اور ساحل قطب شمالی اور جنوبی سمیت یورپی اقوام کے قبضے میں جا چکے تھے اور یورپی سیلرز (SAILORS) کا سکہ رواں تھا اور ساری سمندری تجارت اور سفر بھی انہیں کے کنٹرول میں تھا۔

انقلاب فرانس

اٹھارھویں صدی کے آغاز سے لے کر پوری صدی اہل فرانس نے قربانیاں دے کر ایک جمہوری انقلاب کی بنیاد رکھی اور یوں انسانیت نے مطلق العنان بادشاہت اور موروثی تاج و تخت سے گلو خلاصی کی طرف پہلا قدم رکھا اور دیکھتے دیکھتے دو صدیوں میں یہ تمام روئے ارضی پر پھیل گیا ہے اگرچہ اس انقلاب سے جو حقیقی آزادی، اخوت، مساوات اور انصاف کی توقعات تھیں وہ آج تک پوری نہیں ہو سکیں۔ فرانس کا یہ انقلاب 1789ء میں آیا اور تقریباً 1800ء تک اس میں جنگ و جدال کا سلسلہ جاری رہا۔

امریکہ کی جنگ آزادی

اٹھارھویں صدی ہی وہ اہم صدی ہے جس میں امریکہ میں آ کر بسنے والوں یا یوں کہیے کہ لاکر بسائے گئے لوگوں نے برطانیہ سے جنگ کی اور انگریز کی غلامی سے نجات حاصل کی۔ دنیا کی نادیدہ قوت صہیونی طاقت نے 1453ء میں، عظیم مسلمان سلطان محمد کے ہاتھوں یورپ کے مشرق میں قسطنطنیہ کی فتح کے بعد، امریکہ کا رخ کیا تھا۔ یہودی اپنی شرارتوں کے سبب آسٹریا، اٹلی، جرمنی، فرانس الغرض سب جگہ سے نکالے گئے لوگ تھے جو بالآخر امریکہ جا کر آباد ہوئے۔ امریکہ کی جنگ آزادی میں یہود پیش پیش تھے اور برطانوی استعمار سے بظاہر آزادی — دراصل صہیونی مقاصد کے حصول کے لئے اس نئی سرزمین — امریکہ کی علیحدگی تھی تاکہ وہ یہاں اپنے انداز میں پروان چڑھ سکیں اور معلوم دنیا کی نگاہوں سے اوجھل ہو کر اپنے مکروہ اور

مذموم مقاصد کو فروغ دے سکیں اس جنگ آزادی میں کامیابی کے نتیجے میں یہود — صہیونی قوت امریکہ کی سیاست، تجارت، حکومت میں ایسے گھسے کہ جیسے اب ان کے سوا کوئی دوسرا ہے ہی نہیں۔ یہ آزادی کا سال 1776ء ہے جو امریکہ کے ایک ڈالر کے نوٹ کی پشت پر کندہ ہے۔ آزادی کے صہیونی قوت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ امریکی کرنسی ایک ڈالر کے نوٹ کے پیچھے 1776ء کو آزادی (FREEDOM) کے نام اس لئے منسوب کیا گیا تھا کہ اس کے ساتھ ہی ORDO NOVO SECULARIUM یعنی نیا عالمی سیکولر آرڈر گویا یہ آزادی عوامی حقوق، عدل و انصاف وغیرہ کے لئے نہیں تھی بلکہ یہود اپنے مخصوص مقاصد کے لئے عوام کو استعمال کر رہے تھے اور آج بھی کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور بات جو ایک ڈالر کے نوٹ پر دیکھی جاسکتی ہے وہ ہے — اہرام مصر کا نقشہ اور اس پر بنی ہوئی ایک ”آنکھ“ یعنی عالمی معاملات پر صہیونی نظر — عالمی مالیاتی سودی نظام کے ذریعے عالمی وسائل پر قبضہ اور ملٹی نیشنلز کے ذریعے اور IMF اور WB کے ذریعے دنیا کی معیشت اور ممالک کا کنٹرول۔ عصر حاضر میں جس فتنہ نے سراٹھایا ہے اور امریکی اقتصادیات کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے اس کا بیج اسی اٹھارویں صدی میں بویا گیا تھا۔

برطانیہ

امریکہ بطور کالونی کے برطانیہ کے ہاتھ سے نکل جانے اور فرانس میں انقلاب کے نتیجے میں عوامی حکومت اور عوامی حقوق کا چرچا ہوا تو برطانوی عمائدین کو بھی فکر دامن گیر ہوئی کہ کہیں یہ فکر برطانیہ بھی نہ آئے لہذا اس کا پہلے سے تدارک کیا گیا موروثی بادشاہت کے زیر سایہ جمہوریت کا پودا لگا دیا گیا جو صہیونی مقاصد کے حصول کے لیے تاج برطانیہ کی ذمہ داریوں کا احساس دلاتا ہے۔ تاج برطانیہ ہی عیسائیت کے عالمی محافظ، پروٹسٹنٹ فرقہ کا گھر اور یہودیت کی پراسرار سرگرمیوں کا گہوارہ ہے اس سلسلے میں دو مزید کام بھی ہوئے وہ اسی اٹھارویں صدی میں ہیں۔

● پہلے پورے یورپ اور برطانیہ میں رومن لا اور رومن عدالتی نظام چل رہا تھا جو بڑا ظالمانہ، سفاکانہ اور دشمنوں کو ہی نہیں اپنے عوام میں سے ذرا باشعور ہونے والے یا تنقید کرنے والے کے لئے عبرت کا نشان بنا دینا ہوتا تھا۔ تشدد کے طریقے، ایذا رسانی کے آلات، لوہے کے

جنگلے جہاں مجرموں کو جانوروں کی طرح ننگا رکھا جاتا تھا وغیرہ وغیرہ۔ برطانیہ میں پہلا کام یہ ہوا کہ عدالتی نظام کو مہذب بنایا گیا اور عدالتی اور تفتیشی نظام میں سے رومی طریقے نکال دیے گئے بلکہ سابقہ آلات ایذا رسانی — ایک پارک میں لا کر سجا دیے گئے تاکہ لوگ مطالعہ و مشاہدہ کر سکیں، ایک نئے مہذب اور انسان دوست عدالتی و قانونی نظام کی بنیاد ڈالی گئی۔

یہ نظام برطانیہ میں اندرونی طور پر آج بھی جاری ہے اگرچہ برطانیہ اور دیگر یورپی استعماری طاقتوں نے اپنے محکوم ممالک اور نوآبادیوں میں رومی تشدد اور ایذا رسانی کے طور طریقے بعینہ جاری رکھے بلکہ اب بھی جاری ہیں۔ (پہلی جنگ عظیم میں ہندوستان میں ایک مسلمان کو انگریز نے ملک دشمن سرگرمیوں میں پکڑا تو اسے ایک لوہے کے جنگلے میں ننگا بند کر کے جانوروں والے ریل کے ڈبے میں رنگون بھیجا گیا)۔ علامہ اقبال نے کیا خوب کہا تھا:

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام؟

چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر!

دیو استبداد ہے جمہوری قبا میں پائے کوب

تو سمجھتا ہے اسے آزادی کی ہے نیلم پری

— فَاغْتَبِرُوا يَا أُولِيَ الْأَبْصَارِ —

دوسرا کام برطانیہ میں یہ کیا گیا کہ وہاں سابقہ شہری آبادیاں ہماری طرح تنگ و تاریک گلیوں پر مشتمل ہوتی تھیں دوسرے ملکوں اور محکوم ممالک سے لوٹی ہوئی دولت کے انبار آئے تو شہروں میں تجدید اور تعمیر نو کا کام شروع ہوا، مکان گرا کر وسیع سڑکیں بنائی گئیں، پارک، پلازے، سیرگا ہیں، چوک وغیرہ وجود میں آئے۔ یہ کام پورے یورپ میں ایک منظم طریقے پر ہوا اور غالباً صہیونی قوت کے کارپردازوں نے ہی مستقبل کی ضرورت کے پیش نظر کرایا ہے۔ (جیسے لاہور میں اندرون شہر شاہ عالم مارکیٹ کی تعمیر)۔

وسطی ایشیا، عظیم عثمانی سلطنت

یورپ اور مشرقی ایشیا کے درمیان کئی صدیوں سے حائل سب سے بڑی رکاوٹ عظیم عثمانی سلطنت تھی جو تین براعظموں پر پھیلی ہوئی تھی مشرقی یورپ، شمالی اور وسطی افریقہ، مشرق وسطیٰ

اور جنوبی ایشیا بھی عملاً ترک خلیفہ کے ہی ماتحت ہوتے تھے۔

اٹھارویں صدی میں مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ساتھ عثمانی سلطنت بھی زوال پذیر ہو گئی اس لئے کہ تقدیر اہم کے اٹل قانون کے تحت اب مسلمان حکمران شمشیر و سناں کی بجائے طاؤس و رباب کے رسیا ہوتے جا رہے تھے۔

یورپی استعمار اٹھا تو عثمانی سلطنت کو اپنے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ تصور کیا اور متعدد بار اس سے ٹکرانے کی ناکام کوششیں کیں مگر ایک طویل عرصے تک اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ تاہم اٹھارویں صدی کے آخری عشرے کے آنے تک وسطی افریقہ اور شمالی افریقہ کے بیشتر علاقے اطالویوں اور فرانسیسیوں کے قبضے میں جا چکے تھے۔ اگرچہ ایشیا میں عثمانی سلطنت کا رعب داب تا حال قائم تھا۔

جنوبی ایشیا — مغلیہ سلطنت

مغلیہ سلطنت میں سب سے مستحکم حکمرانی اورنگ زیب عالمگیر کی ہے، پچاس سالہ دور حکومت میں کابل سے برما تک حکومت کی اور اسلامی شریعت کے نفاذ کے ساتھ کئی دیگر اصلاحات بھی کیں۔ ذمیوں اور غیر مسلموں کے حقوق خاص کا خیال رکھا البتہ ہندو سرپرستی میں چلنے والی تحریکوں کو بھرپور طریقے سے کچل دینا بھی اسی حکمران کا کام تھا۔ سکھ تحریک بظاہر ہند ہی تحریک تھی لیکن پنجاب میں یہ ہندو ذہن کی پیداوار عسکری تحریک تھی اسی لئے اس کے سارے گرو روزاؤں سے مسلمان حکمرانوں کے خلاف برسر پیکار ہی رہے۔ آخری گرو گوبند سنگھ اورنگ زیب ہی کے دور میں مارا گیا۔ ہندو مرہٹہ قوت بھی جنوبی ہند سے — اپنی بے حیا اور حیوانی ثقافت کے احیاء اور فروغ کا جذبہ لے کر اٹھی مگر — انسان دشمن اور حیوانی سوچ کی وجہ سے اورنگ زیب ہی کے ہاتھوں شکست پر شکست کھائی، اورنگ زیب ان قوتوں سے نبرد آزمائی میں 25 سال مسلسل دارالحکومت سے باہر رہے اور گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر جنگ کے ساتھ وسیع حکومت کے انتظام بھی چلاتا رہے۔ اس کا ایک نتیجہ تو یہ ہوا کہ ملک دشمن اور اسلام دشمن قوتوں کا قلع قمع ہو گیا مگر ایک بہت بڑا نقصان یہ ہوا کہ ہندوؤں کے چالاک ذہن اور مسلمانوں کے اندر منہی رجحانات رکھنے والی قوتوں کے گٹھ جوڑ سے ایک ایسا فتنہ شروع ہو گیا جس نے اورنگ زیب کے راہی ملک عدم

ہوتے ہی سراٹھالیا۔ یہ فتنہ طویل عرصہ سے زیر زمین تھا اور اب جوان ہو چکا تھا۔ اورنگ زیب خود قرآن و حدیث کا عالم اور باعمل مسلمان تھا۔ فتاویٰ عالمگیری کی تیاری و نفاذ اس کا ثبوت ہے۔ تاہم فتنہ گروں نے قیامت ڈھادی۔ اورنگ زیب کے بیٹے نے (جو خود بھی عالم فاضل تھا) تخت نشین ہوتے ہی یہ اعلان کر دیا کہ میں خوب غور و خوص کے بعد اس رائے پر پہنچا ہوں کہ شیعہ مذہب برحق ہے اور خود شیعہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس سے جو ہونا تھا وہی ہوا کہ خاندانِ مغلیہ داخلی خلفشار کا شکار ہو گیا اور دشمن کو باہر سے حملہ کر کے فتح کرنے کی ضرورت ہی نہ رہی۔ شاہی خاندان کے افراد خود بھی آپس میں لڑتے قتل ہوتے رہے اور بادشاہ بدلتے رہے، ملک کمزور ہو گیا علاقائی قوتوں نے سراٹھایا اور مرکز گزیر۔ جانات کا دور دورہ ہوتا چلا گیا۔

ان حالات میں ایران کے ایک مقتدر بادشاہ نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کر دیا۔ (1739ء) اور دہلی کو خوب تاخت و تاراج کیا۔ عقل حیران ہے کہ مغلیہ خاندان کے مذہب شیعہ کو قبول کر لینے کے بعد تو ایران کو مغلوں کی مدد کرنا چاہیے تھی کہ وہ ان کے اقتدار کو مستحکم کرے اور مرکز گریز مرہٹہ قوت اور دیگر علاقائی نوابوں، وڈیروں کی سرکوبی کر کے ان کے زیر نگیں کرے تاکہ دنیا میں ایران کے ساتھ ساتھ عظیم مغلیہ سلطنت بھی شیعہ مذہب کے ساتھ کامیابیوں اور کامرانیوں کا سفر جاری رکھ سکے تاہم جو کچھ ہوا وہ عجیب ہے کہ نادر شاہ نے اصفہان سے اٹھ کر دہلی پر حملہ کیا اسے تاخت و تاراج کیا لوٹا، قتل عام کیا اور مال و دولت سمیٹ کر واپس چلا گیا۔

احمد شاہ ابدالی اس نادر شاہی حملے میں اس کے ساتھ آیا تھا اور فوج میں افسر تھا۔ نادر شاہ کے قتل (جون 1747ء) کے بعد اس کی سلطنت کے ٹکڑے ہو گئے اور افغان قبائل نے متفقہ طور پر احمد خان کو افغانستان کا حاکم قرار دیا جس سے اس کے اقتدار کا راستہ ہموار ہو گیا۔ اس نے احمد شاہ کا لقب اختیار کیا اور احمد شاہ ابدالی کے نام سے مشہور ہوا۔

یہ وہ عالمی و ملکی حالات تھے جس میں حضرت احمد شاہ ابدالی حکمران بنے اور انہیں ایک وسیع علاقے پر اپنے اقتدار اور امت مسلمہ کے مفادات کی خاطر بڑی پُر خطر اور عظیم کارروائیاں کرنا پڑیں۔

احمد شاہ ابدالی 1739ء کے دہلی پر حملے کے وقت نادر شاہ کے ساتھ تھا اور قندھار کا

حاکم ہونے کی وجہ سے ہندوستان کے حالات اور سیاسی اتار چڑھاؤ سے واقف تھا لہذا وہ علاقے کے عمائدین، ان کے خیالات، سیاسی و عسکری قوتوں کے عزائم پہچانتا تھا بلکہ مستقبل میں ہونے والے واقعات کا اندازہ لگا رہا تھا۔

احمد شاہ ابدالی نے مجموعی طور پر ہند پر سات حملے کیے 1748ء میں محمد شاہ رنگیلا کے دور میں لاہور اور سرہند پر قبضہ کر لیا۔ 1749ء میں دوسرا حملہ کیا۔ 1750ء میں پھر آیا اور اس علاقہ کی مال گزاری 14 لاکھ روپے سالانہ وصول کرنا شروع کی۔ جب پنجاب سے افراتفری کی وجہ سے مال گزاری وصول نہ ہوئی تو اس نے 1751ء میں تیسرا حملہ کر دیا اور لاہور کے علاوہ ملتان پر بھی قبضہ کر لیا۔ چوتھے حملہ میں وہ دہلی پہنچ گیا۔ 1757ء میں اس نے اپنے بیٹے تیمور شاہ کو لاہور کا گورنر مقرر کیا۔ دہلی اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں مرہٹہ قوت نے زور پکڑ لیا تھا ادھر پنجاب میں سکھ قوت بھی سر اٹھا رہی تھی مرہٹوں اور سکھوں نے مل کر پنجاب سے افغانوں کو نکال دیا۔ پھر اس نے 1759ء میں پانچویں بار حملہ کیا اور مرہٹوں اور سکھوں کو نکال کر پنجاب کو باقاعدہ افغان حکومت میں شامل کر لیا۔ 1761ء میں احمد شاہ ابدالی نے ہند پر سب سے بڑا حملہ کیا اور کامیابی حاصل کی۔

مرہٹہ قوت کے زور پکڑنے اور مغلیہ سلطنت کے کمزور ہونے سے مسلمانوں اور اسلام کو سخت خطرات درپیش تھے اور ہندو مسلمانوں کے خلاف سخت نفرت کے جذبات رکھتے تھے جس سے خطرہ تھا کہ مرہٹوں کے غلبہ سے کہیں جوش انتقام میں مسلمانوں کا ہند سے ایسے ہی خاتمہ نہ ہو جائے جیسے سقوطِ غرناطہ کے بعد (1492ء) سپین سے ہوا تھا حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ مردِ درویش نے اس خطرہ کے پیش نظر احمد شاہ ابدالی کو باقاعدہ خط لکھ کر اسلام کی حفاظت اور مسلمانوں کی مدد کی درخواست کی تھی، یہ ایک سخت مہم تھی وہ ابھی پس و پیش کر رہا تھا کہ اسے خواب آیا اور وہ خواب اس نے اپنی والدہ زرغونہ بیگم کے گوش گزار کیا جس پر اس کی والدہ نے فرمایا کہ جان و ملک کا خطرہ لے کر بھی اسلام کی سر بلندی اور مسلمانانِ ہند کی حفاظت کے لیے بیٹے فوراً سفر کرو، اللہ تعالیٰ تمہیں فتح دے گا۔

تاریخ گواہ ہے کہ مرہٹہ قوت کے ساتھ احمد شاہ ابدالی کا یہ ٹکراؤ 1761ء میں پانی پت

کے میدان میں ہوا اور پانی پت کی تیسری لڑائی کے نام سے مشہور ہے۔ احمد شاہ ابدالی 12-20 ہزار فوج کے ساتھ آئے تھے مقامی مسلمانوں نے شامل ہو کر مسلمانوں کی تعداد 70-80 ہزار بنا دی جبکہ مرہٹہ قوت 3 لاکھ کی نفری پر مشتمل تھی۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے خلوص کی وجہ سے مدد فرمائی اور مرہٹہ قوت کو شکست فاش ہوئی کہ وہ ایک صدی تک دہلی کے آس پاس سر نہیں اٹھا سکے۔

احمد شاہ ابدالی نے 1764ء میں بھی ہند پر ایک اور حملہ کیا اور آخری بار 1767ء میں ہند پر حملہ آور ہوا اور سکھوں کو مغلوب کرنے کی کوشش کی تاہم یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔

احمد شاہ ابدالی عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے اب لمبے اسفار کے قابل نہ تھے ملکی حالات بھی دگرگوں تھے۔ بالآخر اس مردِ درویش نے 1773ء میں وفات پائی۔

ع خدارحمت کنداں عاشقان پاک طینت را

اٹھارھویں صدی عیسوی بحر ہند میں برطانوی استعماری قوت کی اٹھان

بحری طاقت میں اضافہ کے ساتھ صنعتی ترقی، نئے نئے علاقوں سے لوٹ مار اور عسکری و سائنسی برتری نے یورپ کو ایک ”خمار“ میں مبتلا کر دیا اور اس طرح وہ دنیا کی باقی اقوام کے مقابلے میں SUPERIORITY COMPLEX کا شکار ہو گیا۔ اٹھارھویں صدی میں ہی کچھ خاص حالات تھے کہ نادیدہ قوتوں اور صہیونی ذہن، جو برطانیہ اور تاج برطانیہ کو اپنے خاص مقاصد کے لئے آگے بڑھا رہا تھا، نے یورپ کی دیگر اقوام (فرانسیسی، اطالوی وغیرہ) کے مقابلے میں برطانوی بالادستی کا اہتمام کر دیا۔ (اس کی تفصیل اگلے صفحات میں آئے گی)

برطانوی عسکری قوت نے جنوبی ایشیا اور بحر ہند میں آنا جانا شروع کیا تو پہلے خلیج فارس کے دہانے پر قدم رکھے۔ پھر سندھ کے ساحلی علاقوں کو اہمیت دی اور بعد ازاں بنگال کے ساحل پر جا ڈیرے جمائے۔ دو تین صدیوں میں بے ضرر تجارت سے اٹھ کر ”ایسٹ انڈیا کمپنی“ (قیام 1600ء) نے اب چھاؤنیاں بنانی شروع کر دیں اور اسلحہ جمع کرنا شروع کیا۔ یورپی اور صہیونی قوت کے پاس علاقوں کو فتح کرنے کے لئے عسکری قوت کے برعکس چالاکی، بددیانتی، مقامی لوگوں کو خرید کر ساتھ ملانا، غداری پر آمادہ کرنا اور پھر وعدہ خلافی کرنا، علاقائی لڑائیوں میں کمزور کا ساتھ دے کر مقتدر طبقہ کو ہٹا دینا جیسی خصلتوں کا سرمایہ تھا جسے وہ خوب کامیابی سے استعمال کرتے

رہے اور آج بھی عالمی سطح پر کر رہے ہیں۔

ایک طرف انہوں نے عثمانی سلطنت کے دور دراز علاقے جزیرہ نمائے عرب کے جنوبی علاقے میں یمن کے پاس اومان اور اس کے آس پاس کے علاقے پر یہی طریقہ اپنا کر نفوذ کا راستہ بنایا۔ دوسری طرف بنگال میں مقامی لوگوں سے لڑائیاں جھگڑے، علاقوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا تاکہ ان کا اثر و رسوخ بڑھتا جائے۔ تجارتی کمپنی ہونے کے ناطے ان سے بہت سے لوگ کاروباری فائدہ اٹھاتے تھے ملازمت کرتے تھے ان کے ذریعے مقامی لوگوں کو خریدنے اور عہدے دینے کا کام بھی جاری رکھا تھا۔ 1757ء میں بنگال کے حاکم نواب سراج الدولہ نے جب محسوس کیا کہ برطانوی سامراج پھیل رہا ہے تو اس نے اس کو محصور کرنے کی کوشش کی لیکن وہ جنگ پر آمادہ ہو گئے اور سراج الدولہ ہی کے ناراض امیروں اور نمائندوں کو ساتھ ملا کر اور آئندہ حکمرانی کا لالچ دے کر جنگ پلاسی میں نواب سراج الدولہ کو شکست سے دوچار کر دیا۔ اس طرح ایسٹ انڈیا کمپنی کو جنوبی ایشیا میں عسکری طور پر بھی قدم جمانے کا موقع مل گیا میر جعفر اور میر قاسم نے غداری کی اگرچہ ان کا انجام خود بھی کوئی اچھا نہ ہوا۔

ان حالات میں ہند کا عمومی ماحول بدل رہا تھا اور دہلی دارالحکومت میں بھی ان سرگرمیوں کے اثرات شدت سے محسوس کیے جا رہے تھے۔

یورپی طاقت جرمی اور عالم اسلام

اٹھارھویں صدی تک یورپی صنعتی طاقتیں بظاہر ایک براعظم کے اندر ایک سوچ کی حامل نظر آتی تھیں مگر دراصل استعماری ہتھکنڈوں کے استعمال اور غیر یورپی اقوام کو لوٹنے میں سب یورپی طاقتیں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتی رہتی تھیں برطانیہ کو چاروں اطراف سمندر لگتا ہے۔ فرانس کو بھی شمال مغرب اور جنوب میں سمندری ساحل میسر تھے اٹلی کے جنوب میں بھی سمندر ہے اور ان کے اپنے سمندری راستے میں پرتگال تو ویسے ہی الگ تھلگ مغربی یورپ کا ملک ہے جبکہ جرمی تین طرف سے خشکی سے گھرا ہوا ہے اور صرف شمال میں سمندر لگتا ہے اور وہ قطب شمالی کے قریب ہونے کی وجہ سے سمندری تجارت کے لیے سارا سال مناسب نہیں رہتا۔

اسی لئے برطانیہ تو استعماری قبضہ اور لوٹ کھسوٹ میں نمبر 1 تھا ہی، فرانس، اٹلی نے بھی جنوب کی طرف سفر کر کے شمالی افریقہ کے قریبی کے علاقے ہتھیائے اور وسطی افریقہ کے وسیع علاقوں پر بھی قبضہ کر لیا جبکہ برطانیہ نے شمالی امریکہ، کینڈا، جنوبی امریکہ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، مشرق بعید کے کئی ممالک پر قبضہ جمایا اور جنوبی ایشیا پر بھی قبضہ کرنا شروع کر دیا۔

ان حالات میں جرمنی کو ان مغربی طاقتوں کے مقابلے میں سمندری راستوں سے نکل کر کھلے سمندر میں مقابلہ اور ملکوں اور جزیروں پر قبضہ کرنا ممکن نہیں رہا۔ اسے ایک آسانی حاصل تھی جس سے اس نے بھرپور فائدہ اٹھایا کہ یورپی استعماری طاقتوں (فرانس، اٹلی اور برطانیہ) نے چونکہ بیشتر علاقے مسلمانوں سے چھینے تھے لہذا مسلمانوں سے ان کی دشمنی ظاہر و باہر تھی جبکہ جرمنی کے مشرق میں عثمانی سلطنت کے یورپی مقبوضات اور وہاں سے ہو کر ہند تک پوری مسلم دنیا جرمنی مصنوعات کی منڈی کے لئے کھلی تھی۔ جرمنی نے مسلم دنیا سے تعلقات بنائے اور اس پورے وسیع مسلم علاقے میں اپنا اثر و رسوخ بڑھا لیا۔ لہذا پوری عثمانی سلطنت مشرق وسطیٰ، جزیرہ نمائے عرب ایران اور افغانستان تک جرمنی کی مصنوعات کو زمینی راستے میسر تھے اور وسیع مارکیٹ میسر تھی جس سے اس نے خوب فائدہ اٹھایا اور اپنی مصنوعات اور ٹیکنالوجی کو فروغ دیا۔

پہلی جنگ سے ذرا قبل ترکی سے حرین شریفین تک ریلوے لائن کا منصوبہ بنا تو عثمانی سلطنت کے زیر اہتمام یہ منصوبہ جرمن انجینئروں نے ہی سرانجام دیا۔ وہ تو پہلی جنگ عظیم کی وجہ سے یہ ریلوے لائن صرف مدینہ منورہ تک آئی تھی کہ منصوبہ ختم کر دیا گیا۔ مدینہ منورہ کا اسٹیشن بھی ہے اور شمالی علاقہ جات کے لئے ریلوے سروس بھی ہے۔ اسی وجہ سے ترکی، مشرق وسطیٰ، سعودی عرب میں دو عشرے پہلے تک جب تک پرانی شہری آبادی کا نظام تھا جرمن مصنوعات از قسم WC، بیسن (BASIN) پانی کی تقسیم کے پائپ اور فننگز اور دیگر اشیاء سب جرمن ساختہ نظر آتی تھیں جبکہ موجودہ وسیع حرین اور جدید طرز تعمیر کی بدولت اب امریکن مصنوعات کا دور دورہ ہے۔

افغانستان کے بادشاہ احمد شاہ ابدالی کے زمانے میں جرمن ماہرین اور جرمن مصنوعات افغانستان تک پہنچ چکی تھیں اور جرمن ساختہ جنگی سامان بھی عام تھا۔ احمد شاہ ابدالی نے جوہند پر کئی حملے کیے اور بالخصوص شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی دعوت پر جو بڑا حملہ کیا اس میں جرمن ساختہ

تو ہیں بھی اپنے ساتھ لا کر استعمال کی تھیں۔ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت شامل حال تھی مگر بظاہر — مرہٹہ قوت کے مقابلے میں ٹیکنالوجی کا واضح فرق تھا جس کی وجہ سے مسلمانوں کو فتح ہوئی اور مرہٹہ قوت کو شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ انہی توپوں میں سے ایک توپ کئی ہاتھوں سے ہوتی ہوئی لاہور کی مال روڈ پر پنجاب یونیورسٹی اولڈ کیمپس کے سامنے نصب ہے جو 'بھنگیوں کی توپ' کہلاتی ہے۔

یہ عظیم مسلمان اور باعمل حکمران جس نے اسلام کی حفاظت و آبیاری کی خاطر ہند پر حملہ کیا اور اپنے سے کئی گنا زیادہ مرہٹہ قوت سے ایمانی قوت کی بنا پر ٹکرا گیا — احمد شاہ ابدالی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ ذاتی کردار کے اعتبار سے بھی احمد شاہ ابدالی نہایت خدا ترس، غمگسار، عدل و انصاف سے محبت رکھنے والا، عوام کی بہبود میں دلچسپی رکھنے والا اور اسلام کے دشمنوں اور اللہ تعالیٰ کے دشمنوں سے کوئی سمجھوتہ نہ کرنے والا حکمران تھا۔

ع آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پر اور اس کے مخلص ساتھیوں پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے (آمین)



ایک عظیم خبر

عظیم فاتح احمد شاہ ابدالی رحمۃ اللہ علیہ نے 1761ء میں پانی پت کے میدان میں مرہٹہ قوت کو شکست فاش دے کر ان کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ مگر بعض مجبور یوں کی بنا پر اسے واپس قندھار کا سفر کرنا پڑا اور وہ مرہٹہ قوت کا تعاقب کر کے اس کا صفایا (MOPPING-UP OPERATION) نہ کر سکا۔ اللہ کو یہی منظور تھا۔

دو صدیوں میں حالات بدل گئے۔ بیسویں صدی کے اواخر میں قندھار سے ایک اور مسلم قوت اٹھی ہے اور پہلے روس اور اب امریکہ کے مقابلے میں کامیابیاں حاصل کر رہی ہے۔ ہمارے نزدیک اسی قوت کو قندھار سے اٹھنے والے احمد شاہ ابدالی کا بقایا کام یعنی جنوبی ایشیا میں اخلاق دشمن اور انسان دشمن مرہٹہ قوت کا خاتمہ کرنا ہے۔

پیغمبر آخرا الزمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک فرمان میں اشارہ ہے خراسان سے اٹھ کر ہند سے ٹکرانے والی قوت کا۔ اور اس غزوہ کو غزوة الہند کہا گیا ہے۔ اگر ایسا ہو گیا (جس کے آثار اب واضح ہیں) تو شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی پیش گوئی، حضرت علامہ اقبال کا قیام پاکستان کا مقصد اور فرزند اقبال کی آرزو یقیناً پوری ہو کر رہے گی اور یہ دن اب دور نہیں ہیں۔

14

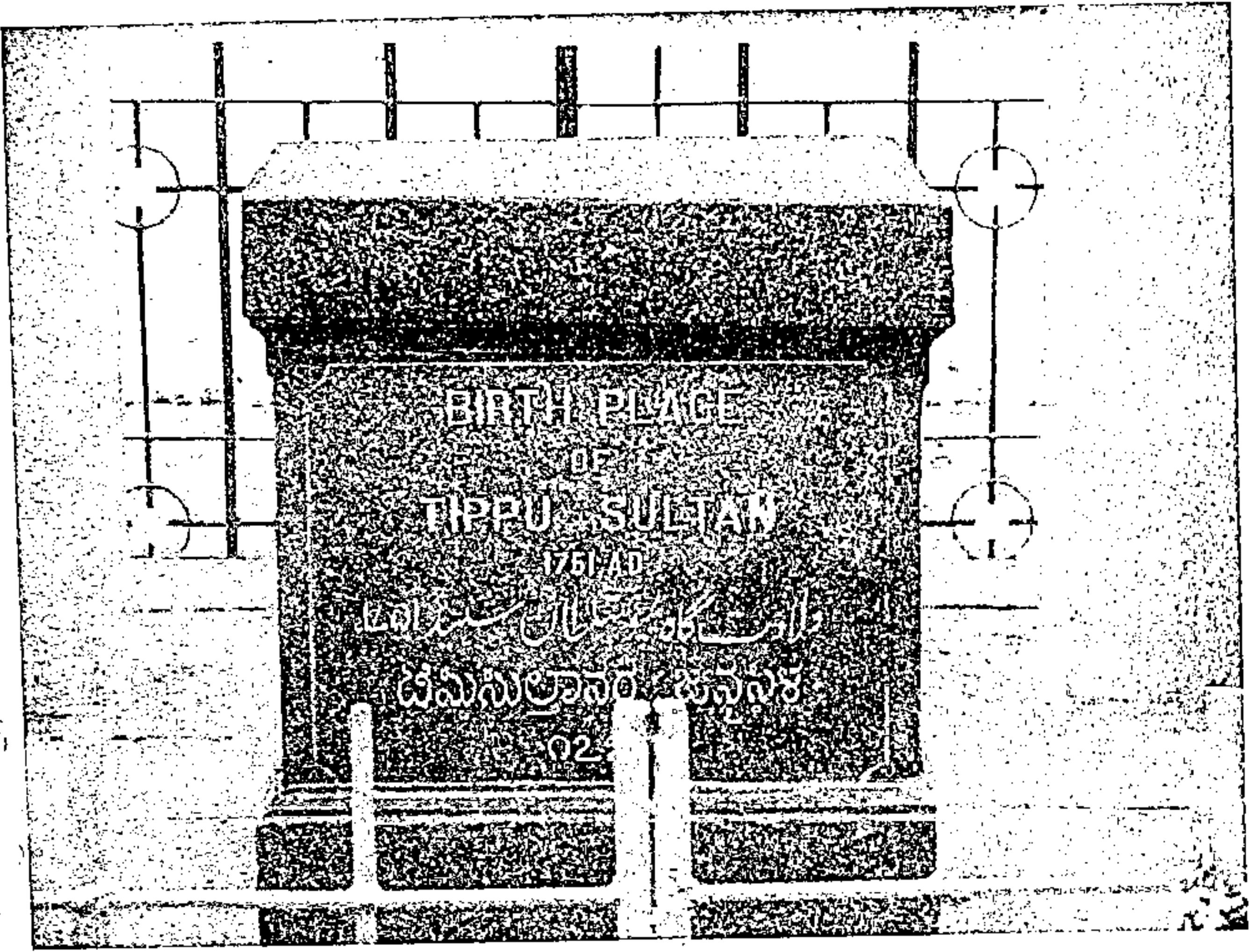
مسلم جنیل، شیر میسور،

برطانوی استعمار کے راستے کی چٹان

سلطان فتح علی ٹیپو شہید

رحمۃ اللہ علیہ

ولادت: 1163ھ/1750ء دیون ہلی
○ 1782ء میں سلطنت خداداد میسور پر تخت نشین ہوئے
وفات: 1213ھ/1799ء سرنگاپٹم، لال باغ



جائے ولادت ٹیپو سلطان شہید رحمۃ اللہ علیہ دیون پالی



آخری آرامگاہ ٹیپو سلطان شہید رحمۃ اللہ علیہ سرنگاپٹم، لال باغ

اٹھارھویں صدی کے پُر آشوب زمانے میں سلطان حیدر علی والی میسور کے ہاں نومبر 1750ء میں پیدا ہوئے سلطان حیدر علی بھی ملت اسلامیہ کی بھی خواہی اور حفاظت کے لئے زندگی بھر برطانوی استعماری طاقت ایسٹ انڈیا کمپنی کے لٹیروں سے لڑتا رہا اور سلطان فتح علی بھی باپ کے مشن کی تکمیل کے لئے برطانوی زعماء کے لئے ڈراؤنا خواب بنا رہا بالآخر انگریزوں کی عیاری اور ہندو کی مکاری کی وجہ سے بے دست و پا ہو کر 4 مئی 1799ء کو مردانہ وار شہادت کا جام نوش کیا۔

بنا کردند خوش رسے بخاک و خون غلطیدن

خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را

اٹھارھویں صدی کے ساتویں عشرے (1770ء-1761ء) میں جنوبی ایشیا میں حالات جس رُخ پر جا رہے تھے احمد شاہ ابدالی کے حملے کے نتیجے میں برپا ہونے والی پانی پت کی تیسری لڑائی میں مرہٹہ قوت کی شکست فاش سے یکسر بدل گئے۔ پہلے مرہٹہ قوت جنوبی ہند سے اٹھ کر مرکز دہلی پر قابض ہو کر پورے ہند پر حکومت کے خواب دیکھ رہی تھی جو پانی پت کے میدان میں ایک ہی ابدالی ضرب سے چکنا چور ہو گئے۔ اس سے مرہٹہ قوت پسپا ہو کر واپس جنوبی ہند تک محدود ہو گئی۔ اس عمل کے کئی اثرات سامنے آئے جن میں سے چند درج ذیل ہیں:

1- جنوبی ایشیاء کے مغربی علاقوں (حالیہ بلوچستان اور سندھ) میں علاقائی قوتوں اور سرداروں نے اپنی سلطنتیں قائم کر لیں۔ بلوچستان میں سرداری نظام مستحکم ہوتا گیا اور سندھ میں کلہوڑوں اور تالپوروں کی حکومت آگئی وہیں سے عباسی خاندان نے پنجاب میں قدم جمائے اور عباسی سلطنت کی بنیاد رکھی جو بعد میں ریاست بہاولپور کہلائی۔ موجودہ سرحد، پنجاب میں سکھ قوت

سراٹھارہی تھی مگر مرہٹوں کی طاقت کا مقابلہ نہ کر سکنے کی وجہ سے دہلی ہوئی تھی۔ مرہٹہ قوت کے شکست کھا جانے کے بعد اور اس کی کاروائیاں صرف جنوبی ہند تک محدود ہو کر رہ جانے کی وجہ سے اب وہ ”خود مختار“ ہو کر سامنے آئی اور جلد ہی ایک ”سکھ حکومت“ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئی جو 1789ء سے 1846ء تک قائم رہی۔

2- ملک بھر میں بالعموم سلطنت مغلیہ کے دور کے پنج ہزاری اور دس ہزاری منصب والے علاقائی سرداروں نے اپنے علاقوں میں اپنی سلطنتیں بنالیں اور مرکز سے برائے نام تعلق رہ گیا جو وقت کے ساتھ ساتھ ختم ہو گیا۔ حتیٰ کہ انگریز نے آ کر پورے ہندوستان پر قبضہ کیا تو یہ ساری ریاستیں اور علاقے انگریزی اقتدار کے زیر سایہ آ گئے۔ برطانوی سامراج کے اقتدار کے دوران ان ریاستوں کی تعداد 600 کے لگ بھگ تھی۔

3- ہندو مرہٹہ قوت نے مسلمانوں سے شکست کھا کر جنوبی ہند تک رہنے کا فیصلہ کر لیا اور اپنی حکمت عملی اب مسلمانوں سے براہ راست لڑائی کی بجائے اپنی قدیم چانکیہ سیاست کے مطابق انگریز کی ہمنوائی اور مدد کے ذریعے مسلمانوں کو زیر کرنے اور ان کے اقتدار ختم کو کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔ برطانوی سامراج 1753ء میں جنگ پلاسی میں سراج الدولہ کو میر جعفر کی سازشوں کے ذریعے شکست دے چکا تھا اس کو ہند میں اپنے مکروہ عزائم کی توسیع اور ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار وسیع کرنے کے لئے مزید غداروں کی ضرورت تھی جو مسلم اقتدار کے خلاف ان کا ساتھ دیں۔ ہندو مسلمانوں سے ویسے ہی بیر رکھتا تھا۔ لہذا مرہٹہ قوت نے موقع غنیمت جانتے ہوئے برطانوی سامراج کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا۔

بنیادی طور پر ہندو ذہن کا یہ فیصلہ دراصل دیکھو اور انتظار کرو WAIT AND SEE کی طرح کا تھا وہ پہلے مسلمانوں کے ماتحت تھا اب برطانوی سامراج کے ماتحت چلا گیا معاملہ صرف CHANGE OF MASTERS کا تھا بنیادی طور پر نوعیت کا فرق نہیں تھا۔

4- ہندو سیاست کے اصول یورپی استعماری قوت کے اصولوں سے بہت حد تک ہم آہنگ تھے۔ (اور آج بھی ہیں) لہذا اس دوستی کو فروغ ہوتا چلا گیا اور ہندو اپنے مفادات کے تحفظ کے ساتھ سامراج دوستی میں آگے بڑھتا چلا گیا جس سے اسے مفاد بھی مل رہے تھے اور ”مسلم دشمن“

پالیسی بھی کامیاب ہو رہی تھی کہ مسلم اقتدار کا خاتمہ ہو رہا تھا۔ جس سے اس کے دل میں لگی انتقام کی آگ میں کمی سے انہیں سکون مل رہا تھا۔

5۔ ہندو ذہن کی اس مجموعی سوچ کے تحت ہی جنوبی ہند میں مرہٹوں نے سلطان حیدر علی اور سلطان فتح علی کے مراعات یافتہ رعایا ہوتے ہوئے بھی درپردہ برطانوی سامراج کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا تا کہ الزام بھی نہ آئے اور مسلم اقتدار کا خاتمہ بھی ہو جائے نیز — مسلم اقتدار کے خاتمے پر سامراج سے مراعات بھی سمیٹی جاسکیں۔

اسی سازش کے تحت مرہٹہ قوت نے برطانوی استعمار کے ہاتھ مضبوط کئے نظام حیدر آباد نے بھی اپنے اقتدار کی ضمانت پر فوجی امداد دینے کا وعدہ کر لیا۔ ان حالات میں سلطان حیدر علی جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے توسیعی عزائم اور ہند کے برطانوی سامراج کی غلامی میں جانے کے راستے کی مضبوط چٹان بنا ہوا تھا اور میسور کے کئی معرکوں میں برطانوی جرنیلوں کے دانت کھٹے کر چکا تھا۔ پسپا ہونے پر مجبور ہو گیا سلطان حیدر علی کے مشن کا تذکرہ کئے بغیر اس کے فرزند سلطان فتح علی کے کارنامے اور اولوالعزمی اور شجاعت سامنے نہیں آسکتی باپ کے اسی مشن کو اس نے آگے بڑھایا تھا۔

اٹھارھویں صدی کے آخری عشروں تک برطانوی سامراج اپنے ہی ہم وطنوں فرانسیسی سامراج اور DUTCH سامراج سے نبرد آزما رہتا تھا اور یہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ اس کی سب سے نمایاں مثال تو 1780ء سے 1813ء تک کی برطانیہ اور فرانس کی مصر اور شمالی افریقہ کے علاقے ہیں، جنگیں ہیں۔ اسی چپقلش کا ایک باب وہ ہے جو جنوبی ہند میں کھلا ہوا تھا۔ فرانسیسی سامراج کی برطانیہ سے دشمنی واضح تھی۔ جنوبی ہند میں بنگال سے مغرب کی طرف ساحلی علاقوں پر فرانسیسی چھاونیاں تھیں اور فرانس کی ایسٹ انڈیا کمپنی قابض تھی اور فطری طور پر اپنے عزائم کی توسیع کے لئے کوشاں بھی تھی۔

سیاست اور حکومت میں دشمن کا دشمن دوست بن جاتا ہے سلطان فتح علی نے اپنے باپ حیدر علی کی وفات (1782ء) پر جب اقتدار سنبھالا تو برطانوی سامراج سے فیصلہ کن معرکہ

کے لئے فرانس سے فوجی مدد طلب کی اور اس میں کامیابی بھی ہوئی۔ سلطان فتح علی ٹیپو نے فرانس کے رہنما نیپولین بونا پارٹ کو خط بھی لکھا اور سفارش بھی بھیجی کہ وہ ہندوستان آئے اور برطانوی سامراج کا راستہ روکے مگر 1790ء۔۔ 1800ء کا دور فرانس کے لئے خود بڑا ہنگامہ خیز تھا کہ اس عرصہ میں انقلاب فرانس کی وجہ سے خانہ جنگی اور شورشیں برپا تھیں۔ اور انقلاب کے استحکام کا عمل جاری تھا جو بالآخر 1800ء کے قریب کامیابی سے ہمکنار ہو گیا تاہم ان سالوں میں جب کہ سلطان فتح علی ٹیپو کو مدد کی ضرورت تھی فرانسیسی قیادت جنوبی ہند میں کسی بڑی کارروائی اور مدد کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ لہذا وعدے اور ارادے کے باوجود یہ منصوبہ رُو بہ عمل نہ آ سکا یعنی

تا تریاق از عراق آوردہ شود
سنگ گزیدہ در این مردہ شود

والی کیفیت پیدا ہوگی۔

بچپن سے ہی ٹیپو جری، محنت کش اور صاحب لیاقت تھا۔ اسلامی علوم کے علاوہ عربی، فارسی، انگریزی، فرانسیسی، اردو، تامل، کنٹری جیسی زبانوں پر جلد ہی عبور حاصل کر لیا تھا۔ نیز اس زمانے کے فنون سپہ گری، شمشیر زنی، تیراگنی، نیزہ بازی، تفنگ اندازی اور تیراکی وغیرہ میں کما حقہ مہارت حاصل کر لی تھی اور سن بلوغت کو پہنچتے پہنچتے ٹیپو سلطان حرب و ضرب کے آداب اور رزم و پیکار کے انگریزی طریقوں سے بھی واقف ہو چکا تھا۔

انگریزوں کے خلاف محاذ آرائی ٹیپو سلطان کو ورثہ میں ملی تھی۔ اور سلطان کے کارناموں کا کما حقہ ادراک ممکن نہیں جب تک وہ جنگیں جو اس نے عہد جوانی میں اپنے والد کے دور حکومت میں بھی لڑیں تھی اور دشمنوں کو ہر دفعہ شکستوں سے دوچار کیا تھا ان کا تذکرہ نہ کیا جائے صاحب اسلامی انسائیکلو پیڈیا اس مرحلہ پر یوں رقم طراز ہیں:

”1765ء میں ٹیپو سلطان فوجی زندگی میں پہلی بار ہمارے سامنے آتا ہے۔

جب وہ حیدر علی خان کے ساتھ مالا بار پر حملہ آور ہوتا ہے۔ یہاں اس نے صرف دو

تین ہزار سپاہیوں کے ساتھ دشمن کے ایک بڑے لشکر کو حراست میں لے لیا جس پر

حیدر علی نے خوش ہو کر اسے اپنی محافظ فوج میں شامل کر لیا اور جاگیر عطا کی۔

19 جون 1767ء کو ٹیپو سلطان مدارس اور اس کے مضافات پر چھاپے مار رہا تھا۔ اس وقت انگریز پہلی بار میسور میں حیدر علی پر حملہ آور ہوئے تھے۔ یہاں سے وہ واپس لوٹتے ہوئے ترماپور اور دانم باڑی کی تسخیر میں والد کا ہاتھ بٹاتا رہا۔ نیز آنہ کے محاصرے میں بھی شریک رہا۔

جب انگریزوں نے منگلور (بندر کوڑیال) پر قبضہ کر لیا۔ تو ٹیپو سلطان کو ان کے مقابلے کے لئے بھیجا گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے حیدر علی بھی وہاں پہنچا۔ یہاں انہوں نے عجب چال چلی۔ بیگار میں پکڑے ہوئے بیس ہزار افراد کو لکڑی کی بندوقیں دے کر ہزار ہزار کی ٹکڑی میں انگریزی توپ خانے کے سامنے کھڑا کر دیا۔ اور خود ٹیپو سلطان مورچوں پر حملہ آور ہوا۔ اس محاذ پر فتح یابی کے بعد حیدر علی مدارس کی طرف روانہ ہو گیا اور 4 اپریل 1769ء کو حکومت مدارس کو صلح نامہ لکھنے پر مجبور کر دیا۔ اس سے ویسی ریاستوں میں کمپنی کا وقار گر گیا اور انہوں نے خود کو مضبوط اور مستحکم محسوس کیا۔ حیدر علی انگریزوں سے نمٹ کر واپس آیا تو مرہٹہ فوجیں ترمبک راؤ کی قیادت میں میسور کے دروازوں پر دستک دے رہی تھیں۔ ساونو اور کڑپہ کے سردار بھی ان کے ساتھ تھے۔ اس مرحلے پر ٹیپو سلطان کو حکم ملا کہ وہ مرہٹوں کی رسد کو تباہ کرے۔ چنانچہ اس نے مرہٹوں کے عقب میں موجود تمام کنوؤں اور تالابوں میں زہر ڈلوادیا اور کھیت روند ڈالے۔ اب حیدر علی نے بھی مرہٹوں کے عقب پر چھاپہ مارنا چاہا۔ مرہٹوں کو اس کا علم ہو گیا اور انہوں نے پلٹ کر جنگ شروع کر دی۔ مشیروں کی رائے کے خلاف حیدر علی سرنگا پٹم کی طرف فرار ہو گیا۔ اس افراتفری میں ٹیپو اپنے باپ سے جدا ہو گیا جس سے مرہٹوں نے فائدہ اٹھایا اور ٹیپو کی گرفتاری کا اعلان کر دیا جبکہ حقیقت اس کے برعکس تھی ٹیپو دو دن میں جانثاروں کے ساتھ بھیس بدل کر سرنگا پٹم پہنچ گیا اور دونوں باپ بیٹا ایک ماہ تک وہاں محصور رہے۔ ترمبک راؤ تینتیسویں دن محاصرے سے تنگ آ گیا اور وہاں سے اٹھ کر تنجاور کی طرف چلا گیا۔ 1772ء میں مرہٹوں کے پیشوا مادھوراؤ کی وفات کے بعد دریا پونا کی اندرونی کشمکش سے فائدہ اٹھاتے ہوئے

حیدر علی نے دریائے تنگ بھدر اور کرشنا کے درمیانی علاقے مرہٹوں سے چھین لئے۔ ان میں اکثر مہمات میں ٹیپو بھی شریک رہا۔

1780ء میں انگریزوں سے دوبارہ جنگ چھڑ گئی۔ حیدر علی اور سلطان ٹیپو نوے ہزار فوج کے ساتھ کرناٹک جا پہنچے۔ انگریز سپہ سالار ہیکٹر مزدکانجی ورم پہنچ کر کرنل بیل کا انتظار کر رہا تھا، جو سامان رسد اسلحہ کے ساتھ گنٹور سے آ رہا تھا ٹیپو سلطان کو بیلی پر حملہ کرنے کیلئے بھیجا گیا۔ سلطان نے بیلی کو کانجی ورم سے پندرہ میل پرے بری طرح شکست دے کر قید کر لیا۔ بیلی کی شکست کے بعد اعتراف کیا گیا کہ یہ شدید ترین ضرب تھی۔ جو ہندوستان میں انگریزی قوت پر لگی عقب سے خبر ملی کہ انگریز فوجیں ساحل مالا بار پہنچ رہی ہیں۔ چنانچہ سلطان فوراً آ پلٹا اور ریال گھاٹ کا محاصرہ کر لیا انگریز اس کے پہنچنے سے پہلے ہی پال گھاٹ خالی کر کے پونانی پہنچ گئے۔ ٹیپو سلطان نے پونانی کا بھی محاصرہ کر لیا۔ مگر ابھی وہ حملہ نہ کر پایا تھا کہ حیدر علی کے انتقال کی خبر ملی۔“

حیدر علی کا انتقال اور سلطان ٹیپو کی تخت نشینی

صاحب شاہکار اسلامی انسائیکلو پیڈیا کے بقول:

”حیدر علی کی 7 دسمبر 1782ء کو ٹیپو سلطان کو خبر ملی اور وہ اسی وقت روانہ ہو گیا۔ 25 دسمبر 1782ء کو وہ چکموور پہنچ گیا، جہاں اس کا لشکر ٹھہرا ہوا تھا اس نے تمام ماتمی رسوم کی ممانعت کر دی اور 20 محرم 1197ھ 26 دسمبر کو خاموشی کے ساتھ مسند نشینی کی رسم ادا ہوئی۔ تخت نشینی کے وقت ٹیپو سلطان کی سلطنت دکن میں شمالی طرف دریائے کرشنا، جنوبی سمت ریاست ٹراونکور، مشرق میں مشرقی گھاٹ اور مغرب میں ساحلی سمندر تک پھیلی ہوئی تھی۔ آبادی، زر خیزی اور حسن انتظام کی بدولت یہ ایک شاندار سلطنت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزوں کے علاوہ مقامی ہمسائے مرہٹے اور نظام حیدر اس علاقے کو ہتھیالینے کی فکر میں تھے۔ مگر دوسری طرف اس علاقے کا فرمانروا ایک ایسا سلطان تھا۔ جو نہ صرف موروثی طور پر جری اور مجاہد تھا بلکہ دور شہزادگی میں بھی عزم و حوصلے اور تدبیر کی داد لے چکا تھا۔“

عالمی برطانوی سامراج سے پنجہ آزمائی

جنوبی ہند کے مخصوص حالات، ہندوؤں اور نظام حیدرآباد کی ریشہ دوانیوں اور فرانس کی طرف سے خاموشی کے باوجود اس مرد مجاہد نے تنہا برطانوی سامراج کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اور تاریخ گواہ ہے کہ وہ فیصلہ کتنا صحیح اور بروقت تھا عافیت گوشتی اور دنیا پرستی کا راستہ وہ تھا جو ہندوؤں اور نظام نے اپنالیا تھا مگر مردانِ حُر کی پُرخطر راہ وہ تھی جس پر سلطان نے چلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ جنگِ پلاسی کے بعد چار عشروں میں انگریزوں نے جو ظلم و ستم بنگال میں مسلمانوں کے ساتھ روا رکھا اس کی رپورٹیں سلطان کے پاس تھیں اور اس پر مسلمانوں کے مستقبل کو بھی قیاس کیا جاسکتا تھا۔ ہندو نے جلد ہی انگریز کی بے دام غلامی اور جی حضوری کا فیصلہ کر لیا تھا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ تجارتی مراسم پختہ طور پر استوار کر کے قومی سطح پر مفادات کے حصول میں لگ گیا تھا اور مسلمانوں کو ہندو خود بھی نیچا دکھانے کے ہتھکنڈے استعمال کر رہا تھا اور حکومتی و سیاسی سطح پر انگریز کی مدد کر کے مسلم اقتدار کو کمزور کر رہا تھا۔

اس موقع پر ہندو کا کردار ایک ”گھر کے بھیدی“ کا کردار تھا۔ مسلمان گزشتہ کئی صدیوں سے جنوبی ایشیا کے علاقے کے بلا شرکت غیرے حکمران تھے اور ان کے اپنے رسم و رواج، ثقافت، طور طریقے اور مذہبی عبادات و رسومات تھیں، جس سے ہندو واقف تھا۔ مسلمانوں کی کمزوریوں کا بھی ہندو کو علم تھا اس طرح ہندو کے برطانوی سامراج کی گود میں جا بیٹھنے کا مطلب مسلمانوں کے بارے میں ”گھر کا بھیدی“ کا کردار ہی تھا جس کی وجہ سے انگریزوں کو ہند میں کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ جنوبی ایشیا پر برطانوی سامراج کے تسلط کی وجوہات میں مسلمانوں کی سیاسی، عسکری غلطیاں، باہمی اختلافات اور عیش و عشرت کا درآنا بھی تھا مگر انگریزی اقتدار کی مسلسل اور تیز رفتار کامیابیوں میں ”گھر کے بھیدی“ کے ”لنکا ڈھانے“ کی نفسیات بنیادی وجہ تھی۔

بنگال میں اقتدار حاصل کرتے ہی یورپی مصنوعات کی بھرمار ہو گئی مگر کئی صنعتوں بالخصوص کپڑے کی صنعت میں برطانوی مصنوعات نہایت ردی قسم کی تھیں۔ جبکہ مقامی کپڑے کی صنعت جس میں مسلمان پیش پیش تھے، ڈھا کہ نمل اور اطلس و کچواب کے دلکش نمونے جو امراء اور بادشاہوں کے استعمال میں آتے تھے زیادہ تر یہیں بنتے تھے۔ تاہم انگریزوں نے

ظالمانہ طریقے پر اپنے مال کی فروخت کی خاطر مقامی صنعت کا بھٹہ بٹھا دیا اور کوئی معروف کاروباری طریقہ استعمال نہیں کیا بلکہ مسلمان کاریگروں کو گرفتار کر کے مختلف جرائم میں سزا کے طور پر ان کے ہاتھ کے انگوٹھے کٹوا دیے جس سے وہ کام کے قابل نہ رہے اور یوں یہ صنعت پارچہ بانی دو تین دہائیوں میں دم توڑ گئی یہ ظالمانہ کاروائیاں یورپی انداز حکمرانی میں رومی سلطنت سے ورثہ میں آیا تھا جس کے لئے سیمول پی ہینگٹن نے اپنی کتاب ”تہذیبوں کا تصادم“ میں تسلیم کیا ہے کہ مغربی تہذیب کا غلبہ رومی تشدد اور دشمنوں پر بے رحمانہ (گوانتا ناموبے جیل کی طرح کے) مظالم کا مرہون تھا۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:

”.....1500ء سے 1750ء کے درمیانی عرصے میں پہلی عالمی سلطنت کو قائم

کرنے میں مغرب والوں کی کامیابی کا دار و مدار ان کی جنگی استعداد میں اضافہ تھا۔

جس کو فوجی انقلاب کا نام دیا گیا ہے۔ مغرب نے دنیا کو اپنے نظریات یا اقتدار یا

مذہب کی وجہ سے فتح نہیں کیا تھا۔ بلکہ اس وجہ سے فتح کیا کہ منظم تشدد کرنے میں اس

کو برتری حاصل تھی۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کو مغرب کے لوگ تو بھول جاتے ہیں لیکن

غیر مغربی لوگ فراموش نہیں کر سکتے۔“ (ترجمہ و تلخیص عبدالمجید طاہر، صفحہ 42)

اس پس منظر میں مسلمانوں کی بقا کی جنگ جس مرد مجاہد نے مردانہ وار لڑی ہے وہ یہی

سلطان فتح علی ٹیپو ہی ہے جب کہ برطانوی سامراج اور اس کے گماشتوں نے ہمیشہ سازشوں،

لاٹچ، جھوٹے وعدوں اور مستقبل کی حکمرانی کے جھوٹے خواب دکھا کر ہی لوگوں کو ساتھ ملایا ہے اور

کامیابیاں حاصل کیں ہیں۔

برطانوی سامراج کے پس پردہ صہیونی قوت اور اس کی منصوبہ بندی

مغربی سامراج کا نمائندہ انگلستان جو بعد میں برطانیہ یا UK کہلایا دراصل ایک

صہیونی منصوبہ اور ابلیسی قوت کے غیر انسانی روٹیوں پر مشتمل ایک پروگرام کا نام تھا جو صہیونی

منصوبہ سازوں نے بڑی باریک بینی کے ساتھ ترتیب دیا تھا۔ دنیا بھر کی تمام خفیہ تنظیموں کا سرا

دراصل اسی ابلیسی صہیونی قوت سے جا ملتا ہے۔

THE PAWNS OF THE GAME نامی کتابیں دنیا کی مسلم اور مسیحی تاریخ میں اسی صہیونی کردار سے پردہ اٹھاتی ہیں مسلمانوں میں تمام باطنی فرقے جنہوں نے پہلی صدی ہجری سے آج تک سر اٹھایا ہے وہ اسی ڈرامے کا کردار ہیں جس کے تحت اسلام کی تعلیمات کو چھپانا، پیغمبر اسلام ﷺ کی کردار کشی کرنا اور مسلمانوں کے دل سے اسلام اور حضرت محمد ﷺ کی محبت اور عشق کو نکال دینا اس کے اہداف ہیں۔ پہلے کبھی حسن بن صباح تھا، فاطمی حکومت تھی، اسماعیلی تھے اور دور جدید میں قادیانی ہیں، لاہوری ہیں، گوہر شاہی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

ابلیس اپنے چیلنج کے مطابق اولادِ آدم کو گمراہ اور بے لباس کرنے یعنی عریانیت اور حیوانیت کی طرف لانے کے لئے قوت و اقتدار کا خواہاں تھا اور اسلام کی تعلیمات کو پس پردہ لے جانا اس کی کامیابی کی شرط تھی۔ اس منصوبہ پر اس نے گزشتہ دو ہزار سال سے عمل کیا ہے۔

مسلمانوں کے دور عروج میں 1097ء میں بیت المقدس کی عیسائیوں کو واپسی پر یہودی بڑے خوش تھے۔ تاہم 1190ء کے لگ بھگ سلطان صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں بیت المقدس کے واپس مسلمانوں کے پاس چلے جانے سے اس صہیونی تحریک کو بڑا دھچکا لگا لیکن اس نے ہار نہیں مانی بلکہ میدانِ جنگ بدل لیا۔ اب اس نے مسلمانوں کے اندر اپنے ہم خیال باطنی فرقے پیدا کرنے اور ان کی سرپرستی کے ساتھ ساتھ سیاسی اور فوجی قوت کے حصول کے لئے عیسائیوں پر پورا بھروسہ کرنے کی بجائے ایک اپنی قوت کھڑی کرنے کا منصوبہ بنایا اور آج کی ساری صہیونی کامیابیاں اسی منصوبہ کے مختلف مراحل ہیں اور آئندہ کے مراحل کا پتہ دیتی ہیں۔ اس کے اہم واقعات یہ ہیں۔

① صہیونیت نے بیت المقدس کی واپسی کے بعد یورپی عیسائیت سے مایوس ہو کر مذہب کے نام پر مذہب سے آزاد اور مذہب بیزار گروہ پیدا کرنے کے لئے راہ ہموار کرنا شروع کر دی۔ اس لیے کہ ایک طرف مذہب انسان کی ضرورت ہے تو دوسری طرف یہ بھی اس سے بڑی حقیقت ہے کہ اکثریت مذہب کو مان کر اس کی پابندیوں سے آزادی کی خواہش مند ہوتی ہے۔ لہذا مسلمانوں میں سے بھی بہت سے لوگ اس مہم میں ابلیس ہی کا ساتھ دیتے ہیں۔

- اس کام کیلئے ویسے تو پورا مسیحی یورپ ہی یہود کیلئے چراگاہ ثابت ہوا تاہم برطانیہ کی سرزمین اور وہاں کی سماجی معاشرتی اور جغرافیائی حیثیت اس منصوبے کے لئے نہایت سازگار رہی۔
- مذہبی عیسائی اور مسلمان — یہودیت اور اس کے منصوبوں کو جلد ہی پہچانتے رہے ہیں اسی لئے صہیونیت نے اپنی بقا اور منصوبوں کی کامیابی کے لئے فضا ہموار رکھنے کی غرض سے غیر مذہبی ذہن اور سیکولر سوچ کا آغاز کیا۔

چنانچہ 1215ء میں انگلستان میں حقوق انسانی کی آواز اٹھائی گئی اور ہر انسان کو بلا لحاظ مذہب و ملت، رنگ و نسل زندہ رہنے اور اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی کا نعرہ لگایا گیا بظاہر یہ نعرہ بڑا سادہ اور پرکشش بھی تھا مگر بدنیت گروہ اور شیطان کے لئے اس میں کامیابی کی نوید تھی۔

- 1225ء میں انگلستان میں ہی شاہ انگلستان کے ذریعے انسانی حقوق کے لئے ایک جامع فرمان جاری کرایا گیا جو بعد میں حقوق انسانی کا شاہکار MAGNA CARTA کہلایا اور اسے مستقبل کی تمام کامیابیوں کی شاہ کلید سمجھا گیا۔

○ مسیحیت کے اندر ہی پوپ کے بے پناہ 'خدائی' اختیارات کو چیلنج کر دیا گیا اور انسانی حقوق اور آزادی رائے کے خلاف قراردادے کر ایک تحریک کا آغاز کر دیا گیا جس میں دھوکے سے باضمیر اور بہت سے انسان دوست لوگوں نے قربانیاں دیں اور اس تحریک کو کامیابی سے ہمکنار کیا تاہم آزادی رائے اور آزادی مذہب کے اس خوبصورت نعرے سے فائدہ صرف صہیونیت نے اٹھایا اور آج تک اٹھا رہی ہے۔

- چنانچہ مسیحیت کے اندر کیتھولک کے مقابلے میں پوپ سے آزاد اور مسیحی ہوتے ہوئے بھی — خیالات و نظریات سے لے کر عملی زندگی تک 'آزادی' اور 'آزاد خیالی' کو جواز مل گیا اور اس 'آزادی' کی آڑ میں دراصل اختیار صہیونی منصوبہ سازوں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ اس فرقے کا نام "PROTESTANTS" رکھا گیا اور اس کا تعلق بائبل سے صرف نام کی حد تک رہ گیا اور آسمانی وحی اور فرمودات پیغمبر ﷺ کا عمل دخل ختم ہو گیا یہ تعلق صرف مسیحی کہلوانے کے لئے باقی رکھا گیا۔

- 'آزاد خیالی' جسے بعد میں 'روشن خیالی' کا دل خوش کن نام دیا گیا، کی آڑ میں صہیونی

منصوبہ سازوں نے سود کو جائز کر لیا اور آسمانی وحی کے حامل تینوں مذاہب کی تعلیمات کے برعکس (اسلام، یہودیت اور عیسائیت میں سود USURY حرام ہے) طرز عمل اختیار کر لیا۔

● چنانچہ 1545ء میں اس اہلیسی تحریک کے منصوبہ سازوں نے پہلا بینک (معاشی حرام کاری کا اڈہ) بینک آف انگلینڈ کے نام سے قائم کیا۔ اس سے پہلے کاغذی نوٹ (PAPER CURRENCY) آچکا تھا لہذا بینک کے کام کو جلد ہی فروغ حاصل ہو گیا اور اس کی شاخیں ہر جگہ کھلنے لگیں۔

● سترھویں صدی میں امریکہ فرانس وغیرہ میں جمہوری تحریکیں چلیں جس کے نتیجے میں آگے چل کر انسان کو جمہوری حقوق تو مل گئے مگر اس کی آڑ میں دراصل فائدہ صہیونی تحریک کو ہوا جس نے اس موقع پر ریاست اور مذہب کو علیحدہ کر دیا گیا اور ریاستی معاملات میں مذہب کا عمل دخل کم کر دیا گیا جو بالآخر بیسویں صدی میں آ کر یکسر ختم ہو گیا اور سیکولر ازم کا دور عروج پر پہنچ گیا۔

● مسیحیت میں پوپ کے اختیارات اور تثلیث کے عقیدہ کی شدت نے سائنس اور سائنسی تحقیق کا راستہ روکا۔ فلکیات کے شعبہ میں ترقی سے مذہبی تصورات پر زد پڑی، آکسیجن کی دریافت سے آگ کے بارے میں تصورات بدل گئے جس پر تثلیث کے علمبرداروں نے سخت سزائیں دیں جس سے آہستہ آہستہ تحقیق کا شعبہ بھی مذہب سے بیزار ہو گیا اور ریاست و مذہب میں علیحدگی کے بعد سائنس و تحقیق کا شعبہ بھی مذہب سے کٹ کر الگ ہو گیا اور یوں جدید ریاست اور سائنس کی عمارت سیکولر بنیادوں پر استوار ہو گئی اور سیکولر ازم اور لادینیت جدید سائنس اور جدید ریاست میں رچ بس گئی۔۔۔ مسیحی مذہب یعنی تثلیث کے زہریلے اثرات کی وجہ سے ریاست مذہب سے علیحدہ ہوئی تو اس خلا کو رومن لا اور رومی طرز حکومت نے پُر کیا۔ رومی طرز حکومت بڑا ظالمانہ بلکہ بے رحمانہ تھا جس کی وجہ سے مغربی استعمار کی بالادستی ہو گئی۔ جبکہ قانون سازی کی بنیاد اور انسان کے لئے ماورائی تصورات کے لئے مذہب کی جگہ یونانی فلسفہ نے لے لی۔

اس طرح مغربی فکر کی بنیاد مذہب دشمنی اور یونانی فلسفہ پر استوار ہے اور اس کے اجزائے ترکیبی رومی قانون، رومی طرز حکومت و عدالت ہے۔ (یونانی فلسفہ کے نمائندے ارسطو وغیرہ ہی تھے) مغربی فکر کی بنیادیں سترھویں صدی تک بہت پختہ ہو چکی تھیں اگرچہ بعد میں اس

میں وقت کے ساتھ ساتھ 'آزادی' اور 'روشن خیالی' کے نام پر 'حیوانیت' آتی چلی گئی اور انسان 'اشرف المخلوقات' ہونے کے مقام سے اسفل السافلین کی طرف لڑھکتا چلا گیا تا آنکہ آج اکیسویں صدی کا مغرب VALUELESS اور MORALES معاشرہ ہے آج آزادی کا مطلب اور اخلاقی اقدار سے آزادی ہے جو مغرب کا نعرہ ہے۔

○ اٹھارھویں صدی کے آخر تک یورپ میں اس فکر کے ساتھ سائنسی ترقی ہوئی اور صنعتی انقلاب آیا تو یورپی اقوام نے دنیا بھر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور تمام خشکی و تری یعنی بحر و بر پر قبضہ جمالیا۔ تاہم انسانی فطرت ہے جس کو بدلا نہیں جاسکتا۔ یورپی اقوام نے مختلف مقبوضات پر قبضے کے لئے چھینا جھپٹی کی اور جنگوں تک نوبت آگئی شمالی افریقہ میں مصر پر قبضے کے لئے فرانس اور انگلینڈ کی جنگیں اسی کا شاخسانہ تھیں۔

○ اس سارے کھیل میں تھوڑا نقصان اٹھا کر بھی صہیونی منصوبہ سازوں کو انگلستان (برطانیہ) کو بالادستی دلانے کا موقع مل گیا۔

صہیونی منصوبہ سازوں کے دواہم اقدامات

یورپی اقوام، جو صہیونیت کے مہرے تھے، کی آپس کی جنگوں سے اس طویل منصوبہ کی ناکامی کا خدشہ تھا لہذا فطری آزادی اور اقتصادیات کے میدان میں مسلمہ اصول OPEN MARKET اور HEALTHY COMPETITION کے بجائے MONOPOLY کا اصول اپنایا گیا۔ تاکہ دیگر اقوام عالم کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا جاسکے۔ یہ اقدام اقوام عالم کے لئے تاریخ کا ایک سیاہ دن تھا جس کے بعد سے آج تک مغربی اقوام بلا شرکت غیرے پوری تیسری دنیا کا خون نچوڑ کر پی رہی ہیں اور ان کے وسائل رزق کا بڑا حصہ اپنے ملکوں میں لے جاتی ہیں۔ چنانچہ صہیونی دماغوں نے دواہم اقدامات کیے:

○ پہلا فیصلہ یہ کیا گیا کہ یورپی اقوام مقبوضات پر آپس میں جنگ نہیں کریں گے بلکہ یہ فیصلے پوپ کے ذریعے ہوں گے اور وہ سب کو قبول کرنا ہوں گے۔ جس کے تحت یورپی اقوام کی آپس کی خانہ جنگی ختم ہوگئی اور اس وقت تک برطانوی سامراج چونکہ ایک واضح بالادستی حاصل کر چکا تھا لہذا ملکہ برطانیہ اور چرچ آف انگلینڈ بہت طاقتور اور مستحکم ادارے بن گئے۔

● دوسرا فیصلہ یہ ہوا کہ — اقتصادی میدان میں اگر یورپی اقوام اپنی اپنی مصنوعات کھلی مارکیٹ میں فروخت کرتی رہیں تو اس طرح صحت مند مقابلے کی کیفیت سے منافع خوری کم ہوگی اور فائدہ تیسری دنیا کو ہوگا جو یہودی اور ابلسی ذہن کو کسی صورت گوارا نہیں تھا اور نہ اب ہے اس لئے کہ وہ جلدی منافع جمع کر کے اپنے شیطانی منصوبوں کی تکمیل چاہتا تھا۔ لہذا یہ طے کیا گیا کہ یورپی اقوام میں اس وقت کی قوت و حیثیت کے مطابق مختلف مصنوعات کو مختلف ملکوں کو الاٹ کر دیا گیا۔ مثلاً فرانس خوشویات اور آرائشی شیشہ کی مصنوعات بناتا ہے، بلجیم عمارتی شیشہ بناتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس سے یورپی مصنوعات کا یورپی اقوام میں مقابلہ نہیں ہوگا بلکہ وہ اپنی سائنسی ترقی کی بنیاد پر منہ مانگے دام وصول کر سکیں گی (بعد میں یہ تقسیم دن بدن گہری ہوتی چلی گئی اور مختلف مصنوعات کوئی ایک یورپی ملک بناتا ہے اور دوسرا نہیں بناتا مثلاً دل کے امراض کے مہنگے انجکشن صرف ڈنمارک بناتا ہے گزشتہ سالوں میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کرتے ہوئے ڈنمارک میں جو کارٹون شائع ہوئے اور ڈنمارک کی مصنوعات کا بائیکاٹ ہوا تو چند دنوں میں دل کے مریضوں کے آپریشن کے لئے ادویات ناپید ہو گئیں اور بالآخر مجبوراً وہ بائیکاٹ ختم کرنا پڑا۔)

ان دو اقدامات سے یورپی اقوام کو استحکام ملا اور برطانوی سامراج کی عالمی بالادستی مضبوط ہو گئی اور باقی یورپی اقوام اس صہیونی منصوبہ کے مہرے بن گئے جو کسی وقت بھی کام میں لائے جاسکتے ہیں۔

یہ باتیں آج زبان زد عام ہیں اٹھارویں صدی کے اختتام پر صرف یورپی بالادستی، ظلم و تشدد اور بے انصافیوں کے پس منظر میں یورپی غلبہ کے 'عنوان' سے اور مسلمانوں کے غیر مسلم اقوام کے ہاتھوں غلام ہونے کے خدشہ کے طور پر سوچی جاسکتی تھیں۔ تاہم اس دیوانستہ برطانوی سامراج اور صہیونی منصوبہ — کا جس مرد مجاہد نے مردانہ وار مقابلہ کیا ہے وہ ٹیپو سلطان ہے اور یقیناً وہ برطانوی سامراج کے سیلاب کے سامنے آخری چٹان ہی ثابت ہوا۔ سلطان ٹیپو نے باپ کے انتقال کے بعد جو مہمات برپا کیں ان کی تفصیلات اسلامی انسائیکلو پیڈیا کے مطابق درج ذیل ہیں:

حکومت سنبھالتے ہی ٹیپو سلطان نے سب سے پہلا کام اپنی فوج کو منظم کرنے کا کیا۔ اس نے باقاعدہ رجمنٹیں مقرر کیں اور ماہوار تنخواہ مقرر کر دی۔ اس سے پہلے ہندوستان میں ماہوار تنخواہ کا تصور بھی نہیں تھا اس نے فرانسیسی افسروں کی خدمات حاصل کیں تاکہ فوج کو یورپی نمونے پر منظم کیا جاسکے۔ عام روایت کے مطابق ٹیپو سلطان کی باقاعدہ فوج ایک لاکھ کے قریب تھی۔

انگریزوں نے جنرل میتھوز کی سرکردگی میں ازسرنو مالابار پر حملہ کر دیا اور بڈنور کے حاکم ایاز خان نے نہ صرف شہر و قلعہ بلکہ پورا صوبہ بڈنور اس شرط پر انگریزوں کے حوالے کر دیا کہ اس کی حکومت بدستور اسی کی تحویل میں رکھی جائے۔ سلطان کو خبر ہوئی تو اس نے لطف علی بیگ کو دفاع کی غرض سے بھیجا۔ اس وقت تک انگریز ایاز خان سے سمجھوتے کے مطابق بڑے علاقے پر قابض ہو چکے تھے۔ لطف علی بیگ نے باقی علاقے کو بچانے کی کوشش کی لیکن انگریزوں کی قوم کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔ فتح کے بعد انگریزوں نے وہاں انتہائی دردناک مظالم روار کھے۔

یہ خبریں سلطان تک پہنچیں تو وہ بگولے کی طرح اٹھا اور انگریزوں پر چھا گیا اس نے ایک ہی حملے میں بڈنور پر قبضہ کر لیا۔ یہاں وہ بنگلور پہنچا اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ انگریز جنرل کیمبل نے 2 اگست 1783ء کو صلح نامہ پر دستخط کر دیے۔ ہر طرف سے شکست و ہزیمت اٹھا کر انگریزوں نے میسور میں سازشوں کا آغاز کر دیا۔ سرنگا پٹم میں ہندو راجا کو گدی پر بٹھانے کی سازش کرائی گئی۔ لیکن ٹیپو سلطان کی تدبیروں کے سامنے ان کی ایک نہ چلی اور بالآخر 11 مارچ 1783ء کو انگریزوں اور سلطان کے مابین ایک معاہدے پر دستخط ہو گئے۔ جس کی رو سے فریقین نے مفتوحہ علاقے واپس کر دیے اور اسیران جنگ چھوڑ دیئے۔ انگریزوں سے فارغ ہو کر سلطان نے مرہٹوں اور نظام کے ساتھ اتحاد کی ہر ممکن کوشش کی لیکن اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ ادھر نظام اور مرہٹوں کے درمیان اس امر پر اتفاق ہو گیا کہ میسور کی سابقہ ریاست چھوڑ کر باقی تمام سلطانی مقبوضات کو چھین کر باہم تقسیم کر لیا جائے۔ ایک جھڑپ کے بعد دونوں فروری 1787ء میں سلطان کے ساتھ صلح کر لینے پر مجبور ہو گئے۔ طے پایا کہ دونوں طاقتیں انگریزوں کے خلاف سلطان کو مدد دیں گی۔

اسی زمانے میں سلطان نے بادشاہ کا لقب اختیار کیا جسے دونوں ہمسایہ ممالک نے تسلیم کیا۔ خطبے میں مغل حکمران کی جگہ اپنا نام شامل کرایا۔ نیا روپیہ جاری کیا۔ انتظامی معاملات درست کئے۔ نیا آئین حکومت نافذ کیا۔ سرنگا پٹم میں مسجد اعلیٰ کی تعمیر اختتام کو پہنچی۔ سن ہجری کی جگہ سن محمدی جاری کیا جو آغاز نبوت سے شروع ہوتا تھا۔ مہینوں کے نئے نام رکھے اور ملک بھر میں مختلف صنعتیں جاری کروائیں سلطان نے فرانس کے دستور جمہوریت سے متاثر ہو کر اس کا عملی نفاذ اپنے ہاں بھی کرنا چاہا اور دفاعی اور خارجی امور کے علاوہ دیگر تمام تر اختیارات مجلس وزراء کو سونپ دیے جس کا میر (وزیر اعلیٰ) یعنی صدر الصدور میر صادق کو بنایا۔

1784ء میں سلطان نے عثمان خاں کو سفیر بنا کر قسطنطنیہ بھیجا تھا۔ وہاں سے حوصلہ افزا جواب آیا تو غلام علی خان لنگڑے، شاہ نور اللہ، لطف علی بیگ اور محمد حنیف کو ایک سفارت پر روانہ کیا۔ جسے قسطنطنیہ کے بعد فرانس اور پھر انگلستان بھی جانا تھا مگر یہ سفارت صرف ترکی ہی سے واپس لوٹ آئی۔ سلطان ترکی نے خلیفہ ہونے کی حیثیت سے ٹیپو سلطان کے لئے پروانہ سلطان بھجوا دیا۔ اسی طرح سلطان نے کریم خاں زند، حاکم ایران، زمان شاہ درانی حاکم افغانستان اور شاہ فرانس کے پاس بھی الگ الگ سفارتیں بھجوائیں۔

اس وقت لارڈ کارنوالس گورنر جنرل بن کر ہندوستان آیا۔ اس نے آتے ہی تمام معاہدوں سے انحراف کرنا شروع کر دیا۔ اس نے اندازہ لگا لیا کہ ٹیپو سلطان کو شکست دیے بغیر انگریزی حکومت قائم کرنے کے خواب کی تعبیر حاصل کرنا ممکن نہیں۔ مگر فوجی و عددی برتری کے باوجود ابھی تک وہ سلطان کو شکست سے آشنا نہ کر سکتے تھے۔ یہ دیکھ کر کارنوالس نے سازشوں کا ایک جال بچھانا شروع کر دیا۔

مرہٹوں اور نظام کے ساتھ انگریزوں کی گفت و شنید جاری تھی کہ ٹراونکور کے راجہ نے انگریزوں کی شہ پر سلطانی علاقے کو چھین پر قبضہ کر لیا۔ اسی دوران میں ٹراونکور نے دلندیریوں سے دو قلعے جیا کوٹہ اور کرنگا توڑ خرید لئے جو دفاعی لحاظ سے میسور کی سرحد پر اہم حیثیت رکھتے تھے۔ کارنوالس نے اس سودے پر ناپسندیدگی کا اظہار بھی کیا تھا۔ اور دلندیری گورنر نے بھی اس میں اپنی عدم واقفیت کا اظہار کیا۔ ان حالات میں 14/ اگست 1789ء کو جب سلطان نے اپنی سرحدوں کا

جائزہ کیا۔ تو اس نے ایک خط راجہ کو لکھا کہ دونوں قلعے اسے واپس دے دیے جائیں نیز کوچین کا علاقہ بھی واپس کر دیا جائے راجہ کے غیر ذمہ دارانہ جواب پر سلطان نے اس کی گوشمالی کرنے کے لئے کچھ فوج بھیجی جس کے ساتھ راجہ کی فوجوں کی چھوٹی سی جھڑپ ہوئی۔

جولائی 1790ء میں مدارس کے گورنر نے کارنوالس کی ہدایت کے مطابق سلطان کو لکھا کہ جھگڑے کے تصفیے کے لئے کمشنر مقرر کیے جائیں۔ سلطان نے اتفاق کیا اور کہا کہ بہتر ہے کمشنر اس کے پاس بھیج دیے جائیں جب میڈوز گورنر بنا تو اس نے کمشنر سے انکار کر دیا۔ سلطان نے اپنے سفیر بھیجنا چاہا تو اسے بھی نہ مانا اور کہلا بھیجا کہ صلح چاہتے ہو تو تاوان ادا کرو۔

بعد کے واقعات کچھ بھی ہوئے یہ حقیقت ہے کہ انگریزوں نے ٹراونکور کے واقعہ کو بہانہ بنا کر تیسری بار میسور پر حملہ کر دیا۔ ابتدا میں جنرل میڈوز نے فوج کی کمان سنبھالی۔ اس نے جنوبی سمت سے میسور پر حملہ کر دیا۔ مئی سے دسمبر 1790ء تک اس کے حملے ناکام رہے۔ فروری 1791ء میں کارنوالس نے کمان سنبھالی اور سیدھا بنگلور کی طرف بڑھا سلطانی فوج مدافعت میں ناکام رہی اور کارنوالس نے بنگلور کو فتح کرنے کے بعد مئی 1791ء میں سرنگاپٹم کا محاصرہ کر لیا۔ مگر چیچک پھوٹ پڑنے کی وجہ سے محاصرہ اٹھانے پر مجبور ہو گیا۔ ابھی کارنوالس محاصرہ اٹھا کر پلٹا ہی تھا کہ مرہٹے اس کی مدد کو آ گئے۔ اور یوں فروری 1792ء میں اس نے دوبارہ سرنگاپٹم کا محاصرہ کر لیا۔ سامان رسد کی موجودگی میں اسے محاصرہ کی طوالت کا کوئی خوف نہ تھا۔ ادھر سلطانی فوج ہر قسم کی کمک سے محروم ہو چکی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب انگریز چاہتے تو سلطنت میسور کا خاتمہ کر سکتے تھے۔ مگر ٹیپو سلطان کا دبدبہ ان پر اس قدر طاری ہو چکا تھا کہ مسلمان کو مصالحت کا پابند بنانے ہی میں عافیت سمجھی اس مصالحت میں طے پایا کہ:

- 1- سلطان نصف سلطنت اتحادیوں (انگریز، مرہٹے اور نظام) کے حوالے کر دے۔
- 2- تین کروڑ تیس لاکھ پگوڈے کی رقم تاوان دے۔ اس میں سے ایک کروڑ پینسٹھ لاکھ کی رقم فوراً ادا کی جائے اور باقی رقم جلد از جلد ادا کر دی جائے۔
- 3- تمام اسیران جنگ رہا کر دیے جائیں۔
- 4- معاہدے کی شرطیں پوری ہونے تک سلطان کے دو بیٹے بطور بریغمال اتحادیوں

کے پاس رہیں۔

اس معاہدے سے سلطان پر سیاسی، معاشی اور انتظامی طور پر سخت ضرب لگی۔ اندازہ لگانے کی بات ہے کہ جس ملک کا مالیہ اڑھائی کروڑ ہو، وہ نصف ملک بھی ہاتھ دے اور تین کروڑ سے زیادہ تاوان بھی دے۔ اس کی معاشی حالت کیسی ہو جائے گی۔ اس کے باوجود سلطان نے ہمت نہ ہاری۔ اس کی الوالعزمی میں کوئی فرق نہ آیا اور وہ پہلے سے کہیں زیادہ جفا کشی کے ساتھ انتظام سلطنت میں لگ گیا سرکشوں کو سزا دی۔ وفا داروں سے حلف لیا۔ زراعت کی حوصلہ افزائی کی اور فوج کو ازسرنو مستحکم کیا اور صرف پانچ ہی برس کی انتھک محنت سے ملکی معیشت کو سنبھالا دے دیا۔

اس دوران میں سلطان کی سیاسی اور فوجی سرگرمیاں بھی جاری رہیں۔ تجارت اور صنعت کے علاوہ اس نے فرانس کے ساتھ کئی فوجی معاہدے بھی کئے۔ اس وقت نیپولین مصر فتح کر چکا تھا۔ اس نے جو خط نیپولین کو لکھے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایران کے راستے ہندوستان آنا چاہتا تھا کہ یہاں انگریزوں سے نمٹ سکے۔ اس خط سے انگریز بھی آگاہ تھے۔ ابتدا میں تو وہ خاموش رہے مگر جب مرہٹوں اور نظام کی طرف سے انھیں مکمل معاونت کا یقین ہو گیا تو انگریز گورنر دہلی نے سلطان کو تہدید آمیز خطوط لکھنے شروع کیے۔

سلطان کی دور بین نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت ختم ہونے والی ہے۔ مسلمان آپس کی سر پھٹول کے باعث کمزور ہو چکے تھے۔ اور سات سمندر پار کی ایک قوم اپنے بچے اس سر زمین میں گاڑ رہی ہے۔ اگر اس قوم کا مقابلہ نہ کیا گیا تو بہت جلد ہندوستان جیسا زرخیز علاقہ انگریزوں کے قبضے میں چلا جائے گا جو یہاں سے دولت کو ہر روپ میں انگلستان پہنچا دیں گے مگر افسوس کہ سلطان اپنے محل اور دربار میں ہونے والی سازشوں کو نہ سمجھ سکا۔ بزعم خود اس نے فرانسیسی طرز کی جمہوریت کی نیو ڈال دی۔ مگر یہ نہ دیکھا کہ یہ زمین بھی موزوں ہے یا نہیں۔ میر صادق، پورنیا اور قمر الدین خاں جیسے وزراء اختیارات کو ناجائز طور پر استعمال کر رہے تھے۔ وہ فوری فوائد کے لالچ میں درپردہ انگریزوں سے ملے ہوئے تھے اور حکومت و مناصب کے بڑے بڑے عہدوں کی امید میں سلطان کا ہر راز ان تک پہنچا دیتے تھے۔

جب سلطان کے دل میں ان سازشوں کے متعلق شکوک نے جگہ گھیری تو اس نے تمام عہدہ داروں کو مسجد اعلیٰ سرنگا پٹم میں بلا کر وفاداری اور ایمانداری کا حلف لیا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا انگریزوں کی سازشیں عروج پر پہنچ چکی تھی۔ اور دلزلی سلطان کو جنگ کی دھمکی دے چکا تھا جولائی 1798ء میں جنرل ہارس نے پیش قدمی شروع کر دی۔ 22 اپریل 1799ء کو اس نے سرنگا پٹم پر گولہ باری سے پیشتر مصالحت کا ایک مسودہ سلطان کی خدمت میں دستخط کرنے کے لئے بھیج دیا۔ جس میں انتہائی ذلت آمیز شرائط درج تھیں۔ یعنی نصف سلطنت چھوڑ دی جائے۔ دو کروڑ تاوان دیا جائے۔ جس میں سے ایک کروڑ فوراً ادا کیا جائے۔ چار بیٹے اور چار جرنیل بطور برہمنال دیئے جائیں۔ یہ جواب چوبیس گھنٹے کے اندر مانگا گیا تھا۔

سلطان ایسی ذلت آمیز شرائط پر صلح نہ کر سکتا تھا۔ اس کا مقولہ تھا کہ ”شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے“ امید افزا جواب نہ ملنے پر جنرل ہیرس نے قلعہ پر گولہ باری شروع کر دی۔ سلطانی افواج نے اس گولہ باری کا پوری مستعدی سے جواب دیا۔ مگر سلطانی وزراء غداری کی قسم کھائے بیٹھے تھے انہوں نے گولہ بارود میں مٹی اور سن ملوادیا۔

4 مئی کی صبح انگریزی فوج سرنگا پٹم کے گرد موجود دریائے کا ویری کا دو سو گز پاٹ پار کر کے فصیل کے ایک شگاف پر حملہ کیا۔ سلطان نے خود وہاں دفاعی فوج متعین کی تھی۔ مگر عین اس وقت پورنیا نے محافظ فوج کو تنخواہ تقسیم کرنے کے بہانے بلا لیا۔ یوں انگریز فوج بلا تکلف اندر داخل ہو گئی۔ دوپہر کا وقت تھا ٹیپو سلطان مورچوں پر سے چکر لگا کر سائبان تلے آ کر بیٹھا تھا کھانا سامنے دھرا تھا۔ ابھی لقمہ اٹھایا ہی تھا کہ ایک جان نثار سید غفار کے شہید ہونے کی اطلاع ملی پتا چلا کہ انگریزی فوج قلعہ میں آ گئی ہے سلطان نے یہ کہہ کر کھانے سے ہاتھ اٹھا لیا: ”ہم بھی عنقریب جانے والے ہیں۔“

اسی وقت انگریز فوج اندر آ چکی تھی۔ سلطان ڈڈی دروازے کی طرف بڑھا چند جان نثار ساتھ تھے انہوں نے مشورہ دیا کہ قلعے سے باہر نکل کر کسی اور جگہ پر پناہ لی جائے لیکن میر صادق نے باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا اور خود شہر کی جانب روانہ ہو گیا ایک جان نثار اس کی غداری کو بھانپ گیا اور پیچھے دوڑ کر تلوار کے ایک ہی وار سے اس کی گردن اڑادی۔

اب سلطان ہر طرف سے انگریز فوج میں گھر چکا تھا۔ اس کے باوجود اس کی تلوار اپنے

جو ہر دکھا رہی تھی، سلطان کے دو زخم لگ چکے تھے تیسرے زخم نے نڈھال کر دیا۔ وفاداروں نے اٹھا کر پالکی میں ڈالنا چاہا۔ لیکن ایک ہجوم نے انہیں پرے دھکیل دیا۔ سلطان زخموں سے چور ہو کر زمین پر گر پڑا۔ ایک انگریز سپاہی نے آگے بڑھ کر اس کی پیش قیمت پٹی اتارنا چاہی۔ ابھی سلطان میں زندگی کی رمت اور غیرت کا جوش باقی تھا۔ فوراً تلوار کا وار کیا اور سپاہی کو کاٹ کر پرے پھینک دیا۔ ایک اور سپاہی یا شاید اسی سپاہی نے پستول کے وار سے سلطان کو شہید کر دیا۔

سلطان ٹیپو کی عام طور پر مشہور فوٹو میں وہ بغیر داڑھی کے دکھایا جاتا ہے تاہم قائد اعظم لائبریری لاہور میں ایک کتاب موجود ہے جس کے ٹائٹل پر سلطان ٹیپو کی تصویر ”باشرع“ پوری داڑھی کے ساتھ دکھائی گئی ہے۔ اس صفحے کی فوٹو کاپی بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ انگریزوں نے سلطان کو مسلمانوں کی نگاہوں سے گرانے کے لئے عرصے بعد جو تصویر جاری کی وہ اپنی مرضی کے مطابق تھی ورنہ تحریک شہیدین جیسی تحریک 25 سال کا انتظار کیے بغیر ہی جنوبی ہندوستان سے شروع ہو جاتی۔



سلطان فتح علی ٹیپو شہید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

”شیر کی ایک دن کی (آزادی اور حکمرانی کی) زندگی

گیڑو (غلامی اور محکومی) کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے“

مصادر و مراجع

- قرآن مجید
- سنن ابی داؤد
- الجامع الصغیر
- شاہکار اسلامی انسائیکلو پیڈیا مولفہ سید قاسم محمود
- اردو معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور
- ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ مولفہ ثروت صولت
- عظیم شخصیات کے آخری لمحات مولفہ خواجہ طاہر محمود کوریجہ
- تاریخ المشاہیر مولفہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری
- جہانگیر سیریز انسائیکلو پیڈیا جنرل نانج عالمی معلومات مولفہ زاہد حسین
- انسائیکلو پیڈیا پاکستانیکا مولفہ سید قاسم محمود
- شاہ ولی اللہ محدث دہلوی مولفہ عبدالرشید عراقی
- مسلمانوں کا سیاسی عروج و زوال مولفہ کیرن آرم سٹرانگ
- اعلائے کلمہ الحق کی روایت، اسلام میں، مولفہ میاں محمد افضل
- دس سلطان مولفہ سید بشیر احمد سعدی
- دور وشن ستارے مولفہ عبدالرشید عراقی
- RE-AWAKENING OF EAST برٹینڈرسل

NATION MASTER ENCYCLOPEDIA. : WEB

أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ
بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ

بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ

لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ

وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ

وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کو

ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا

تا کہ اسے اور سب دینوں پر غالب کرے

خواہ مشرکوں کو برا ہی لگے

(سورۃ الصف، آیت 9)

مسلمان کا زوال

اگرچہ زربھی جہاں میں ہے قاضی الحاجات
جو فقر سے ہے میسر تو نگری سے نہیں!
اگر جواں ہوں مری قوم کے جسور و غیور
قلندری مری کچھ کم سکندری سے نہیں!
سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندہ مومن کا بے زدی سے نہیں!
اگر جہاں میں مرا جوہر آشکار ہوا
قلندری سے ہوا ہے، تو نگری سے نہیں!

علامہ اقبال

حصہ سوم

حضرت مولانا فضل حق خیر آبادی <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہید <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>
حضرت مولانا محمد الیاس کانپوری <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	حضرت مولانا محمود حسن شیخ الہند <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>
حضرت علامہ محمد اقبال <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	حضرت مولانا محمد علی جوہر <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مشمولات

- 1 مقدمہ 7
- 2 حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ 9
- 3 حضرت مولانا فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ 21
- 4 حضرت ابراہیم اللہ بہار کی رحمۃ اللہ علیہ 33
- 5 حضرت مولانا محمود حسن خاں رحمۃ اللہ علیہ 43
- 6 حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ 59
- 7 حضرت مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ 65
- 8 حضرت علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ 77

- 1 حضرت عمر بن عبدالعزیز
- 2 امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت
- 3 امام احمد بن حنبل
- 4 امام غزالی محمد بن محمد
- 5 شیخ عبدالقادر جیلانی
- 6 سلطان صلاح الدین ایوبی
- 7 امام ابن تیمیہ تقی الدین
- 8 سلطان محمود غزنوی ناصر الدین
- 9 حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی
- 10 حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی
- 11 حضرت اورنگزیب عالمگیر محی الدین
- 12 حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی
- 13 حضرت احمد شاہ ابدالی
- 14 سلطان فتح علی ٹیپو شہید
- 15 حضرت شاہ اسماعیل شہید
- 16 حضرت مولانا فضل حق خیر آبادی
- 17 حضرت امداد اللہ مہاجرکی
- 18 حضرت محمود حسن شیخ الہند
- 19 حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی
- 20 حضرت مولانا محمد علی جوہر
- 21 حضرت علامہ محمد اقبال

دورِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد سے قیام پاکستان تک کی 21 اسلامی انقلابی شخصیات کے اسمائے گرامی

رحمۃ اللہ علیہم

مقدمہ

الحمد للہ کہ قرآن اکیڈمی جھنگ میں چند سال قبل منعقد ہونے والے سیمیناروں میں عظیم اسلامی انقلابی شخصیات پر سامنے آنے والے قیمتی خیالات کی اشاعت کا منصوبہ آگے بڑھ رہا ہے۔ 21 شخصیات کے اس سہرے سلسلہ کے حصہ اول اور حصہ دوم کی اشاعت ہو چکی ہے اور تیسرا حصہ بھی پریس جا رہا ہے، اللہ تعالیٰ کی توفیق سے جلد ہی حصہ سوم بھی قارئین کرام کے ہاتھوں میں ہوگا۔

21 اسلامی انقلابی شخصیات کے حالات پر حصہ اول، حصہ دوم اور حصہ سوم کی طباعت کے بعد اس علمی ذخیرہ کو یکجا چھاپنے کا بھی ارادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس ارادے کی تکمیل کے لیے اسباب جمع فرمادے اور اس کاوش میں شامل تمام اصاغر و اکابر کے لیے توشہ آخرت بنادے۔ آمین۔

انجینئر مختار فاروقی
قرآن اکیڈمی جھنگ

13 مئی 2013ء
2 رجب 1434ھ



اسلامی تاریخ کی اہم شخصیات

اٹھارھویں تا بیسویں
صدی عیسوی

20 1901-2000AD 1318-1421AH	19 1801-1900AD 1215-1318AH	18 1701-1800AD 1112-1215AH	عیسوی صدیاں اہم اسلامی شخصیات
		خلافت عثمانیہ مغلیہ خاندان احمد شاہ ابدالی حیدر علی فتح علی شاہ	حکمران
	قاسم نانوتوی شلی نولانی عبدالستار احمد رضا خان نور شاہ کاشمیری حسین احمد مدنی	نما علی قاری شیخ عبدالحق نما جیون شاہ عبدالرحیم شاہ ولی اللہ	علماء
	سید احمد خواجہ غلام فرید سید امجد علی شاہ	خواجه بابا اشرف محمد الہ آبادی مہدی سوڈانی سید احمد خواجہ غلام فرید سید امجد علی شاہ	صوفیاء و مشاہیر
	تحریک آزادی ہند تحریک خلافت شیشی جماعت تحریک پاکستان	تحریک جہاد (شہیدین)	احیائی تحریکیں
	امداد اللہ محمود حسن محمد الیاس محمد علی محمد اقبال	شاہ اسماعیل فضل حق	شخصیات حصہ سوم

15

مجاہد فی سبیل اللہ

حضرت مولانا

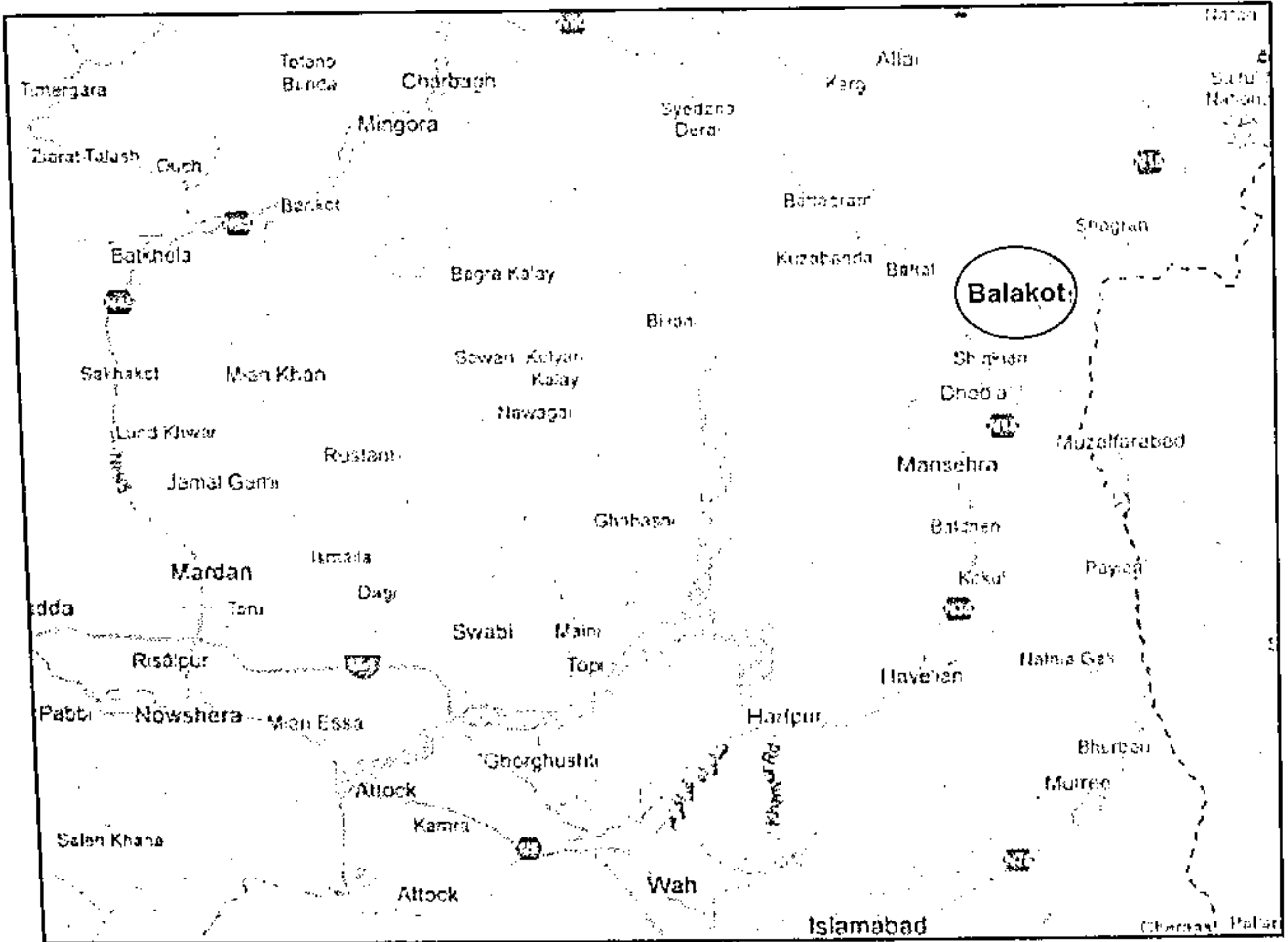
شاہ اسماعیل شہید

رحمۃ اللہ علیہ

ولادت: 1193ھ / 1779ء دہلی
1818ء میں سید احمد بریلوی کے ہاتھ بیعت کی۔ 1821ء میں حج بیت اللہ
کے لیے تشریف لے گئے، دو سال بعد وطن واپسی ہوئی تو تحریک جہاد کا آغاز
کیا۔ 1826ء میں ہجرت کر کے صوبہ سرحد کی طرف جہاد کے لیے روانہ
ہوئے۔ 1831ء میں معرکہ بالاکوٹ میں جام شہادت نوش کیا۔
وفات: 1246ھ / 1831ء بالاکوٹ



آخری آرام گاہ: شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ (بالاکوٹ)



(بالاکوٹ اور آس پاس کے شہروں کا نقشہ)

حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ خانوادہ شاہ ولی اللہ کے نمایاں چشم و چراغ تھے۔ 29 اپریل 1779ء کو دہلی میں شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے چھوٹے بیٹے شاہ عبدالغنی کے ہاں ولادت ہوئی۔ آپ کی طبیعت بچپن ہی سے دعوت و اصلاح کے کاموں کی طرف مائل تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ذکاوت طبع بھی عطا کی تھی اور فطرت سلیمہ بھی۔ جلد ہی علوم متداولہ سے فراغت حاصل کر لی۔ خاندان کا ماحول ہی کسی طرح کم نہیں تھا کہ آپ کو سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت بھی میسر آ گئی تو 'کنز جنس باہم جنس پرواز' والا معاملہ ہو گیا اور زندگی بھر سید صاحب کے 'شریک حیات' رہ کر انہیں کے ہمراہ 6 مئی 1831ء کو سکھوں کے خلاف جہاد کرتے ہوئے بالاکوٹ میں شہادت پائی۔

جنوبی ایشیا کے معروضی حالات

حضرت شاہ اسماعیل رحمۃ اللہ علیہ کی شعوری زندگی 1790ء سے شروع ہوتی ہے۔ اٹھارھویں صدی عیسوی کے حالات ہم حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ، حضرت احمد شاہ ابدالی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت سلطان فتح علی ٹیپو رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھ آئے ہیں۔ 1790ء تا 1850ء کے چھ عشروں کے حالات کا اجمالی خاکہ درج ذیل ہے:

○ 1794ء میں انگریز گورنر جنرل نے (جو اس وقت تک ایسٹ انڈیا کمپنی کے نمائندہ ہوتے تھے) بنگال پر قبضہ مستحکم ہونے پر اصلاحات اراضی (LAND REFORMS) کے نام پر دوبارہ بندوبست اراضی کر دیا اور اسلام کے بابرکت نظام اراضی کو ختم کر کے جاگیرداری (FEUDAL SYSTEM) کی بنیاد رکھ دی، جس نے انگریزی اقتدار کے استحکام اور طوالت میں اہم کردار ادا کیا۔ انگریز نے سرکاری زمینیں من پسند افراد (جو ہمارے نقطہ نظر سے غداران قوم

تھے اور انگریز سے وفاداری کا دم بھرتے تھے) کو عطا کرنا شروع کر دیں تاکہ ایسے افراد مقامی آبادی اور اپنے علاقے کے لوگوں کو انگریز کے خلاف اور اس کے مظالم کے خلاف کھڑے ہونے سے روکیں مزید برآں یہ افراد مالی وسائل پر قابض رہ کر انگریز کے وفادار بھی رہیں۔

یہی دور ہے جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے یہ انگریز تاجر مقامی باحیثیت آزاد اور حکمران طبقہ کی دولت، نوادرات اور قیمتی اشیاء چرا کر اور لوٹ کر انگلستان روانہ کر رہے تھے اور خود بھی اس میں سے منفعت حاصل کر رہے تھے گویا CORRUPTION بھی انتہا پر تھی۔ انگریزوں کے جنوبی ایشیا پر قبضے سے پہلے یہ علاقہ 'سونے کی چڑیا' اور دنیا بھر کا 'اناج گھر' کہلاتا تھا۔ تاہم انگریز کی لوٹ کھسوٹ نے اُسے ایسا برباد کیا کہ اب آزادی کے چھ عشروں بعد بھی وہ اپنی سابقہ اقتصادی حیثیت بحال نہیں کر سکا۔ لارڈ کلائیو گورنر جنرل جب معزول ہو کر واپس انگلستان گیا اس پر کرپشن (مالی بد عنوانیوں) کا مقدمہ چلا تو اس نے اپنے اقبالی بیان میں کہا کہ وہاں دولت ہی اتنی ہے کہ لوگ خود ہی لاکھوں کروڑوں کی رشوت پیش کرتے ہیں۔ یاد رہے کہ اٹھارہویں صدی کے لاکھوں آج کے اربوں روپوں کے برابر ہیں۔

○ سلطان ٹیپو کی شہادت (31 مئی 1799ء) کے بعد انگریز کے لئے کوئی مزاحمت نہ رہی اور وہ سیدھا دہلی پہنچ گیا۔ 1802ء سے سلطنت مغلیہ کے اقتدار کو ختم کیے بغیر ایک انگریز ریڈیٹیٹ مغل بادشاہوں کے ساتھ بیٹھنے لگا تاکہ تمام فیصلے انگریز کے علم میں رہیں اور اس کی مرضی کے مطابق ہوں۔ یہ مسلمان عوام کو ناراض کیے بغیر حکومت پر قبضے کا ایک انداز تھا۔ (یہی صورت حال کئی عشروں سے پاکستان اور مشرق وسطیٰ کے ممالک میں اب بھی جاری ہے۔)

○ اسی دوران میں انگریز نے پورے ملک میں مقامی لوگوں کی علاقائی ریاستوں کو فروغ دیا تاکہ وہ مغلیہ خاندان سے بغاوت کر کے اپنے اقتدار کا اعلان کریں اور مغلیہ سلطنت خود بخود دم توڑ جائے اور نئی ریاستیں انگریز کی احسان مند اور دست نگر ہو جائیں۔ اس طرح کسی فوج کشی کے بغیر 1850ء تک انگریز عملاً پورے ملک پر قابض ہو گیا تھا۔

○ انگریزوں نے بنگال میں قدم جمانے کے بعد کلکتہ کو دار الحکومت بنایا اور آئندہ کے لئے طویل منصوبہ بندی کر کے کئی ضروری اقدامات کیے، جن میں سے چند اقدامات درج ذیل ہیں:

(1) ایک طرف مسلمانوں اور مقامی لوگوں میں عیسائیت کو فروغ دینے کے لئے عیسائی مشنری اداروں کی فوج ظفر موج یہاں آنا شروع ہو گئی اور عیسائیت کی تبلیغ کے لئے سرکاری سرپرستی میں کام شروع ہو گیا۔

(2) مقامی آبادی کے عیسائیت کی طرف آنے سے جنوبی ہند میں عیسائیت کو فروغ مل گیا نیز سرکاری سرپرستی اور مشنری جذبے کی وجہ سے مقامی عیسائی لوگوں کو مراعات اور اعلیٰ تعلیم کے ساتھ حکومتی ملازمتوں میں خصوصی درجہ ملتا چلا گیا۔

(3) یورپی اقوام کو جنوبی ہند میں پاؤں جمانے اور استحکام کے لئے ایک ہی خطرہ تھا اور وہ اقلیم ہند پر چھتری کی طرح چھائے ہوئے ملک چین سے تھا جہاں سے پہلے بھی فاتحین وسطی ایشیا، ایران اور پھر ہندوستان پر حملہ آور ہوتے رہے ہیں۔ برطانوی سامراج نے اس خطرہ سے نمٹنے کے لئے اپنے تجارتی ذہن کو استعمال کیا ہے اور عسکری و سیاسی میدان میں مقابلے کی بجائے ”دشمن کو نقصان پہنچانے کا ہر اخلاقی اور غیر اخلاقی طریقہ اپنانے سے گریز نہ کرؤ“ کا انسانیت سے گرا ہوا طریقہ استعمال کیا۔ چنانچہ لارڈ کلائیو ہی کے دور نامہ سعود سے افغانستان اور پاکستان کے شمالی علاقہ جات سے ایفون کی تیاری کو فروغ دے کر ٹنوں کے حساب سے ایفون خرید کر برطانوی سامراج نے چین پہنچائی اور دو عشروں تک چین میں لاگت سے کم قیمت (SUBSIDISED RATES) پر عوام کو مہیا کی تاکہ پوری قوم اس کی عادی ہو جائے۔ مغربی سامراج اس غیر اخلاقی طریقے کو استعمال کر کے دشمن کو ڈیڑھ صدی تک ’خوابِ خرگوش کی نیند سلانے‘ اور عالمی معاملات میں حصہ لینے سے باز رکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ (تا آنکہ بیسویں صدی میں جناب ماؤزے تنگ نے آ کر قوم کو جگایا اور اب مزید نصف صدی بعد چین عالمی اقتصادیات پر بلا شرکت غیرے قابض ہو چکا ہے۔)

(4) اقلیم ہند میں برطانوی سامراج کے طویل المیعاد قیام کی منصوبہ بندی میں برطانوی عسکری اور حکومتی عہدیداران (MILITARY & CIVIL BUREAUCRACY) کو مقامی ہندوستانی تہذیب و ثقافت اور زبان سے آشنا کرانا ضروری تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے کلکتہ میں ہی فورٹ ولیم میں کالج قائم کیا گیا جس میں برطانیہ سے آنے والے

انگریزوں کو مقامی زبان کے علاوہ مقامی کلچر، طور طریقے اور حکومت کے انداز سکھائے جاتے تھے۔ ایک اہم فیصلہ یہ کیا گیا کہ آئندہ برطانوی سامراج کے اہلکاروں کے پورے اقلیم ہند میں مقامی لوگوں سے رابطے اور ابلاغ کے لئے 'اردو زبان کا استعمال ہوگا۔ ہندی زبان یا کوئی اور زبان منتخب کی جاتی تو خلفشار کا خطرہ تھا؛ لہذا ایک ترقی پذیر اور پورے جنوبی ایشیا میں سمجھی جانے والی زبان اردو کا انتخاب کر کے اس کی تعلیم اور فروغ کا کام شروع ہوا۔ اس مقصد کے لئے مقامی سطح پر اردو زبان کے ادیبوں اور شعراء کے ذریعے ایسا لٹریچر اور مواد تیار کیا گیا جو بعد میں فورٹ ولیم کالج میں بطور نصاب رائج کر دیا۔

(5) برطانوی سامراج اقلیم ہند میں وارد ہوا تو اس نے مسلمانوں کو سیاسی، عسکری، اخلاقی اور مذہبی و ثقافتی طور پر یعنی ہر ممکن طریقے پر دوسری اقوام سے پیچھے رکھنے اور 'خوابِ غفلت' میں ڈالنے کے ہتھکنڈے آزمائے۔ چنانچہ ہندوؤں کی مذہبی کتابیں جمع کر کے منضبط کرنا برطانوی سامراج کا ایک کارنامہ تھا ان کی طباعت و اشاعت بھی اس دور میں ہوئی۔ مسلمانوں کو آپس میں ایک دوسرے سے دور کرنے اور ماضی سے کاٹنے کی غرض سے بنگالی زبان کا لکھنے کا انداز عربی رسم الخط (دائیں سے بائیں اور عربی حروف تہجی) کی بجائے انگریزی اور ہندی کے قریب کر دیا اسی طرح سندھی زبان کا طرزِ تحریر (SCRIPT) بھی ایسا کر دیا جو عربی فارسی اور اردو سے مختلف ہو گیا حالانکہ بنگالی زبان میں بے شمار الفاظ عربی زبان کے ہیں مگر طرزِ تحریر (SCRIPT) کے الگ ہونے کی وجہ سے ایک عام اردو دان مسلمان اس کو پڑھ نہیں سکتا۔

اسی طرح سندھی زبان میں فارسی، عربی اور پنجابی کے بہت سے الفاظ مشترک ہیں مگر طرزِ تحریر (SCRIPT) کی تبدیلی سے سندھی زبان (چونکہ سندھ دورِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں ہی داخل اسلام ہو گیا تھا لہذا یہاں ٹھیٹھ اور خالص اسلامی کلچر اور روایات آج بھی موجود ہیں) کی مٹھاس اور اسلام دوستی سے پنجاب اور دیگر قریبی علاقوں کے مسلمانوں کو محروم کر دیا گیا اسی طرح نئے طرزِ تحریر سے سندھ کے مسلمان عربی اور فارسی سے بھی کاٹ کر قرآن و حدیث اور مذہبی لٹریچر سے نا آشنا کر دیے گئے اور آپس میں مسلمان بھائیوں کو ایک دوسرے کی زبان و تحریر نہ سمجھنے کی

وجہ سے اجنبی بنا دیا اس کا ایک نتیجہ یہ ضرور نکلا کہ اردو زبان کو فروغ ہوا اور اس نے اقلیم ہند میں آباد تمام اقوام اور بالخصوص مسلمانوں کے لئے آپس کے رابطے کی زبان بنا دیا۔

(6) انگریزی کو سرکاری زبان بنا دیا گیا جس سے مسلمانوں کو نقصان ہوا ہندو نے انگریز دوستی میں انگریزی زبان اور مغربی علوم سیکھ کر تعلیمی ترقی اور بیداری میں مسلمانوں پر سبقت حاصل کر لی۔ جبکہ مسلمان بالعموم انگریز کو دشمن اور غاصب سمجھتے تھے؛ لہذا اس کی زبان اور علوم سیکھنے کو بھی اس سے تعاون سمجھتے تھے نتیجتاً مسلمان اقلیم ہند میں پھیلتے ہوئے برطانوی سامراج میں حکومتی اعلیٰ عہدوں کے اہل نہ رہے اور یوں حکومتی ایوانوں سے دُور ہو گئے۔

برطانوی سامراج نے حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی اور مسلمان انگریز کو اپنے زوال کا ذمہ دار سمجھتے تھے۔ لہذا ایسٹ انڈیا کمپنی کے اہلکار مسلمانوں پر اعتماد نہیں کرتے تھے اور اپنا وفادار نہیں سمجھتے تھے اسی لیے طویل عرصے تک کسی مسلمان کو مقامی فوج میں شامل نہیں کیا گیا اگر شامل کیا بھی تو۔۔۔ اعلیٰ عہدوں تک نہیں پہنچایا گیا نتیجتاً اعلیٰ فوجی عہدوں کے دروازے بھی مسلمانوں پر بند ہو گئے۔

(7) مسلمانوں کو اقتصادی لحاظ سے کمزور کرنے کے لئے مسلمان زمینداروں سے جاگیریں واپس لے لی گئیں اور انہیں حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا اور سرکاری اور تجارتی لحاظ سے بھی مسلمانوں پر ظلم کے پہاڑ ڈھائے گئے، صنعتوں اور دستکاری کے میدانوں میں بھی مسلمانوں کو ہر ممکن طریقے سے دبا دیا گیا۔ مسلمانوں پر حکومتی اور فوجی عہدوں کے دروازے بند تھے ہی صنعتی شعبہ میں بھی مسلمانوں کو بے دخل کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا گیا۔

عدالتی نظام میں بھی مسلمان اہل علم (علماء و فضلاء) قرآن مجید اور احادیث کی روشنی میں غیر اللہ کے قانون کے مطابق فیصلے کرنے کو حرام سمجھتے تھے لہذا مسلمانوں پر عدالتی نظام میں بھی سرکاری ملازمتوں کے دروازے بند ہو گئے اور مسلمان دنیاوی اعتبار سے اور وسائل دنیوی کے اعتبار سے بہت پیچھے چلے گئے۔

اس دور میں صرف وہ مسلمان طبقہ محفوظ رہا جو کسی وجہ سے انگریز کا وفادار بن گیا تھا اور

برملا انگریز سے رابطے رکھ کر ان سے وفاداری کا دم بھرتا تھا۔ ایسے لوگوں کو برطانوی سامراج نے ہر طرح سے نوازا بھی ہے اور ان کے خاندانوں کے لئے بھی حکومت، فوج اور عدلیہ میں ملازمتوں کے مواقع پیدا کیے ہیں۔

انیسویں صدی کے عالمی حالات

عالمی سطح پر یورپی صنعتی انقلاب کے نتیجے میں جب اقوام یورپ اپنے اپنے ملک سے نکل کر پھیلی ہیں تو دنیا کی کمزور اور پس ماندہ اقوام پر قابض ہوتی چلی گئیں؛ حتیٰ کہ اٹھارھویں صدی کے اختتام تک دنیا میں کوئی ساحل سمندر، کوئی جزیرہ یا آبادی ایسی نہیں تھی جہاں یورپی اقوام نے قدم نہ جمالیے ہوں اور مقامی آبادیوں کو بے دست و پا نہ کر دیا ہو۔

اس انداز میں عالمی وسائل پر قبضہ کرنے اور اپنے تیار شدہ مال کی کھپت اور خام مال کے حصول کی دوڑ میں ہوس نے اگلا قدم یہ رکھا کہ یورپی اقوام آپس میں بھی دست و گریبان ہو گئیں اور حُبِ تَفُوق (THE URGE TO DOMINATE) نے تحتِ برطانیہ اور فرانس کو جنگوں میں آمنے سامنے کر دیا۔ چنانچہ نیپولین پونا پارٹ کی برطانیہ سے مشہور جنگیں، 1813ء کی واٹرلو کی جنگ اور بالآخر برطانیہ کا مصر پر قبضہ اسی ہوسِ اقتدار کا شاخسانہ تھا۔

یورپی استعمار نے اٹھارھویں صدی اور انیسویں صدی میں عثمانی سلطنت کے علاقے فتح کرنے شروع کیے چنانچہ ایک ایک کر کے وسطی افریقہ کے تمام مقبوضات فرانس اور اٹلی وغیرہ کے پاس چلے گئے۔ برطانیہ نے فرانس سے لڑ کر مصر حاصل کر لیا تا کہ بحیرہ روم سے بحیرہ قلزم تک رسائی حاصل کر سکے۔

برطانوی سامراج نے مصر پر بالواسطہ قبضے کے بعد جزیرہ نمائے عرب میں بھی ساحلی علاقوں پر قدم جمانے شروع کیے اور آہستہ آہستہ عربوں کو ترکوں کے خلاف اُکسایا اور مسلمانوں کی ملّی وحدت کو پارہ پارہ کرنے اور مرکزِ خلافتِ ترکی سے علیحدگی کے لئے باہمی نفرت کے بیج بوئے۔ جزیرہ نمائے عرب میں چونکہ مسلمانوں کے انتہائی اہم مذہبی مقامات ہیں لہذا برطانوی سامراج نے یہاں خصوصی تخریبی سرگرمیاں جاری رکھیں اور مسلمان اُمت کے حصّے بخرے کرنے کی کوششوں میں مصروف رہا۔

شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی اصلاحی و جہادی سرگرمیوں کی سرگزشت

سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے جب دہلی آ کر سلسلہ رشد و ہدایت شروع کیا تو 1817ء ہی میں آپ نے سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی اور سید صاحب کے ساتھ **فجوات الفاظ فرمان رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم: فی العُسْرِ وَ الْيُسْرِ وَ الْمَنْشَطِ وَ الْمَكْرَهِ** (طبیعت آمادہ ہو تب بھی اور اپنے آپ پر جبر کرنا پڑے تب بھی، مشکل ہو یا آسانی) اطاعت امیر کرنے کا نمونہ پیش کر دیا۔

اسی زمانے میں سید صاحب کے ساتھ مل کر آپ نے دعوت و اصلاح اور جہاد کی تیاری کا کام شروع کر دیا۔ اس سلسلے میں آپ نے متعدد جگہ پر اسفار کیے اور سید صاحب کے ساتھ رہے۔ ان مقامات میں سہارن پور، پُھلت، گنگوہ، مظفرنگر، دیوبند، کاندھلہ، الہ آباد، بنارس، کانپور اور لکھنؤ شامل ہیں۔ ان اسفار کے نتیجے میں لوگوں کے عقائد و اعمال میں اصلاح ہوئی اور جہاد کا شوق پیدا ہوا۔

گزشتہ کئی صدیوں سے ہند میں حج کا عام چرچا نہیں تھا۔ سمندری سفر مشکل تھا اور زمینی سفر بھی خطرات سے خالی نہیں تھا۔ لہذا شاذ و نادر ہی کوئی آدمی حج کے لئے رختِ سفر باندھتا تھا۔ اکثر شائقینِ علم ہی اعلیٰ تعلیم کے لئے اسلامی مراکز کا سفر اختیار کرتے تھے۔ انیسویں صدی کے شروع میں بھی سمندری راستے انگریزوں کے قبضے میں تھے اور انہیں کے جہاز رواں دواں رہتے تھے جن میں تجارتی سامان کے جہازوں کے ساتھ مسافر جہاز بھی ہوتے تھے۔

سید صاحب نے جہاد کی تیاری کی سلسلے میں لوگوں کو گھروں سے نکالنے کی مشق اور مشکلات کو برداشت کرنے کی تعلیم کے لئے ابتداءً اجتماعی حج کا عندیہ ظاہر فرمایا جس پر لوگ تیار ہو گئے، سفر کے خرچ کے لئے بھی اہل ثروت اور عام مسلمانوں نے دل کھول کر تعاون کیا، انگریزوں نے بھی اس سفر حج کو کوئی خطرہ نہ سمجھا۔ چنانچہ شوال 1236ھ / 1821ء سید احمد شہید 400 ساتھیوں کو لے کر حج کے لئے روانہ ہو گئے۔ یہ ساتھی زیادہ نہیں تھے مگر یہ چار سو ساتھی ہزاروں لوگوں کے دلوں میں حج کے سفر، دین کے لئے گھروں سے نکلنے اور شوقِ جہاد کی شمعیں روشن کر گئے۔ شعبان 1239ھ / اپریل 1824ء کو آپ کی اس سفر حجاز سے وطن واپسی ہوئی۔

اس سارے عرصے میں شاہ اسماعیل شہید دل و جان سے سید صاحب کے ساتھ رہے۔ شاہ صاحب کے دادا شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے پون صدی قبل سفر حجاز کیا تھا اور وہاں ایک عرصہ گزارا تھا؛ وہاں کے حالات شاہ اسماعیل کو معلوم تھے، (حجاز کے مشہور مصلح شیخ محمد بن عبدالوہاب، شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہم جماعت بھی تھے کہ دونوں کے استاد حضرت شیخ محمد حیات سندھی رحمۃ اللہ علیہ تھے) بعد میں بھی شیخ محمد بن عبدالوہاب کے اصلاحی کام اور جہادی مساعی کا تذکرہ دہلی پہنچتا رہتا تھا جو شاہ اسماعیل کے علم میں تھا۔ لہذا قیام حجاز کے دوران شیخ محمد بن عبدالوہاب کے کام، ان کے طریق کار اور ان کی کامیابیوں کا براہ راست سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل کو مشاہدہ ہوا جس سے جذبوں کو جلا ملی۔ آل سعود نے 1818ء میں ہی مصر کے حکمرانوں سے طویل جنگ کر کے سلطنت عثمانیہ کے بڑے علاقے کو اپنے زیر اثر کر لیا تھا جس کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔

اس قافلہ حج کی واپسی پر شاہ صاحب دو برس تک سید صاحب کے ساتھ جہاد کی تیاری میں مصروف رہے، سید صاحب نے لوگوں میں جہاد کا جذبہ پیدا کر دیا، مختلف عزیزوں دوستوں اور حکمرانوں کو خطوط لکھے اور خوب مشورے کے بعد آپ نے کسی ایسے مقام کے انتخاب کا ذہن بنایا کہ جہاں پشت پر مسلمانوں کی حکومت اور عملداری ہو اور ایسا مقام درہ خیبر سے نیچے پشاور کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا جنگی حکمت عملی کے تحت یہی رائے صائب تھی۔ اس لئے کہ انگریزوں سے جہاد شروع کیا جاتا تو دہلی پر تو انگریزوں کا قبضہ تھا انگریزوں کی گود میں بیٹھ کر انگریزوں سے جہاد نہیں ہو سکتا تھا۔ سکھ اور انگریزوں مخالف تھے۔ تاریخ کا بہاؤ ہی ایسا تھا یا ہندو کی خیال تھی کہ اس نے برطانوی سامراج کا ساتھ دینے اور مسلمانوں کو نیچا دکھانے کا فیصلہ کیا تو 1789ء میں ہی سکھ حکومت قائم ہو گئی تاکہ مسلمانوں کو افغانستان سے کوئی مدد نہ مل سکے اور کوئی فاتح بن کر ہند میں قدم نہ جما سکے اور انگریزوں نے بھی ہند پر مکمل کنٹرول تک افغانستان سے کسی مدد کا راستہ مسدود رکھنے کے لیے لاہور تا پشاور سکھ حکومت کو برداشت کیا ہے۔

اس طرح فیصلے کے مطابق اس قافلہ کا پنجاب میں سکھ عمل داری کو بائی پاس کر کے قندھار، کابل کے راستے پشاور پہنچنے کا پروگرام تھا اور شاہ اسماعیل رحمۃ اللہ علیہ اس جہاد کے لئے طویل سفر میں شریک رہے۔ یہ جہادی قافلہ جمادی الثانی 1291ھ، جنوری 1826ء میں ہند کو

دارالحرب قرار دے کر گوالیار، ٹونک، اجمیر، عمرکوٹ، حیدرآباد، پیرجوگوٹھ، شکارپور، بولان، کونٹہ، چمن، قندھار، غزنی، کابل جلال آباد کے راستے درّہ خیبر سے اتر کر پشاور پہنچا۔ ان مقامات سے بھی دعوت جہاد کے ذریعے لوگوں نے اس قافلے میں شرکت کی۔ ربیع الاول 1242ھ یعنی نومبر 1826ء کو یہ لشکر پشاور سے چار سدہ اور پھر نوشہرہ پہنچا۔ یہاں سکھ حکمران رنجیت سنگھ کو جہاد کی شرائط پیش کیں اور بالآخر جنگ کی نوبت آگئی۔

جنگ نوشہرہ میں مجاہدین کو فتح ہوئی اور قریب کے علاقوں میں مسلمانوں کی دھاک بیٹھ گئی۔ سید صاحب نے علاقے میں اسلامی حکومت قائم کر لی اور اسلامی قوانین کا نفاذ کر دیا۔ تاہم سکھوں کی عیارانہ چالوں، بعض علاقائی سرداروں کی بدعہدی اور میدانی علاقوں کے مہاجر مجاہدین کی پہاڑی علاقوں سے عدم واقفیت کی بنا پر کامیابی آہستہ آہستہ پسپائی میں بدل گئی اور بالآخر مجاہدین نے کشمیر کو اپنا مستقر بنا لیا جہاں حالات بہتر نہ ہو سکے اور مجاہدین کا یہ بے لوث قافلہ سکھوں کے خلاف جنگ میں داد شجاعت دیتے ہوئے بالاکوٹ کے مقام پر شکست سے دوچار ہو گیا۔ سید احمد اور شاہ اسماعیل نے مردانہ وار مقابلہ کر کے شہادت پائی اور بہت سے مخلص ساتھی بھی شہادت سے سرفراز ہوئے۔ یہ انہیں مجاہدین کے گرم خون اور ولولوں کا صلہ ہے کہ آج بھی جہاد انہیں علاقوں میں جاری و ساری ہے اور انہیں مجاہدین کی روحیں اور باقیات غیر اللہ کی حکومت و حاکمیت سے نبرد آزما ہیں۔

بنا کردند خوش ر سے بجاک و خون غلطیدن

خدا رحمت کند این عاشقانِ پاک طینت را

مجاہدین اسلام کے اس قافلے کے بچے کھچے لوگ واپس وطن بھی پہنچے اور ان پانچ سالوں میں دہلی اور آس پاس کے علاقوں سے مالی معاونت اور لوگوں کی آمد و رفت بھی جاری رہی جس سے انگریز خائف تھا اور اس نے ان مجاہدین کو شیخ محمد بن عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہ کی سرگرمیوں کے مشابہ قرار دے کر ”وہابی“ مشہور کر دیا جو آج بھی زبان زد عام ہے۔ تاہم شاہ اسماعیل شہید اور ان کے ساتھیوں کی جہادی مساعی میں اور شیخ محمد بن عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہ کی مساعی کے نتیجے میں علاقے فتح کرنے کے عمل بنیادی میں نوعیت کا بہت بڑا فرق تھا، جس کی

تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔

حضرت شاہ اسماعیل رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ہی بیٹا شاہ محمد تھا، جو حالت جذب میں 1268ھ (1852ء) میں لا ولد فوت ہوا۔ اس کے علاوہ کوئی چیز ورثے میں نہ چھوڑی، سوائے ان تصانیف کے جو رد بدعت اور ترویج سنت کے لئے لکھی گئیں تھیں۔ ان میں سے رد الاشرک (عربی زبان میں شرک اور بدعت کے رد میں) ”تقویت الایمان“ (اردو زبان میں رد الاشرک کی آیات و احادیث کا ترجمہ) ”منصب امامت“ (فارسی) ”ایضاح الحق الصریح“ (فارسی) رسالہ یک روزی (فارسی زبان میں تقویت الایمان پر اعتراضات کا جواب) ”رسالہ اصول فقہ“ (عربی) ”عقبقات“ (عربی میں حقائق تصوف کا ذکر) اور قصائد، نعتیں اور خطبات اہم ہیں۔ خطبات کا مجموعہ نواب صدیق حسن خان نے شائع کرایا۔



16

عالم بے بدل، فاضل معقولات و منقولات،

مجاہد آزادی حضرت علامہ

مولانا محمد فضل حق خیر آبادی

رحمۃ اللہ علیہ

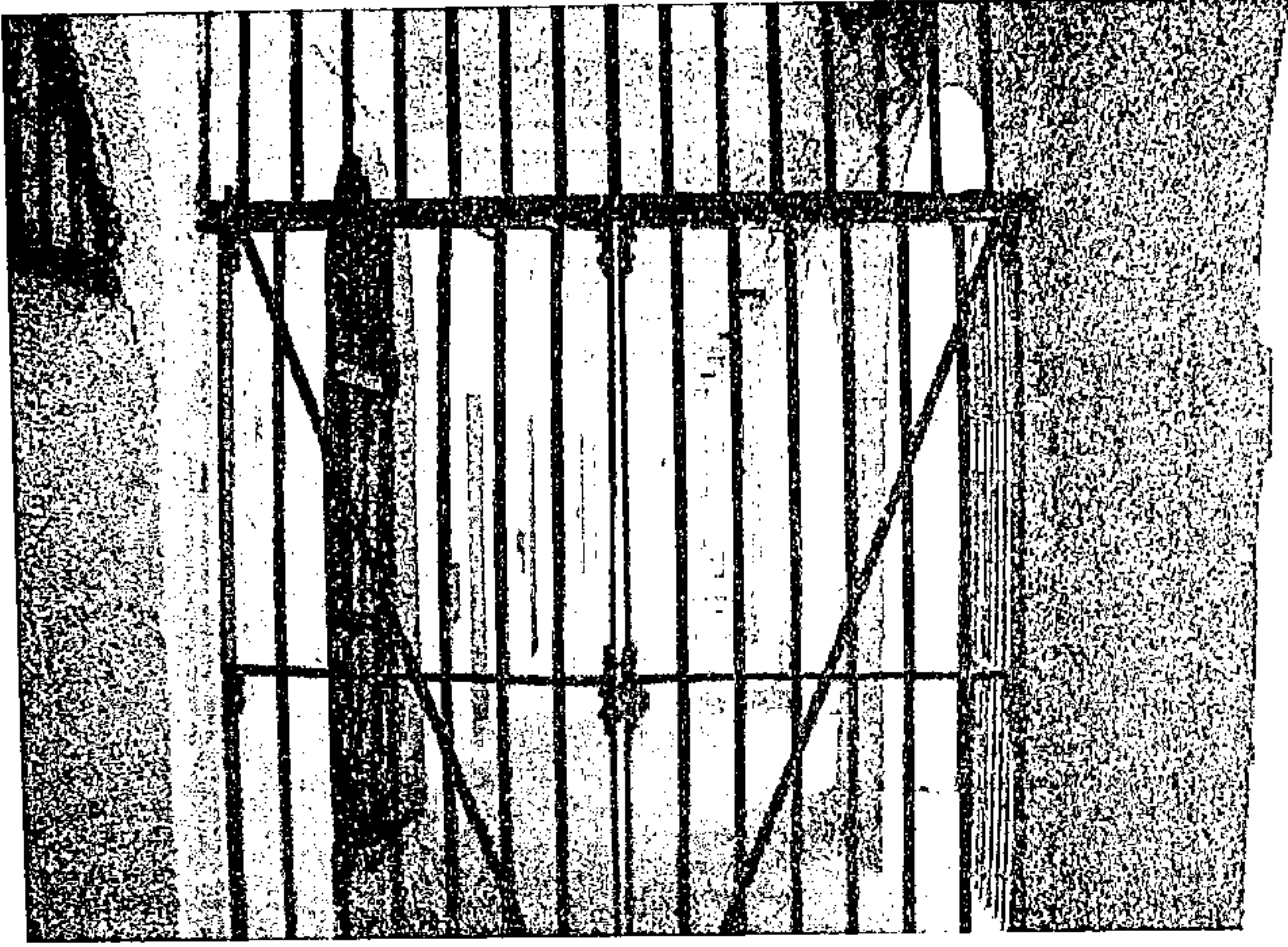
ولادت: 1211ھ / 1797ء خیر آباد، ضلع سیتاپور، صوبہ اتر پریش

1857ء میں انگریز کے خلاف مسلح بغاوت ہوئی تو اس میں نمایاں حصہ لیا۔

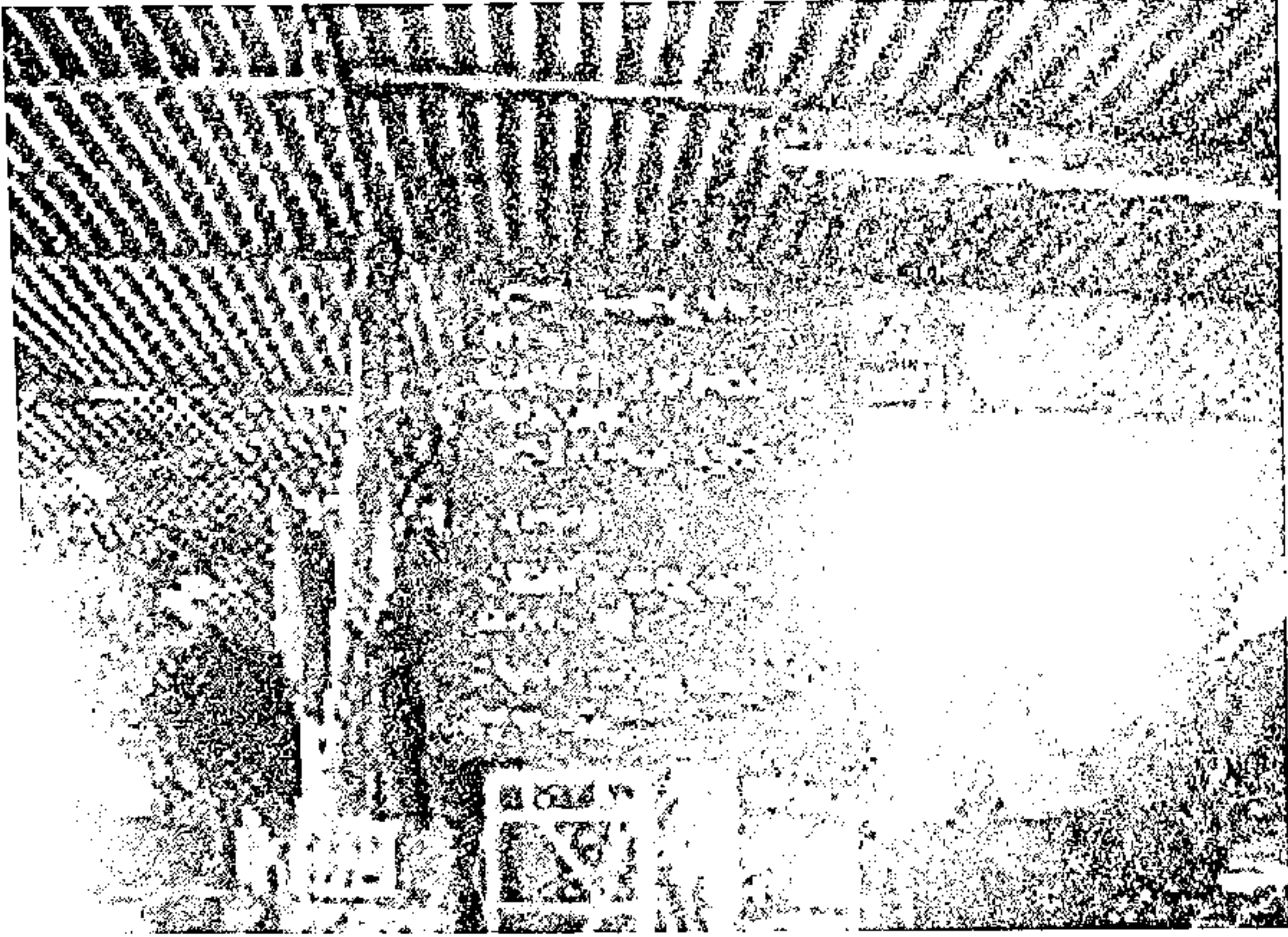
بغاوت کے الزام میں انگریز نے گرفتار کر کے عمر قید کی سزا سنائی۔

جزائر انڈیمان (کالا پانی) میں اسیری کے دوران وفات پائی۔

وفات: 1278ھ / 1861ء انڈیمان



زندانی انڈیمان (کالا پانی)



آخری آرام گاہ: حضرت مولانا فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے جس کے علم و فضل کا چرچا دور دور تک پھیلا ہوا تھا، ان کے والد گرامی مولانا فضل امام خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ علمائے عصر میں ممتاز اور علوم عقلیہ کے اعلیٰ درجے پر سرفراز تھے۔ علامہ صاحب دارالحکومت دہلی میں صدر الصدور کے عہدہ پر فائز رہے اور دینی اور دنیوی نعمتوں سے مالا مال تھے۔ شجرہ نسب 33 پشتوں پر خلیفہ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ معقولات کا علم گھر میں والد گرامی سے حاصل کیا اور منقولات کے لئے اللہ تعالیٰ نے شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اور شاہ عبدالقادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے قدموں میں پہنچا دیا۔ اس طرح علامہ معقولات و منقولات ہر دو علوم میں اعلیٰ مقام تک پہنچ گئے۔ اس اعلیٰ پایہ کے علم کے ساتھ جدوجہد آزادی کی خاطر فرنگیوں کے استبداد کے سامنے آکھڑے ہوئے۔ 1857ء کے ”الثورة الہندیہ“ میں قائدانہ کردار ادا کیا۔ جزائر انڈیمان میں عمر قید کی سزا ہوئی، اس مرد مجاہد نے راہ حق میں دین اسلام کی سر بلندی کی خاطر جان دے دی مگر پائے استقلال میں لغزش نہ آئی ع خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را دوستوں اور بھی خواہوں نے رہائی کی کوششیں کیں اور پروانہ رہائی حاصل کیا۔ علامہ کے صاحبزادے مولانا شمس الحق یہ پروانہ آزادی لے کر جزائر انڈیمان پہنچے تو جنازہ دیکھا۔ معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ کا کل انتقال ہو گیا۔ یہ 12 صفر 1278ھ، 20 اگست 1861ء کا دن تھا۔

اللہ تعالیٰ نے جو اعلیٰ مراتب علامہ فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ کی جلاوطنی کی موت کی صورت میں مقدر کر دیے تھے وہ دوستوں کی کوششوں کے باوجود انہیں مل کر رہے۔ آزادی کی جدوجہد میں قائدانہ کردار ادا کرنے کی وجہ سے کالے پانی کی عمر قید کے علاوہ علامہ صاحب کی

جائیداد بھی ضبط ہوگئی تھی جس کے نتیجے میں ان کی اولاد نے کسمپرسی کی زندگی گزاری۔

یورپی استعمار نے جنوبی ایشیا میں تجارت کے نام پر آ کر چار صدیوں میں ایسے بچے گاڑھے کہ انیسویں صدی کے وسط تک پہنچتے پہنچتے مشرق بعید، مشرق وسطیٰ، امریکہ (شمالی و جنوبی) اور جنوبی ہند پر اپنا تسلط مکمل کر لیا۔ یورپی اقوام جو بظاہر فرانسیسی، اطالوی اور جرمن اور انگریز کہلاتے تھے مگر در پردہ ان کا مشن ایک ہی تھا۔ یہ مشن کی وحدت ہی اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اس مغربی استعمار کے پیچھے ایک مافیا کا ہاتھ تھا اور اب بھی ہے جو اپنے مذموم اور گھناؤنے مقاصد کی تکمیل کے لئے دنیا کے ہر اصول کو بالائے طاق رکھ کر اپنا مطلب نکال لیتا ہے۔ اس کے کئی چہرے ہیں، اصول پرستی کے الگ فورم ہیں اور بے اصولی کے الگ ادارے اور مشن ہیں، مختلف اطراف سے کوشش کر کے نتیجہ اس در پردہ مافیا یعنی صہیونی قوت کے حق میں جاتا ہے۔ یہ یہودی صہیونی قوت ہر ملک، ہر قوم اور ہر شخص نیز ہر مذہب اور اس کے پیروکاروں کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی ماہر ہے اور اپنے مقاصد کے حصول کی طرف پیش قدمی کر رہی ہے۔

1799ء میں آخری چٹان سلطان فتح علی ٹیپو رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت کے بعد انگریز جلد ہی دہلی تک پہنچ گئے اور کوئی قوت مزاحم نہیں ہوئی۔ چند علاقوں میں مقامی ریاستیں اور حکومتیں تھیں انہیں زیر کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ دہلی سے مغرب کی طرف سب سے بڑی ریاست سکھوں کی تھی، 1842ء میں برطانوی سامراج نے قوت کے ساتھ اسے بھی گھٹنے ٹیک دینے پر مجبور کر دیا۔

برطانوی سامراج جہاں بھی گیا اسے عوامی سطح پر مزاحمت اور مخالفت کا سامنا کرنا پڑا سوائے سکھ ریاست کے، جہاں رنجیت سنگھ کے خاندان کی تین پشتوں نے حکومت کی مگر وہ ”سکھا شاہی“ تھی یعنی ظلم و نا انصافی کا دور۔ اس دورِ نامساعد میں مسلمانانِ پنجاب کے لئے اذان اور نماز پر پابندی تھی، مسجدیں تالے لگا کر بند کر دی گئیں تھیں، قرآن پاک لے کر باہر نہیں نکل سکتے تھے، شاہی مسجد لاہور کا سارا خوبصورت پتھر اُتار کر امرتسر پہنچا دیا گیا تھا اور شاہی مسجد کو گھوڑوں کے اصطبل کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ اس دور کی ایک پرانی تصویر شاہی مسجد میں اب بھی آویزاں ہے۔

(شاہی مسجد لاہور کی یہ حالت زار 1937ء تک رہی جب برطانوی ہند میں مقامی صوبائی حکومتیں بنیں اور سرسکندر حیات پنجاب کے وزیر اعلیٰ بنے تو انہوں نے پنجاب کے مسلمان زمینداروں پر ٹیکس (فی ایکڑ) لگا کر رقم جمع کر کے اس مسجد کی تزئین و آرائش کا کام شروع کرایا۔ اس نیک کام کے پیش نظر مسلمانوں نے سرسکندر حیات کی وفات پر اس کی قبر کے لیے اسی شاہی مسجد کے دروازے کے پاس جگہ حاصل کی۔ چنانچہ شاہی مسجد لاہور میں داخل ہوتے ہوئے دائیں طرف سرسکندر حیات کی قبر ہے تو بائیں طرف مفکر پاکستان علامہ محمد اقبال ابدی نیند سو رہے ہیں۔)

چنانچہ برطانوی ہند میں پنجاب واحد جگہ تھی جہاں سکھا شاہی کے مظالم کی وجہ سے انگریز کے آنے پر (مسجدیں واگزار ہوئیں، نماز اور اذان کی اجازت ملی) خوشی کا اظہار کیا گیا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ بعد کے دور میں انگریز نے سب سے زیادہ اعتماد پنجاب پر ہی کیا ہے۔

اسی دور میں (1843ء) کلاچی (کراچی) سے حملہ کر کے سندھ میں سرچارلس نیپڑ کی سرکردگی میں حیدرآباد فتح کر لیا گیا جہاں تالپور حکمران تھے۔ ریاست خیرپور اور ریاست بہاولپور بھی مکمل طور پر برطانوی عملداری میں چلی گئیں۔ سرچارلس نیپڑ کی فوج میں گھوڑسواروں کا ایک بڑا دستہ آغا خانیوں کا شامل تھا اس وفاداری کے بدلے میں انہیں کراچی میں گارڈن کا ایک وسیع علاقہ بخش دیا گیا اور دیگر علاقوں میں بھی بے بہا مراعات سے نوازا گیا۔

موجودہ بلوچستان میں کوئی منظم حکومت تھی ہی نہیں یہ سارا علاقہ بھی تالپوروں کی حکومت کے خاتمے کے ساتھ ہی برطانوی عملداری میں آ گیا۔

1853ء میں بمبئی میں پہلی ریلوے لائن بچھائی گئی۔ اس کے ساتھ کلکتہ سے دہلی تک تار برقی (TELEGRAPH) کا انتظام کیا گیا۔ 1860ء میں کراچی حیدرآباد تک ریلوے لائن کا افتتاح ہو گیا۔ بعد ازاں لاہور سے امرتسر تک ریلوے ٹریک بچھایا گیا۔

1835ء میں برطانوی ہند میں لارڈ میکالے کی سفارشات پر تعلیمی ادارے بنانے کا پروگرام شروع ہوا اور سیکولر نظام تعلیم کے ساتھ حکومت کے زیر سایہ عیسائیت کی وسیع پیمانے پر تبلیغ کا بھی۔ ڈاک کا نظام پہلے ہی موجود تھا لہذا 1850ء کی دہائی کے آغاز پر برطانوی سامراج نے پورے ہند میں اپنے بلا شرکت غیرے اقتدار کے خواب دیکھنا شروع کر دیے۔ حکومت کے

عہد یدارتو اپنی جگہ، عیسائی پادریوں کی جرأت دیکھنے کہ 1855ء میں کلکتہ سے عیسائی پادریوں نے تمام سرکاری ملازمین کو ایک گشتی چٹھی (CIRCULAR) ارسال کی تھی کہ:

”برٹش راج میں تمام ہندوستان میں ایک عملداری ہوگئی ہے، تار برقی سے سب جگہ کی خبر ایک ہوگئی، ریلوے سڑک سے سب جگہ کی آمد و رفت ایک ہوگئی، مذہب بھی ایک چاہیے؛ اس لئے مناسب ہے کہ تم لوگ بھی عیسائی ایک مذہب ہو جاؤ۔“

(اسباب بغاوت ہند: سرسید احمد خان)

عیسائی مبلغین کے مسلمانوں، ہندوؤں وغیرہ سے شہر شہر مناظرے، معیشت کی تباہی اور حکومتی مظالم سے عوام تنگ تھے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ انگریز مسلمانوں کو سیاسی، اقتصادی اور مذہبی طور پر دباننا ضروری سمجھتا تھا؛ اس لئے کہ حکومت ہند برطانوی سامراج نے مسلمانوں ہی سے چھینی تھی اور انگریزوں کے خلاف نفرت کے جذبات بھی مسلمانوں میں زیادہ تھے۔ یہ حالات تھے جن میں مسلمانوں میں برطانوی سامراج کے خلاف بغاوت کر کے آزادی کے حصول کی خاطر جدوجہد کرنے کے امکانات پیدا ہو گئے اور کامیابی کی امید بھی بندھ گئی۔

1857ء کی جنگ آزادی کی ناکامی اور سامراجی قوت کے استحکام کے بعد جنوبی

ایشیا میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ سامراجی قوت نے 1860ء میں محکوم اقوام کے لئے ’کالے قوانین‘ اور رومن لاء کے ظالمانہ عدالتی قوانین نافذ کر دیے۔ یورپی اقوام اپنے ہاں ان قوانین میں ترامیم کے ذریعے کئی اصلاحات کر چکی تھیں تاہم برطانوی ہند کے ’غلاموں‘ کو قابو میں رکھنے کے لئے اس ظالمانہ قانون اور عدالتی نظام کی داغ بیل ڈالی گئی۔

برطانوی سامراج کی وسعت کے پیش نظر ان درپردہ قوتوں نے اسے اپنا خاص آلہ

کار اور برطانوی بادشاہت (MONARCHY) کو اپنے مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنایا۔ اسی

برطانوی بادشاہت یا تاج برطانیہ کے ذریعے عیسائیت کو کنٹرول کیا۔ تاج برطانیہ کتھولک چرچ کا

محافظ ہے اور چرچ آف انگلینڈ ہی دنیا بھر کی عیسائی مشنری سرگرمیوں کا ذمہ دار ہے۔ ویٹی کن

بظاہر آزاد ریاست ہے مگر اس ریاست کا اور اس کے تحت ساری دنیا میں عیسائیت کے پھیلاؤ کے

ال کا بھٹ کون پورا کرتا ہے؟ یورپی ممالک سیکولر ازم کی آڑ میں تھرڈ ورلڈ میں بالعموم اور مسلمان

ممالک میں بالخصوص عیسائیت کی تبلیغ کے لئے کام بھی کرتے ہیں اور مختلف ممالک کے چرچ مشن اپنے اپنے ملک کے ناموں سے ایک ہی علاقے میں کام کرتے ہیں آپس کے اختلافات کے باوجود مسلمانوں کے سامنے متحد رہتے ہیں۔ مثلاً کتھولک چرچ، ٹرینیٹی چرچ، پروٹسٹنٹ چرچ، آپس میں نظریاتی بعد رکھنے کے باوجود مسلمانوں کو گمراہ کرنے پر متفق الخیال ہیں۔ صرف پاکستان میں کوئی درجن بھر سے زیادہ چرچ مشن کام کرتے ہیں اور وہ ایک دوسرے کو ہمارے ہاں کے مذہبی اختلاف اور فرقہ واریت سے کہیں زیادہ شدت سے غلط سمجھتے ہیں مگر مسلمانوں کو بے دین بنانے کے لیے متحد رہتے ہیں کہ یہی 'مشن' ان کے درمیان مشترک ہے۔

یہی صہیونی قوت تھی جس نے برطانوی بالادستی کے باوجود امریکہ میں برطانوی اقتدار کے خلاف جنگ کرا دی اور امریکہ کی جنگ آزادی کے نام پر پہلے خانہ جنگی (CIVIL WAR) اور پھر برطانوی سامراج کا تخت الٹ دیا گیا اور 1776ء میں ہی برطانیہ سے آزادی حاصل کر لی۔ اس آزادی کی یادگار وہ آزادی کا مجسمہ ہے جو نیویارک کے قریب نصب ہے۔ اس آزادی سے اس مافیا کا ایک دوسرا مشن پورا ہوتا تھا چرچ آف انگلینڈ کے ذریعے عیسائیت کا فروغ، پروٹسٹنٹ عیسائیوں کے مفادات کے تحفظ کے لئے بنک آف انگلینڈ (سود کو حلال کر کے وسائل فراہم کیے گئے) اور امریکہ کی آزادی کے ذریعے سیکولرازم، آزادی — مادر پدر آزادی۔ یہ آزادی کا لفظ پہلی نظر میں قوموں کو گمراہ کرنے کے لئے مغرب اور صہیونیت نے استعمال کیا اور اب بھی آزادی کے نام پر تحریکوں میں مغرب تعاون کرتا ہے مگر ہمارے نزدیک آزادی کے معنی اور ہیں اور صہیونیت کے نزدیک اور۔ صہیونی تصور آزادی نام ہے ہر قانون، اخلاق، مذہب سے آزادی کا۔ انسان کو سماجی بندھنوں، اخلاق کی بندھنوں اور مذہب کے حلال و حرام سے آزاد کر دینا۔ گزشتہ دو صدیوں سے امریکہ سے شروع ہو کر یہ 'آزادی' کا زہر ساری دنیا کی اقوام کے ذہنوں میں گھول دیا گیا ہے اور بالخصوص مسلمان نوجوانوں کے ناچختہ ذہنوں میں میڈیا اور تعلیمی میدان میں نصاب کی تبدیلی کے ذریعے یہی زہر انڈیلا جا رہا ہے۔ بقول

ہو فکر اگر خام تو آزادی افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

1802ء میں انگریزوں کے دہلی تک رسائی اور انگریز ریڈیڈنٹ کمشنر کے مغل بادشاہ کے ساتھ بیٹھنے کے فیصلے کے بعد جنوبی ہند میں برطانوی سامراج نے صہیونی مقاصد کے فروغ کے لئے یہ دونوں طریقے آزمائے اور استعمال کیے۔ یعنی ایک طرف عیسائیت کی تبلیغ اور محکوم اقوام کے مذہب کو بدل دینا اور دوسری طرف نظامِ تعلیم کو بدل دینا۔ تاکہ ایک سیکولر تعلیمی نصاب ہو جو ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، یہودی، بدھ مت سب پر ٲھیں۔ بظاہر یہ بڑی ”بیٹھی گولی“ لگتی ہے اور آج بھی اس کے پرستار کثرت سے مل جائیں گے لیکن درحقیقت یہ ’زہرے اور شوگر کوٹڈ (SUGAR COATED) ہے۔ اس بات کو علامہ فضل حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ نے سمجھا اور محسوس کیا۔ جب وہ ”کالے پانی“ میں ’عمرقید‘ کاٹ رہے تھے تو انہوں نے فرصت کے اوقات میں نے ایک تحریر لکھی جو ان کے متروکات میں ملی اور ان کی اولاد کے ہاتھوں میں رہی۔ صاف ظاہر ہے کہ 1857ء کے بعد کے قریبی عرصے میں اس ”باغیانہ“ تحریر کی اشاعت کا موقع نہیں تھا۔ یہ تحریر جسے مولانا ابوالکلام آزاد نے ”الثورہ الہندیہ“ (انقلاب ہند) کے نام سے شائع کرنے کا مشورہ دیا وہ تحریر پڑھنے کے قابل ہے۔ اس میں علامہ فضل حق خیرآبادی لکھتے ہیں:

”انگریزوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مذہبی بنیادوں پر فرقوں کا اختلاف تسلط و قبضہ کی راہ میں سنگ گراں ثابت ہوگا اور سلطنت میں انقلاب پیدا کر دے گا اس لئے پوری تندہی اور جانفشانی کے ساتھ مذہب و ملت کے مٹانے کے لئے طرح طرح کے مکر و حیلہ سے کام لینا شروع کیا۔ انہوں نے بچوں اور ناسمجھوں کی تعلیم اور اپنی زبان و مذہب کی تلقین کے لئے شہروں اور دیہات میں مدرسے قائم کیے۔ پچھلے زمانہ کے علوم و معارف اور مدارس و مکاتب کے مٹانے کی پوری کوشش کی۔

دوسری ترکیب یہ سوچی کہ مختلف طبقات پر قابو اس طرح حاصل کیا جائے کہ زمین ہند کے غلہ کی پیداوار کا شتکاروں سے لے کر نقد دام ادا کیے جائیں اور ان غریبوں کو خرید و فروخت کا کوئی اختیار نہ چھوڑا جائے اس طرح نرخ کے گھٹانے بڑھانے اور منڈیوں تک اجناس پہنچانے اور نہ پہنچانے کے خود ہی ذمہ دار بن بیٹھیں اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ خدا کی مخلوق ’مجبور و معذور ہو کر ان کے

قدموں میں آپڑے اور خوراک وغیرہ نہ ملنے پر ان کے حکم کی تعمیل اور ہر مقصد کی تکمیل کرے۔“

پہلی سکیم کے لئے لارڈ میکالے کے یہ جملے کافی سند ہیں:

”ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہیے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو اور یہ ایسی جماعت ہونی چاہیے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر ذوق اور رائے، زبان اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو۔“

دوسری سکیم پر عمل ہوا ہوا یا نہ ہوا ہو لیکن اس چار سالہ زمانہ جنگ میں کنٹرولی عملدرآمد نے باشندگان ہند کی آنکھیں کھول دی ہیں۔ غلہ کا ملنا دشوار، کنٹرول کی دکانوں سے لینے میں عزت و آبرو اور وقت عزیز کی بربادی، شہر میں ذرا سی گڑ بڑ پر گوداموں اور دکانوں کی قفل بندی، ان سب مصیبتوں کا مستقل ہر کہومہ کو سامنا رہا ہے۔

11 جولائی 1946ء سے پوسٹ مینوں اور کم تنخواہ والے ملازمین پوسٹ آفس کی جائز

احتجاجی ہڑتال پر راشن کی سہولتیں چھین لینے کی، مرکزی حکومت کی طرف سے دھمکی نے علامہ کے بیان کو بالکل سچ کر دکھایا۔ کیا سچا ارشاد ہے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا:

اتَّقُوا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ ، فَإِنَّهُ يَنْظُرُ بِنُورِ اللَّهِ

”مؤمن کی فراست سے ڈرتے رہو، یہ اللہ کے نور سے دیکھ اور سمجھ لیتا ہے“

اسی تعلیمی سکیم اور انگریزی نظام تعلیم کے پھیلنے پر پورے برطانوی ہند میں ایک خاص

تعلیم یافتہ طبقہ پیدا ہوا جو مذہب سے بیزار تھا اور اس کے ذہن میں خدا، وحی، آخرت، رسول اور

مذہب کا سرے سے ”خانہ“ ہی نہیں تھا۔ صرف نام اور شناخت کے اعتبار سے وہ کسی مذہب سے

متعلق رہتے تھے۔ برطانوی ہند کے مسلمانوں میں اس سے ”ذہنی ارتداد“ پیدا ہوا، ماسوائے اس

کے جس کو اللہ تعالیٰ بچالے اور وہ کوشش کر کے اس دلدل سے نکل آئے اور اسلام کو شعوری طور پر

قبول کر لے۔ اسی عمومی ذہنیت اور تعلیمی اثرات پر مولانا اکبر الہ آبادی نے خوب گرفت فرمائی ہے:

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی جا جا کر تھانے میں

کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا

کئی عمر ہوٹلوں میں ، مرے ہسپتال جا کر

اور انگریزی تعلیمی پالیسی کو انسانیت کش اور مسلم کش قرار دیا اور فرنگی استبداد کو فرعون سے تشبیہ دی:

یوں قتل کے بچوں سے وہ بدنام نہ ہوتا

افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

لارڈ میکالے کی رپورٹ (1835ء) کے وقت مسلمانوں میں خواندگی کی شرح

84 فیصد تھی جو اس غلامانہ اور خدا بیزار و خدا ناشناس نظام تعلیم کے غلغلے اور گلی گلی کوچے

کوچے سکولوں کی بہتات کے باوجود 43 فیصد ہے۔ عوامی سطح پر خواندگی بھی ہاتھ نہ آئی اور

بے دینی اور خدا ناشناسی کی لعنت مزید مسلط ہو گئی جس سے مغرب میں تو ہے ہی عام ہمارے

ہاں بھی سیکولر ازم، آزاد خیالی اور لبرل ازم کی وبا پھیل چکی ہے اور انسانیت اخلاقی لحاظ سے

ایسی تہی دست و تہی دامن ہو گئی کہ آگے تباہی اور موت کے سوا کچھ نہیں۔ اس ایک موثر

علاج 'توبہ' ہے جس کی طرف متوجہ ہونا ماحول کے چلن کے خلاف ہے۔

مولانا شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے مابین چند مسائل

میں علمی مباحثہ اور نزاع پیدا ہو گیا تھا تاہم دونوں اُمت مسلمہ کے بہی خواہ اور مخلص تھے اہل علم اس

اختلاف کے باوجود دونوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ علامہ فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک

سوانح نگار مولانا محمد عبدالشاہد خان شیروانی لکھتے ہیں:

”ایک (مولانا شہید) نے جہاد بالسیف کر کے بالاکوٹ کے مقام پر 1246ھ میں

شہادتِ جہری حاصل کی تو دوسرے (علامہ فضل حق) نے ”أَفْضَلُ الْجِهَادِ

كَلِمَةٌ حَقٌّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ“ پر عمل پیرا ہو کر فتوے دے کر جہادِ لسانی و قلمی

کرتے ہوئے 1278ھ میں جزیرہ انڈیمان میں بہ حیثیت اسیر فرنگ مرتبہ شہادت

سری پایا۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

دوسری طرف دیکھئے تو ایک مجاہد اعظم بوقت شہادت سید احمد شہید بریلوی کا دامن عقیدت تھامے ہوئے نظر آ رہا ہے تو دوسرا سر آمد اولیاء عہد حضرت دھومن شاہ دہلوی کا خرقة ارادت زیب تن کیے ہوئے جلوہ آ رہا ہے۔ ایک اگر 'تقویۃ الایمان' اور 'صراطِ مستقیم' لکھ کر اپنے خیال کے مطابق حلقہ بگوشانِ اسلام کی مذہبی خدمت انجام دے رہا ہے تو دوسرا "روض المجحود فی تحقیق وحدۃ الوجود" تصنیف کر کے اہل عرفان کے ایمان و ایقان کو مستحکم بنا رہا ہے اور صدہا قصائدِ نعتیہ زادِ راہِ آخرت اور توشہ جادہ عاقبت بن رہے ہیں۔

علامہ موصوف نے ایک رسالہ وحدۃ الوجود پر لکھا تھا اس رسالہ کے آخر میں جو وصیت فرمائی ہے اس سے ان کے دل میں خشیت باری تعالیٰ اور باطنی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے اس کا لفظ لفظ اعتراف قصور اور خشیت رب غفور پر دلالت کرتا ہے۔ فرماتے ہیں:

”بہترین وصیت یہی ہو سکتی ہے کہ خدا سے ظاہر و باطن دونوں حالتوں میں ڈرتا رہے اگرچہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو اپنے آپ کو بھول کر دوسروں کو نیکی کی ہدایت کرتا ہے۔ کس قدر افسوس ہے کہ میں اپنی عمر خواہشات میں برباد اور اپنی زندگی بد اعمالی میں تباہ کرتا رہا۔ اپنی عزت و توقیر و اہیات باتوں کی وجہ سے گراتا اور اپنی پونجی کی بڑی مقدار مٹاتا رہا۔ حیات کے خوشگوار دن اترانے میں اور بہترین ایام لہو و لعب میں گزارتا رہا۔ خدا مجھے اور تمہیں معاف کرے اور اپنی رحمت کاملہ سے ان لغزشوں سے درگزرے۔ ہم سب کو اعمالِ نیک کی توفیق دے اور اپنے مقبول بندوں، انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کا رفیق بنائے۔“

کیا عظیم لوگ تھے اس بلند مرتبہ پر فائز اور یہ اعترافِ تقصیرات۔ اسی نفسیاتی کیفیت کے لئے دعا تلقین فرمائی ہمارے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے

اللَّهُمَّ اجْعَلْنِي فِي عَيْنِي صَغِيرًا وَ فِي عَيْنِ النَّاسِ كَبِيرًا (آمین)
 ”اے اللہ مجھے اپنی نظروں میں چھوٹا بنا دے اور لوگوں کی نگاہوں میں بڑا بنا دے“



علامہ فضل حق خیر آبادی کی وصیت

”بہترین وصیت یہی ہو سکتی ہے کہ خدا سے ظاہر و باطن دونوں حالتوں میں ڈرتا رہے اگرچہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو اپنے آپ کو بھول کر دوسروں کو نیکی کی ہدایت کرتا ہے۔ کس قدر افسوس ہے کہ میں اپنی عمر خواہشات میں برباد اور اپنی زندگی بد اعمالی میں تباہ کرتا رہا۔ اپنی عزت و توقیر و اہیات باتوں کی وجہ سے گراتا اور اپنی پونجی کی بڑی مقدار مٹاتا رہا۔ حیات کے خوشگوار دن اترانے میں اور بہترین ایام لہو و لعب میں گزارتا رہا۔ خدا مجھے اور تمہیں معاف کرے اور اپنی رحمت کاملہ سے ان لغزشوں سے درگزر کرے۔ ہم سب کو اعمال نیک کی توفیق دے اور اپنے مقبول بندوں، انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کا رفیق بنائے۔“

17

امام الاولیاء و العلماء، مجاہد آزادی

حضرت

امداد اللہ مہاجر مکی

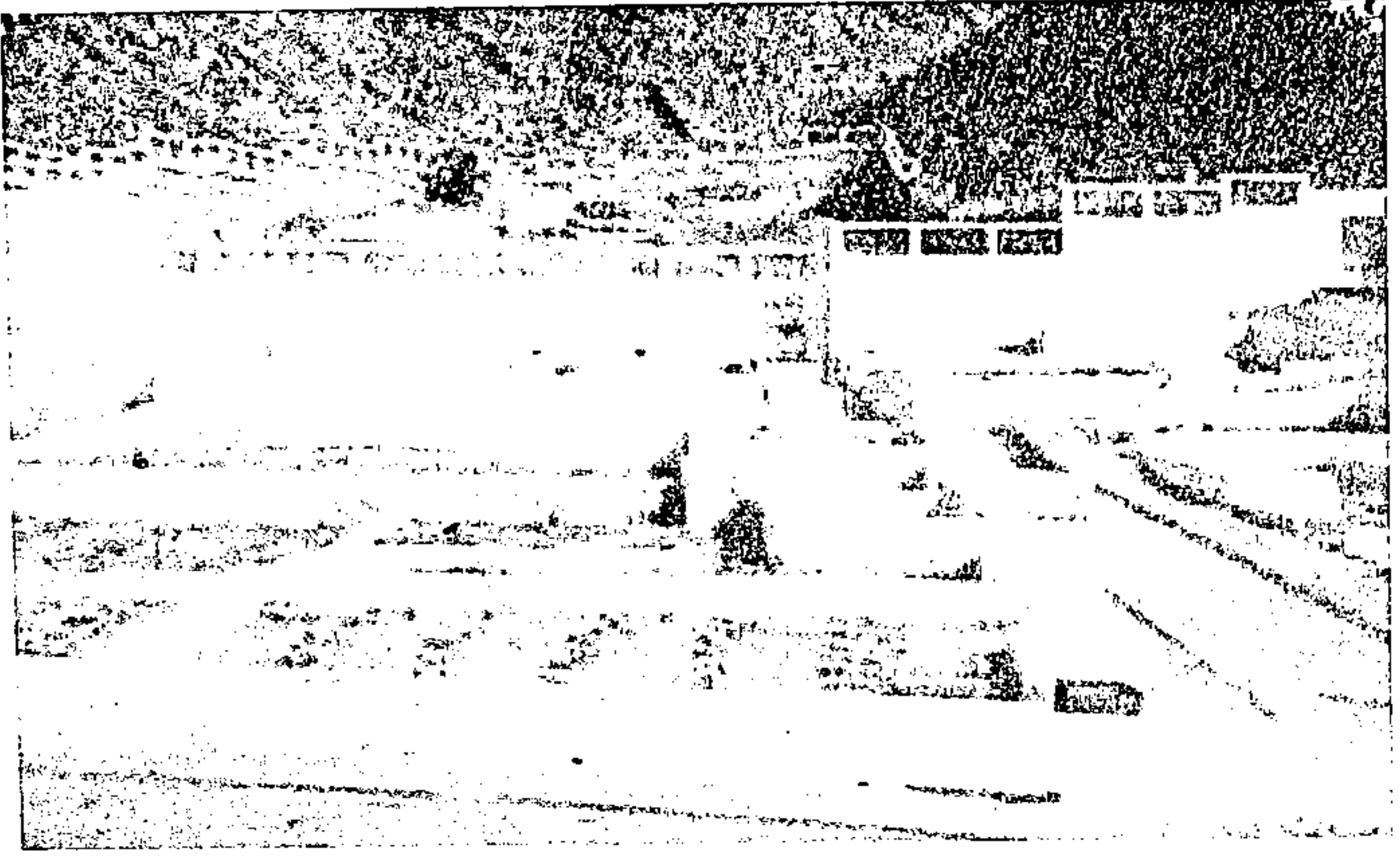
رحمۃ اللہ علیہ

ولادت: 1233ھ / 1818ء نانوتہ (ضلع سہارنپور)

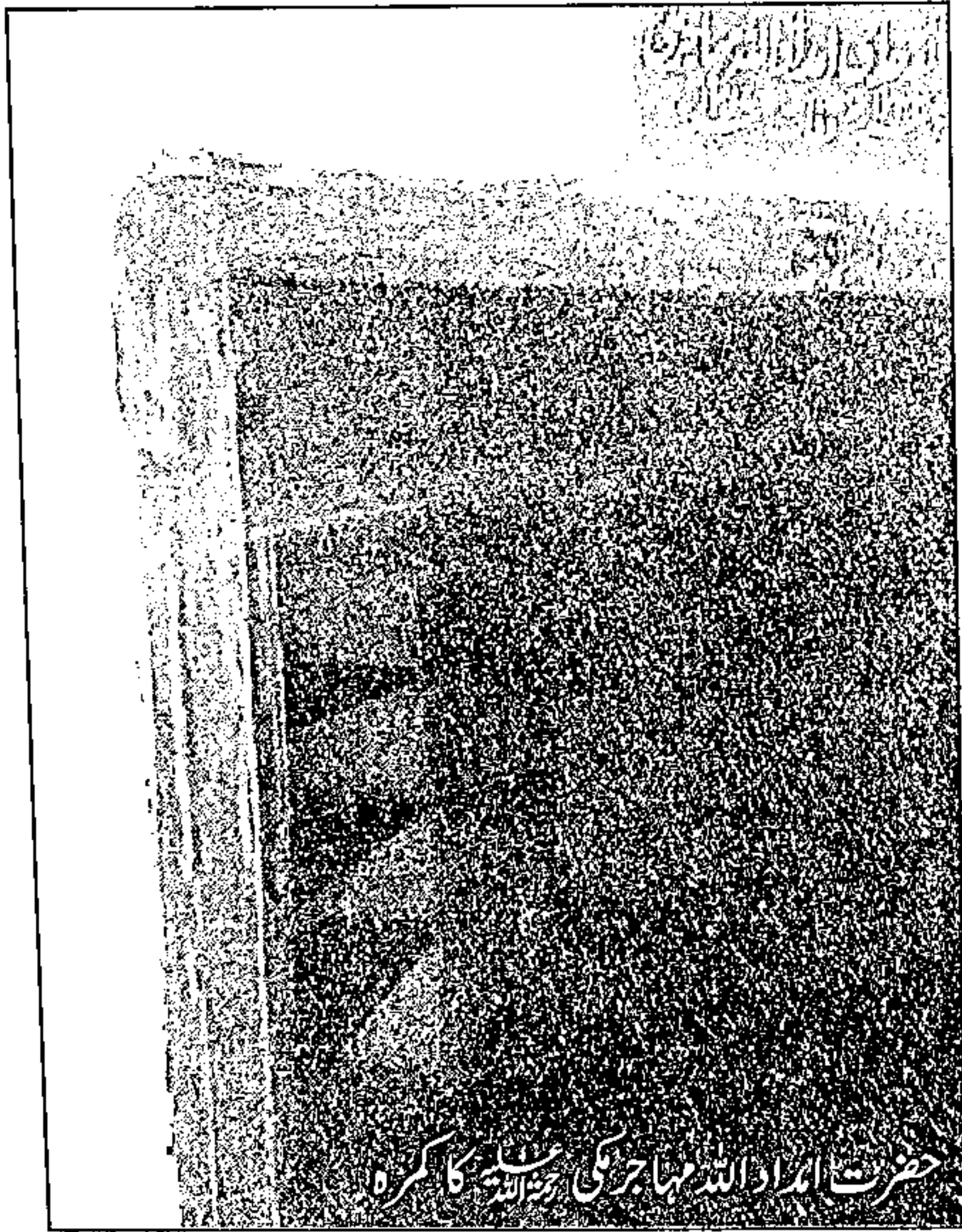
1857ء کی جنگ آزادی میں سرگرم حصہ لیا۔

ہندوستان میں بد نظمی کی وجہ سے 1859ء میں مکہ مکرمہ کی طرف ہجرت کی۔

وفات: 1317ھ / 1899ء مکہ مکرمہ (جنت المعلیٰ)



مکہ مکرمہ میں واقع جنت المعلیٰ کا قبرستان
جہاں حضرت شیخ امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ مدفون ہیں



حضرت امداد اللہ مہاجر تکی رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے بزرگ، ولی کامل، صوفی اور عالم دین تھے۔ نانوتہ ضلع سہارنپور میں پیدا ہوئے، والد کا نام حافظ محمد امین تھا، نسب کے لحاظ سے فاروقی تھے۔ والد نے امداد حسین نام رکھا لیکن مولانا محمد اسحاق محدث دہلوی نے امداد حسین کی بجائے امداد اللہ کے نام سے نوازا۔ تاریخی نام ظفر احمد ہے۔ ابھی سات سال کے تھے کہ والدہ کا انتقال ہو گیا۔ آپ کے گھر والوں نے آپ کی پڑھائی پر کچھ خاص توجہ نہ دی۔ خود تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنے باطنی شوق سے قرآن مجید حفظ کرنا شروع کر دیا۔ اگرچہ بعض رکاوٹیں ایسی آئیں جو قرآن مجید حفظ کرنے میں مانع رہیں۔ سولہ سال کی عمر میں مولانا مملوک علی نانوتوی (جن سے آپ کا نہیالی تعلق تھا) کے ہمراہ دہلی کا سفر کیا اور اسی زمانہ میں چند مختصرات فارسی اور کچھ صرف و نحو کی تحصیل کی۔ مشکوٰۃ شریف کا ایک ربع مولانا محمد قلندری محدث جلال آبادی سے پڑھا اور ”حسن و حسین“ و ”فقہ اکبر“ مولانا عبدالرحیم نانوتوی سے پڑھی۔ اس زمانہ میں آپ نے خواب دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہیں، لیکن جلال کی وجہ سے قدم آگے نہیں بڑھتا۔ اچانک ان کے جدا مجد حضرت بلاقی تشریف لائے اور ہاتھ پکڑ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ لے کر حضرت میاں جیو کے حوالے کر دیا۔ اس خواب کے بعد ایک عرصہ تک اضطراب کی حالت میں رہے۔ کئی سال بعد ان کے ایک استاد مولانا محمد قلندر محدث جلال آبادی، حضرت میاں جی نور محمد جھانوی کی خدمت میں لے گئے۔ چنانچہ ایک مدت تک حضرت میاں جیو کی خدمت میں رہ کر ریاضت و مجاہدہ کے بعد سلوک کی تکمیل فرمائی اور خلافت عطا ہوئی۔ 1262ھ / 1844ء میں زیارتِ حرین شریف سے مشرف ہوئے۔ ارکان حج کی ادائیگی کے بعد مکہ مکرمہ میں شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں قیام کیا اور ان سے فیوض و برکات حاصل

کرنے کے بعد مدینہ منورہ میں روضہ اقدس پر حاضری دی اور دل کو تسکین نصیب ہوئی۔ واپسی میں چند روز مکہ مکرمہ میں قیام کیا اور 1262ھ / 1846ء میں وطن واپس لوٹے۔ حج سے واپسی کے بعد اپنے پیر بھائی حافظ محمد ضامن کے شدید اصرار پر بیعت لینا شروع کی۔ علماء میں سب سے پہلے مولانا رشید احمد گنگوہی نے بیعت کی۔ ان کے علاوہ مولانا محمد یعقوب نانوتوی آپ کے بھانجے، مولانا محمد اشرف علی تھانوی، مولانا احمد حسن کانپوری، مولانا محمد حسین الہ آبادی، مولوی صفات احمد غازی پوری، مولوی محمد شفیع، مولانا فیض الحسن سہارنپوری، مولانا محمد افضل ولایتی، مولانا عبدالسمیع بیدل، مولانا مفتی لطف اللہ علی گڑھی، شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا حسین احمد مدنی وغیرہ ہم نے بیعت کی۔ علماء میں سے آپ کو مولانا قاسم نانوتوی سے خاص تعلق تھا۔ آپ کہا کرتے تھے کہ جس طرح مولانا روم شمس تبریز کی زبان ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ نے قاسم نانوتوی کو میری زبان بنایا ہے۔

مولانا امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑا پر آشوب زمانہ پایا۔ برطانوی سامراج کا تخت دہلی پر قبضہ — تحریک شہیدین — سکھ دور حکومت، 1857ء کی جنگ آزادی میں سرگرم حصہ — مگر تحریک آزادی کی ناکامی، مسلمان زعماء، نوابین، رؤساء اور سرگرم مجاہدین کی گلی گلی پھانسیاں اور چوکوں، چوراہوں میں درختوں پر لٹکتی لاشیں ابھی بھولی نہیں تھیں کہ 1860ء میں برطانوی سامراج کا پورے ہند (طورخم سے راس کماری تک) پر قبضہ ہو گیا اور اسلامی قوانین کے بجائے ظالمانہ استبدادی قانون رومن لاء کو بصورت تعزیرات ہند نافذ کر دیا گیا۔ مزید برآں مسلمانوں کی عملی، علمی، اقتصادی اور سیاسی پس ماندگی، جبکہ ہندو کی بیداری انگریزوں سے دوستی، مغربی علوم کے حصول میں پیش قدمی، تجارت و صنعت میں سرگرمی سے حصہ اور سرکاری ملازمتوں، بیوروکریسی، عدلیہ، پولیس اور فوج میں بھرتی کی سبقت، ہندو کی عمومی خوش حالی اور مسلمانوں کی زبوں حالی اور کسمپرسی کا نقشہ جگر خون کرنے کے لئے کافی تھا۔

1857ء کی تحریک آزادی کے بعد 1860ء میں برطانوی سامراج نے طویل منصوبہ بندی کر کے انتظامی اصلاحات کیں اور پورے ہند کا انتظامی کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ صوبے، ضلع اور تحصیل کی سطح پر عدالتیں قائم ہوئیں۔ قانون ضابطہ فوجداری و دیوانی نافذ ہوا،

جج مقرر ہوئے، تھانہ پولیس کچہریوں کا نظام نافذ ہوا۔ ملکہ وکٹوریہ کے یہ الفاظ بڑے مشہور ہیں کہ اس نے 1860ء کے لگ بھگ مسلمانوں کو جہادی سرگرمیاں ختم کرنے کو کہا تھا:

“WOULD YOU LIKE TO BE GOVERNED BY
SWORD OR BY PEN”.

حقیقتاً سامراج کے خلاف سرگرم مزاحمت نے عمومی طور پر دم توڑ دیا اور سامراجی جبر کی حکمرانی کا آغاز ہوا۔ اگرچہ یہ قانون ہند کے باسیوں، محکوم عوام اور غلاموں کو قابو میں رکھنے کا قانون تھا مگر پھر بھی مجاہدین نے کئی علاقوں میں جزوی طور پر عرصے تک انگریز کے ناک میں دم کیے رکھا اسی لئے اس نے ریلوے کے نظام کو وسعت دے دی تاکہ ہر علاقے میں بروقت فوجی کارروائی کی جاسکے۔ (1930ء تک جتنے پل اور بیراج بنے ان پر دونوں طرف مسلح چوکیاں بنائی جاتی تھیں تاکہ مقامی مزاحمت کا مقابلہ کیا جاسکے۔ سندھ میں خٹروں نے 1941ء تک انگریزوں کو پریشان کیے رکھا ہے)۔ تاہم — مسلمانوں میں صف اول کی ساری قیادت کے پھانسی پا جانے یا مارے جانے یا کالے پانی کی جلا وطنی کی سزا پانے کی وجہ سے طویل عرصے تک مسلمانوں میں کوئی فعال اور موثر قیادت نہیں ابھر سکی۔

1860ء سے 1900ء کا عرصہ وہ ہے جس میں برطانوی ہند میں قبرستان کی سی خاموشی چھائی رہی۔ انگریزی نظام کے ذریعے مغربی تعلیم کا رواج عام ہو گیا اور اسی کے ذریعے ملازمتوں کا حصول ممکن تھا۔ مسلمان اس سے بالعموم دور رہے۔ سر سید احمد خان نے اس سلسلے میں مسلمانوں میں کام کیا اور انہیں مغربی علوم پڑھنے اور تعلیم کے حصول پر آمادہ کیا۔ ایک طرف 1867ء میں علی گڑھ کا پرائمری مدرسہ قائم ہوا جو بعد میں ترقی کرتا ہوا کالج بنا اور پھر یونیورسٹی بن گیا اور دوسری طرف دیوبند میں 1867ء میں اناروالی مسجد میں ایک استاد اور ایک شاگرد سے دارالعلوم دیوبند کی ابتدا ہوئی جو بعد میں ترقی کر کے جامعہ ازہر (مصر) کے پائے کا مرکز بن گیا۔ علماء کے زیر اثر مجاہدین آزادی نے دیوبند کا راستہ اختیار کیا اور انگریز دشمن کی پالیسی اپنائے رکھی۔ 1885ء میں ایک انگریز نے ہی برطانوی ہند کے عوام کے حقوق کے لئے آل انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد رکھی، اسی دور میں ملک میں بلدیاتی نظام رائج کیا گیا اور الیکشن کے ذریعے

مقامی سطح کے مسائل ان کے سپرد کر دیے گئے۔ کانگریس میں ابتدا میں ہندوں کے علاوہ پارسی اور آغا خانی زیادہ سرگرم ہوئے یہی تو میں برطانیہ کی بحری تجارتی سرگرمیوں کے ناطے برطانوی لوگوں کے زیادہ قریب تھیں مسلمانوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہی۔

تحریک شہیدین اور جہاد آزادی 1857ء کے بعد دیوبند کے مزاج کو دیکھ کر انگریزوں نے مسلمانوں میں جہاد کا جذبہ ختم کرنے کے لئے ایک فتنہ کھڑا کر دیا۔ ویسے تو مغربی تعلیم کی آمد میں آزادی نسواں، مخلوط تعلیم، مغربی حکمرانوں اور ان کے زیر اثر مقامی حکام اور اعلیٰ طبقات کی طرز بود و باش اور عورتوں کی بے لباسی ہی ہر مسلمان کو اپنے طرف متوجہ کر کے مزاحمت اور جہاد کا راستہ اختیار کرنے سے ہٹا دینے کے لئے کافی تھی۔ تاہم مذہبی مزاج کے مسلمانوں کے لئے انگریز اور صہیونی منصوبہ سازوں نے پنجاب کے ایک دیہات سے مرزا غلام احمد قادیانی کا فتنہ کھڑا کر دیا اور اس سے (خود ساختہ) نبوت کا دعویٰ کروا دیا اور جہاد کے خاتمے کا فتویٰ جاری کروا دیا، جس پر مسلمان علماء نے اس کا بھرپور تعاقب کیا اور آج تک کر رہے ہیں۔ لیکن اس سے سامراج کے منصوبے اور ذہن کے پڑھنے میں اہل علم کو دقت نہیں ہوتی کہ سامراج جہادی سرگرمیوں سے کس حد تک پریشان ہے۔

[یہی جہادی سرگرمیاں آج بھی صہیونی دماغوں اور اس کے آلہ کار امریکی گماشتوں کو پریشان رکھتی ہیں اور آج کے ”مجاہد“ کو دہشت گرد سمجھا جاتا ہے۔ ”مجاہدین“ کو بدنام کرنے کے لئے ہر ”بم دھماکہ“ اور ”تباہی کا منصوبہ“ انہیں کے سر دھوپ دیا جاتا ہے تاکہ عمومی طور پر ہر مسلمان (عوام اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ) مجاہدین سے متنفر ہو جائے اور ان مجاہدین کی BASE یعنی عوامی حمایت ختم ہو جائے۔]

برطانوی سامراج اور عیسائیت کی تبلیغ

برطانوی سامراج نے شروع سے ہی سرکاری دفاتر میں عیسائیت کی تبلیغ کا آغاز کر دیا تھا اور تحریک آزادی کے بعد تو کھلے عام عیسائی مبلغین مسلمان علماء کو دعوت مناظرہ اور دعوت مباہلہ دیتے تھے اور چیلنج کرتے تھے عام علماء اس کا جواب نہ دے پاتے تھے جس سے وہ دلیر ہو گئے

مارا کیونکہ انجیل میں لکھا ہے کہ اگر تمہیں ایک تھپڑ مارا جائے تو دوسرا گال پیش کر دو لیکن پادری صاحب نے انجیل پر عمل کرنے کے بجائے مقدمہ کر دیا۔ یہ بیان دیتے ہی حافظ ولی اللہ نے انجیل کے ایڈیشن کا حوالہ دے دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ فلاں ایڈیشن، فلاں لائبریری میں ہے۔ جب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے پادری فونڈر کو جواب دینے کے لئے کہا تو اس نے اٹھ کر اعتراف کیا کہ واقعی انجیل مقدس میں یونہی لکھا ہے میں مقدمہ واپس لیتا ہوں۔“

اس طرح کے مناظرے عام تھے۔ اللہ تعالیٰ کا اپنا نظام ہے مسلمان جاگے اور اس فتنہ کو بھی کچل دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس طبقہ علماء میں سے مولانا رحمت اللہ کیرانوی کو اٹھایا اور انہوں نے اس پادری کو ایسا خاموش کیا کہ وہ برطانوی قلمرو ”ہند“ سے ہی فرار ہو گیا اور اسی میں اس نے عاقبت سمجھی۔ پھر وہ عثمانی سلطنت کے علاقوں میں پہنچ گیا۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی حج پر گئے ہوئے تھے۔ سلطان ترکی کو معلوم ہوا تو انہوں نے مولانا رحمت اللہ کیرانوی کو استنبول بلایا۔ پادری فونڈر کو جب مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی آمد کا معلوم ہوا تو بغیر مقابلہ کیے عثمانیہ سلطنت سے بھی رفو چکر ہو گیا اور پھر کبھی نظر نہیں آیا۔ انہیں مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی سرکردگی میں ایک مدرسہ مکہ المکرمہ میں ترکی حکومت کے تعاون سے قائم ہوا جو اب تک قائم ہے۔

برطانوی سامراج کے عوامی بہبود کے چند کام

اس برطانوی عہد 1860ء-1947ء میں سامراجی سرگرمیوں کو فروغ دینے اور اس کے استحکام کے لئے ریلوے کا نظام ملک بھر میں پھیلا دیا گیا تاکہ باغیوں کی بروقت سرکوبی کی جاسکے اور حکومتی اہل کار اور عمال مرکز، صوبوں اور ضلعوں میں باسانی آجاسکیں اور انتظامی کارکردگی میں اضافہ ہو سکے۔ دریاؤں پر بیراج بنائے گئے، نہریں نکالی گئیں اور کئی بنجر علاقے سیراب کر کے آباد کیے گئے جس سے کروڑوں لوگوں کو روزگار کے مواقع ملے اور خوب تعمیر و ترقی ہوئی، ڈاک کا بہترین نظام تھا اور خطوط، پارسل اور سامان باسانی ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجا جاسکتا تھا تار برقی کے ذریعے اطلاعات کا جلد ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانا ممکن ہو گیا۔ اخبارات، پریس

وغیرہ اور ریڈیو نے اس میں مزید اضافہ کر دیا۔ سائنسی ترقی اور علمی ترقی کے نتیجے میں انتظامی بہتری آئی اور امن و امان کی کیفیت پیدا ہو گئی اور ہندوستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ہوا کہ تقریباً 90 سال ایسے گزرے کہ لوگ ڈھا کہ سے پشاور، کوئٹہ سے نیپال تک سفر کر رہے ہیں پہلے سے طے شدہ پروگرام پر چھٹیاں گزار کر سرکاری ملازم فوجی ڈیوٹیوں پر جا رہے ہیں، سرکاری اہل کاروں کے تبادلے ہو رہے ہیں، پورے ملک میں تعلیمی نظام، عدالتی نظام اور انتظامی ڈھانچہ کے ساتھ پولیس کا ایک ہی نظام ہے، ریاستوں میں بھی اصولی طور پر یہی نظام تھا تاہم مقامی حالات کے مطابق ذرا فرق ہوتا تھا۔ اس طرح آمدورفت کی آسانی، اطلاعات و معلومات میں سہولت اور امن و امان نے سامراج کی نیک نامی میں اضافہ کیا اور اس ماحول میں مسلمانوں میں آزادی کی تحریکوں کو بھی خوب کام کرنے کا موقع ملا اور اطمینان کے ساتھ تیاری کا بھی۔

حضرت امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے ان حالات میں اصلاحِ امت کے لیے درس و تدریس اور تحریر کے کام کیے۔ آپ کی تصنیفات میں مثنوی مولانا روم پر فارسی زبان میں حاشیہ، غذائے روح، جہاد اکبر، مثنوی تحفہ عشاق، درنامہ غضبناک، ارشاد مرشد، ضیاء القلوب، وحدۃ الوجود، گلزار معرفت، فیصلہ ہفت مسئلہ، مرقومات امدادیہ، مکتوبات امدادیہ شامل ہیں۔

اسی دور میں کچھ دینی اضمحلال اور کچھ انگریزوں کی سازشوں کے نتیجے میں مسلمانوں میں آپس کے فروعی دینی مسائل میں حد سے زیادہ دلچسپی بڑھ گئی تھی اور جگہ جگہ مناظرے اور مناقشے بڑھتے جا رہے تھے۔ اس پس منظر میں ریاست بہاولپور میں ان مسائل میں سے سات اہم مسائل پر ملک بھر کے نامور علماء نے جمع ہو کر راہِ اعتدال کا موقف پیش کیا۔ یہ موقف 'ہفت مسائل' کے نام سے مطبوعہ ملتا ہے۔ اس میں حضرت امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی شرکت فرمائی تھی اگرچہ صدر نشین خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ تھے۔

آپ کے مرض الموت میں ضعف اس قدر بڑھ گیا تھا کہ کروٹ بدلنا مشکل ہو گیا تھا بھوک ختم ہو گئی تھی۔ 13 جمادی الآخر 1317ھ مطابق 19 اکتوبر 1899ء میں آپ نے جانِ آفریں کے سپرد کی اور جنت المعلیٰ (مکہ مکرمہ) میں مدفون ہوئے۔



مردانِ خدا

وہی ہے بندہٴ محراب جس کی ضرب ہے کاری
 نہ وہ کہ عرب ہے جس کی متام عیبی
 اذل سے فطرتِ احرار میں ہیں دوش بدوش
 قلمندری و قبا پوشی و کلمہ داری!
 زمانہ لے کے جسے آفتاب کرتا ہے
 انھیں کی خاک میں پوشیدہ ہے وہ چنگاری!
 وجود انھیں کا طوافِ بناں سے ہے آزاد
 یہ تیرے مومن و کافر تمام زتاری!

علامہ محمد اقبال

18

مجاہد کبیر، شیخ القرآن والحديث، اسیر مالٹا

حضرت شیخ الہند

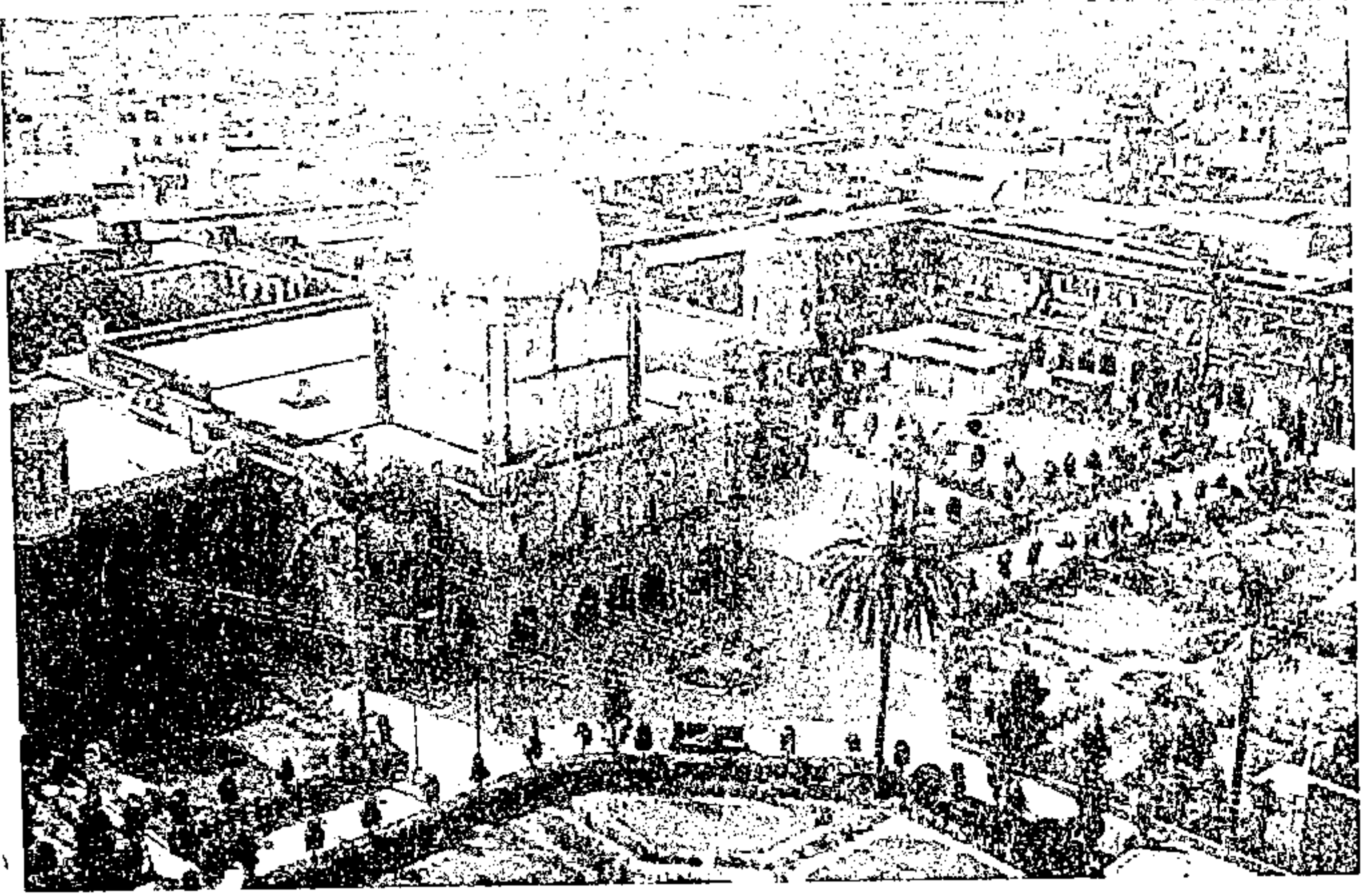
مولانا محمود حسن

رحمۃ اللہ علیہ

ولادت: 1268ھ/1851ء بریلی

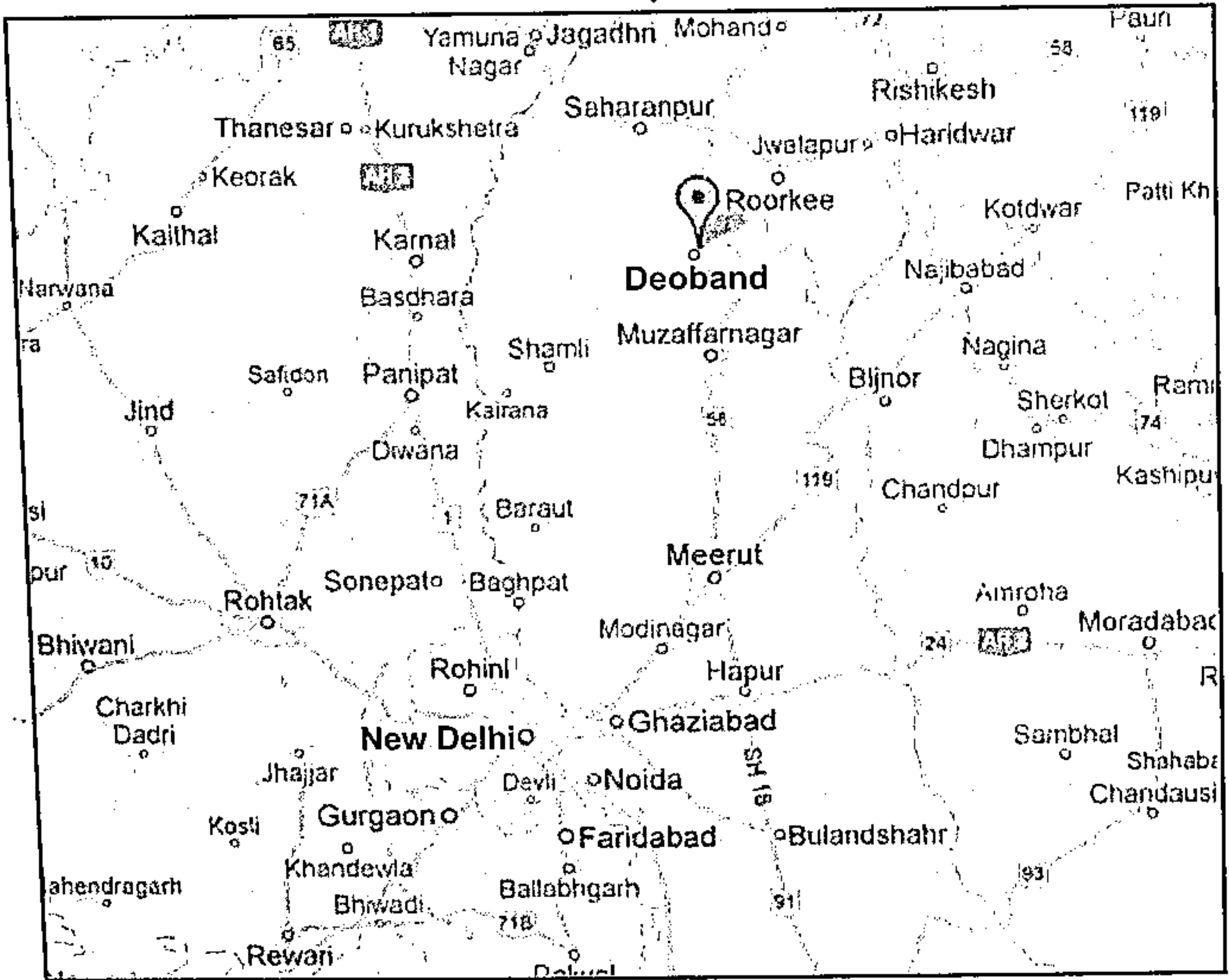
1887ء میں دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس مقرر ہوئے۔ ”تحریک ریشمی رومال“ کے نام سے آزادی کی جدوجہد کی تحریک چلائی۔ 1916ء میں اسی سلسلے میں حجاز مقدس کا سفر کیا۔ وہیں سے انگریزوں نے آپ کو گرفتار کر کے مالٹا میں قید کر دیا۔ مالٹا میں دوران اسیری قرآن پاک کا ترجمہ مکمل کیا اور سورۃ المائدہ تک حواشی لکھے۔ 1920ء میں رہائی کے بعد وطن واپسی ہوئی۔

وفات: 1339ھ/1920ء دیوبند



▲ دارالعلوم دیوبند

▼ دہلی اور آس پاس کے شہروں کا نقشہ



ذاتی حالات و کوائف

شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کا زمانہ سیاسی افراتفری، جہادِ آزادی کی پکڑ دھکڑ اور بے شمار پھانسیوں کے نتیجے میں مسلمانوں کی صفِ اوّل کی تمام لیڈرشپ کے مارے جانے کے سبب برطانوی ہند میں ہیبت ناک خاموشی اور برطانوی استعمار کے جبر و تشدد کے عروج کا زمانہ ہے۔ برطانوی ہند 1857ء میں ملکہ وکٹوریہ اور تاج برطانیہ کے براہ راست کنٹرول میں آجانے کے بعد پچال سال تک مسلمانوں میں کوئی مزاحمتی تحریک نہیں اُٹھ سکی مخلص مسلمان بھی بہت ہی مدہم انداز میں اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھنے اور جذبہ جہاد اور دینی شعائر کو سینے سے لگا کر ان کو اگلی نسل کو منتقل کرنے میں ہی مصروف رہے اور یہی اس پر آشوب دور کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

مسلمانوں کی تاریخ میں اس تاریک اور طویل ترین نصف صدی میں بھی اُمتِ مسلمہ کے بہت سے دردمند افراد کے دلوں میں وہ دہلی ہوئی چنگاری تھی (اور یہی اس دور کا حاصل ہے) جس نے بعد میں شیخ الہند محمود حسن، ابوالکلام آزاد، علامہ اقبال اور قائد اعظم محمد علی جناح کا روپ دھارا ہے۔

1857ء کے جہادِ آزادی کے بعد اُمتِ مسلمہ برطانوی استعمار کے زیرِ عتاب آگئی جبکہ ہندو، مسلم دشمنی میں انگریز کی گود میں جا کر بیٹھ گیا اور مراعات لے کر خوش ہو گیا۔ مسلمان برطانوی استعمار اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے قزاقوں کے ایک صدی سے زخم خوردہ تھے اور ہندو اس عرصے میں بھی تجارت میں انگریز کے ساتھ تعاون کر کے معاشی فوائد سمیٹتا رہا اور انگریزی سرکار کے تعلیمی اور فلسفیانہ افکار کو قبول کر کے انگریز کا دست راست بن گیا۔

مسلمانوں میں اُنیسویں صدی کے اوائل میں تحریک شہیدین اُٹھی تھی اور جہاد کا جذبہ

پیدا ہوا تھا لاکھوں لوگ اس سے وابستہ ہوئے اور ساتھ دیا اگرچہ یہ تحریک سکھوں سے خلاف جہاد کرتے ہوئے بالاکوٹ کے مقام پر ایک معرکہ میں شکست کے بعد ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئی۔ اس دور میں مسلمانوں میں ایک طرف تحریک شہیدین کے جذبہ جہاد کی باقیات تھیں جنہیں جہاد آزادی 1857ء میں بھی

نالہ ہے بلبلی شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینہ میں اسے اور ذرا تھام ابھی

کے مصداق پسپائی اختیار کرنا پڑی تھی تاہم وہ جذبہ مع ”آگ دہلی ہوئی سمجھ، آگ بجھی ہوئی نہ جان“ والی شان کے ساتھ سینوں میں موجزن تھا۔ دوسری طرف مغربی تہذیب اور سائنسی نظریات و افکار کا ایک سیلاب تھا جو صنعتی ترقی اور ایجادات کے نتیجے میں مغربی تہذیب کے چکاچوند مظاہر کی بنیاد پر دیگر اقوام کی طرح مسلمان امت کو بھی گھائل کیے جا رہا تھا۔ اس درد کو محسوس کر کے سرسید احمد خان اور ان کے ہم خیال لوگ اٹھے اور انہوں نے مسلمانوں کو جدید تعلیم کے حصول، سائنسی ایجادات کے استعمال اور مغربی افکار و نظریات کو پڑھ کر ”خُذْ مَا صَفَا وَ دَعْ مَا كَدَّرَ“ (صحیح لے لو اور غلط کو رد کر دو) کی راہ دکھلائی۔

مسلمان اُمت کے اندر درد مندی کے جذبات کی حامل سوچ کے یہ دونوں دھارے اسی عرصے میں پیدا ہوئے اور وقت کے ساتھ ساتھ ان میں بعد بھی پیدا ہوتا چلا گیا اور مخالفت و محاذ آرائی میں شدت کا عنصر بھی آ گیا۔

دہلی مغلوں کے عہد سے ہی دار الحکومت تھا۔ برطانوی سامراج نے بھی کلکتہ کے بعد دہلی ہی کو ”مستنقر“ اور دار الحکومت بنایا، صدیوں سے مسلمانوں کے علمی، تہذیبی اور فکری مراکز اسی علاقے میں تھے۔ دہلی سے شمال کی طرف جانے والی ریلوے لائن پر علی گڑھ اور دیوبند واقع ہیں۔ سید مملوک علی ایک عالم تھے ان کے شاگرد سرسید احمد خان اور مولانا محمد قاسم نانوتوی تھے۔ اس عرصے میں مسلمانوں کے درمیان فکر کے دونوں چشمے یہیں سے پھوٹے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ فکری سرچشمے ایک دوسرے سے صرف دور ہی نہیں ہوئے مد مقابل بھی آگئے اگرچہ اندر سے جذبہ اور جوہر ایک ہی تھا اُمت مسلمہ کی زبوں حالی کا علاج اور اس سے نکلنے کے لئے جدوجہد اور تدبیر منزل۔

سر سید احمد خان نے مسلمانوں کو 1860ء کے بعد انگریزی تعلیم سے روشناس کرانے کا بیڑا اٹھایا۔ انگریزوں نے جو تعلیمی ادارے قائم کیے تھے مسلمان ان کے قریب نہیں جاتے تھے 1861ء میں گورنمنٹ کالج لاہور بنا تو ایک چھوٹی سی کرائے کی جگہ پر آغاز ہوا۔ چودہ طالب علم داخل ہوئے جن میں سے صرف ایک مسلمان تھا۔ لہذا سر سید احمد خان نے علی گڑھ میں محضن ایجوکیشنل سوسائٹی قائم کی اور 1867ء میں پرائمری سکول سے آغاز کیا۔ تاکہ مسلمان مسلمانوں کے بنائے ہوئے مدارس میں ہی داخلہ لیں اور آگے بڑھیں۔ اسی سلسلہ نے ترقی کی ہے، یہی مدرسہ ہائی سکول اور کالج بنا اور پورے برطانوی ہند سے مسلمان نوجوانوں کی واحد مادر علمی قرار پایا، بعد میں یہی کالج 1920ء میں علی گڑھ یونیورسٹی کا درجہ پا گیا۔

دوسری طرف 1867ء ہی میں مولانا محمد قاسم نانوتوی نے دیوبند میں ایک دینی مدرسہ قائم کیا جو اناروالی مسجد کے صحن میں ایک درخت کے نیچے تعلیم کا آغاز کر کے نصف صدی میں عالم اسلام کی سب سے بڑی درس گاہ اور جامعہ ازہر (مصر) کے پائے کا دارالعلوم (یونیورسٹی) بن گیا۔ دارالعلوم دیوبند کے پہلے شاگرد محمود حسن تھے جو بعد میں مدرسے کی توسیع و ترقی کے ساتھ ساتھ آگے بڑھے پہلے مدرس اور پھر پہلے شیخ الحدیث بھی بنے اس دارالعلوم سے لاکھوں تشنگان علم نے اپنی پیاس بجھائی اور اقصائے عالم میں اپنے علمی و فکری اور عملی کارناموں سے امت مسلمہ کا نام روشن کیا تاہم اس مادر علمی نے شیخ الہند سے بڑا سپوت آج تک پیدا نہیں کیا تحریک شہیدین کے وارثوں کا خلوص و اخلاص تھا اور امت مسلمہ کی زبوں حالی اور برطانوی استعمار کی جبری غلامی (مُلکًا جبريًا) سے آزادی کا جذبہ تھا جو جبر و استبداد کے باوجود سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا رہا اور مختلف شکلوں میں نمودار ہو کر اپنے جوہر دکھاتا رہا تا آنکہ 1947ء میں مسلمانان ہند کو آزادی حاصل ہو گئی۔

دنیا بھر میں قیادت کا منبع اور سرچشمہ تین طرح کے طبقات کے ہاتھوں میں رہا ہے۔ سیاسی و عسکری قیادت حکمرانوں کے پاس، مذہبی قیادت مذہبی علماء اور مفکرین و مصلحین کے پاس جبکہ روحانی قیادت مذہبی طبقہ ہی کے درویشوں و مخلصین کے پاس۔ یہ اصول اتنا تاریخی تسلسل رکھتا ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے دور صحابہ رضی اللہ عنہم یعنی خلافت راشدہ میں

میں تھے اور فتح مکہ کے سفر میں یہ جماعت یا 'حزب اللہ' 10 ہزار فرشتہ صفت انسانوں پر مشتمل تھی۔ اعلیٰ ترین ایمان کے ساتھ اتنے زیادہ پاکیزہ صفت لوگوں کا اجتماع — ایک پیغمبر علیہ السلام کے ہم رکاب راہِ جہاد میں سر بکف رواں دواں کبھی چشمِ فلک نے نہ پہلے دیکھا نہ بعد میں دیکھے گی۔ اسی طرح کی حزب اللہ کے پروان چڑھنے سے 'حزب الشیطان' کو ہزیمت اٹھانی پڑتی ہے اور شکست سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور ابلیسی ایوانوں میں سوگ برپا رہتا ہے۔

خلافت راشدہ کے بعد آہستہ آہستہ مسلمانوں میں بھی دور بنو امیہ کے آخر تک سیاسی قیادت اور علماء الگ الگ گروہ بن گئے تھے دور بنو عباس کے آغاز کے بعد تو یہ تقسیم واضح ہو گئی بلکہ علماء اور اہل علم کے بھی دو واضح طبقات ہو گئے ایک پڑھنے لکھنے کا کام کرنے والے، تصنیف و تالیف مکاتب و مدارس سے وابستہ حضرات فقہاء اور سرکاری ملازم اور دوسرے صوفیاء جو دنیاوی عیش اور اسباب دنیا سے کنارہ کش رہ کر اللہ سے 'لو لگانے کو اہمیت دیتے تھے یعنی صوفیاء و 'درویش'۔

یہ تینوں طبقات علیحدہ ہو کر بھی صحیح رہیں اور دین پر کار بند رہیں تو غنیمت ہے مگر جب سیاسی قیادت دین سے ہٹ جائے علماء حقانی کے ساتھ علماء سوء پیدا ہو جائیں اور صوفیاء ربانیتین کے جلو میں دنیا دار صوفی کثرت سے پیدا ہو جائیں تو اجتماعیت کا زوال ناگزیر ہو جاتا ہے۔ ایک مشہور تابعی حضرت عبداللہ ابن مبارک رضی اللہ عنہ کا یہ شعر اسی صورت حال کا عکاس ہے۔

وَهَلْ أَفْسَدَ الدِّينَ إِلَّا الْمُلُوكُ
وَ أَحْبَبَارُ سُوءٍ وَ رُهْبَانُهَا

”دین سے آزاد بادشاہوں، علمائے سوء اور درویشوں ہی نے دین میں بگاڑ پیدا کیا ہے“
جنوبی ہند میں مغلیہ دور میں بھی یہی صورت حال تھی حضرت اورنگ زیب رضی اللہ عنہ کے دور میں سیاسی قیادت، مذہبی قیادت اور صوفیاء میں مخلص حضرات کی کثرت تھی مگر اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے ساتھ ہی آہستہ آہستہ بگاڑ میں اضافہ ہوتا چلا گیا پہلے سیاسی قیادت پر زوال طاری ہو گیا۔ جب اصلاح کی کوئی صورت نہ رہی تو مسلمانوں کی قیادت علماء مخلصین کے ہاتھ میں آ گئی چنانچہ شاہ ولی اللہ رضی اللہ عنہ کا خاندان 1750ء کے بعد سے امت مسلمہ کی 'امیدوں' کا مرکز بنا رہا۔ انگریزوں کی آمد اور بنگال و میسور میں مسلمانوں کی سیاسی پسپائی کے بعد یہ علماء کا ہی

طبقہ تھا جس نے مسلمانوں کو جذبہ اور تحفظ فراہم کیا ہے۔

خاندان شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ ہی نے سب سے پہلے جہاد کا فتویٰ دیا اور اس خاندان کے تربیت یافتہ لوگ تھے جنہوں نے جہاد کا علم بلند کیا اور تحریک شہیدین برپا کر کے مسلمانوں کے سامنے قرن اول کی یاد تازہ کر دی۔ بعد ازاں اس جہاد آزادی میں بھی مسلمانوں کی قیادت تحریک شہیدین کی باقیات صالحات کے علاوہ مولانا فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے کی تھی اور کالے پانی کی عمر قید اور سزائے موت پائی۔

1857ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریز نے مسلم قیادت کو اس بے دریغ انداز میں (اور تھوک کے حساب سے) پھانسیاں دیں کہ صرف پچیس، تیس سال کی عمر کی قیادت کسی طرح جان بچانے میں کامیاب ہو سکی اور وہ بھی زیادہ تر روپوش ہو گئی، ہجرت کر گئی یا گوشہ گنہامی میں چلی گئی۔

شیخ محمود حسن صاحب کی علمی قابلیت کا اندازہ اولاً آپ کی پورے برطانوی ہند میں علمی شہرت اور برتری سے اور دوسرے درجے میں آپ کے مشہور تلامذہ کی فہرست سے لگایا جاسکتا ہے۔ دنیا میں یہ عام اصول تسلیم کیا جاتا ہے کہ جیسے درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اسی طرح کوئی شخصیت اپنے شاگردوں سے پہچانی جاسکتی ہے۔ آپ کے علمی مقام کے پیش نظر آپ کے ہم عصر علماء و فضلاء نے آپ کو شیخ الہند کا خطاب دیا جبکہ آپ کے شاگردوں میں سے چند مشہور اصحاب علم و فضل کے نام درج ذیل ہیں:

● علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

● مولانا انور شاہ کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ۔ جن کے شاگرد خاص علامہ محمد یوسف بنوری تھے جنہوں نے جامعہ بنوریہ کراچی کی بنیاد رکھی۔

● علامہ عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ ● مولانا حفیظ الرحمن سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ

● مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع عثمانی رحمۃ اللہ علیہ جنہوں نے دارالعلوم کراچی کی بنیاد رکھی مفتی تقی عثمانی، مفتی رفیع عثمانی وغیرہم ان کے ابناء و احفاد ہیں۔

● مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ۔ آپ حضرت کے سیاسی مشن کے جانشین بنے۔

● مفتی کفایت اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

○ مولانا محمد الیاس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ (بانی تبلیغی جماعت)

○ مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ (مشہور صوفی بزرگ)

حضرت محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ نے چالیس سال دیوبند میں تدریس کا کام کیا۔ آپ کے ہزاروں شاگرد تھے۔ طلباء کابل سے لے کر آسام تک سے آتے تھے اور علم کے اس سرچشمہ سے خوب خوب سیراب ہوتے تھے۔ آپ نے علم کے ساتھ ساتھ شاگردوں کی ہمہ جہتی تربیت بھی فرمائی اور ان میں جذبہ جہاد کوٹ کوٹ کر بھر دیا۔

آزادی وطن کے لیے آپ کی سرگرمیاں

حضرت امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ (وفات 1899ء) کے بعد آپ نے جہاد حریت اور برطانوی سامراج سے ملکی آزادی کے لئے بہت کام کیا اور اندرون ملک ہی نہیں افغانستان، ترکی اور حرین شریفین تک رابطے فرمائے۔ اس سلسلے میں آپ نے ایک تحریک کا آغاز فرمایا اور اس کا جال پورے ملک اور بیرون ملک پھیلا دیا۔ اس تحریک کا منصوبہ یہ تھا کہ پہلے افغانستان ہجرت کی جائے اور وہاں سے والی افغانستان کی مدد سے انگریزی حکومت کے خلاف جہاد کا آغاز کیا جائے (یہ منصوبہ قابل عمل تھا یا نہیں یہ دوسری بات ہے) شیخ الہند نے اس منصوبے پر انتھک کام کیا۔ اس تحریک کی بدولت آپ کے کارکن پورے ہندوستان میں سرگرم تھے اور یہ منصوبہ آگے بڑھ رہا تھا اسی سلسلے میں 1916ء میں آپ حرین شریفین تشریف لے گئے اور وہاں قیام کیا اور ارادہ تھا کہ ترکی حکومت سے رابطہ کریں اور انہیں اس منصوبہ کا قائل کریں کہ آپ کی سرگرمیوں اور ملاقاتوں کے پیش نظر شریف مکہ کی حکومت نے گرفتار کر کے آپ کو انگریزوں کے حوالہ کر دیا اور انگریز نے آپ کو بحیرہ روم کے قدیم عیسائی مرکز جزیرہ مالٹا میں چار سال کے لئے قید کر دیا اور رہائی اس وقت ملی جب ڈاکٹروں نے ٹی بی کی تشخیص کر دی (ٹی بی اس وقت تک قابل علاج مرض نہیں تھا) آپ چار سال کی قید کاٹ کر جون 1920ء میں ممبئی کے ساحل پر اترے تو استقبال کرنے والوں میں آپ کے عقیدت مندوں اور شاگردوں کے علاوہ چوٹی کے سیاسی لیڈر مہاتما گاندھی بھی موجود تھے۔ قید و بند کی اس صعوبت میں آپ کے شاگرد (حضرت) حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ مدینہ سے ہی آپ کے ساتھ ہو گئے تھے اور انہوں نے آپ کے ساتھ خدمت کے جذبے اور حق شاگردی کی

ادائیگی کے لئے رضا کارانہ جیل کاٹی اور استاد کی خوب خوب خدمت کی۔ حضرت شیخ کی عمر 1916ء میں 66 سال کی تھی۔

یہ سیاسی تحریک — جہاد حریت اور وطن کی آزادی کا پیغام آپ نے جس طرح وسائل کی کمی کے باوجود عام کیا اور حکومتی مشنری کو حیران کر کے رکھ دیا وہ آپ کے اخاذ اور اعلیٰ ذہن کی پیداوار تھی۔ یہ ملک گیر تحریک بعد میں بے نقاب ہوئی اور ریشمی رومال کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔ آپ نے پیغام رسائی کے لئے ایسا طبقہ ایجاد کیا کہ برطانوی ایجنسیاں عرصہ دراز تک اس کی کھوج نہ لگا سکیں۔ یہ تحریک آپ کی وفات کے بعد ملتان میں پکڑی گئی اور اس طرح اس کی تفصیل سامنے آنے پر کارکنوں کو ہراساں کر کے تتر بتر کر دیا گیا۔

اس تحریک کا نام 'ریشمی رومال تحریک' اس لئے پڑ گیا تھا کہ آپ کے کارکن اپنے کاندھے پر ایک ریشمی رومال رکھتے تھے (جیسے علماء کے ہاں آج کل بھی طریقہ ہے) اسی رومال کو پیغام رسائی کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ آج بھی ان رومالوں پر مختلف قسم کے پھول بوٹے اور انداز ہوتے ہیں حضرت شیخ الہند نے اسی کڑھائی (EMBROIDERY) میں تحریر کا ایک خاص انداز ایجاد کیا اور اس کو استعمال کر کے تحریک کی بنیاد بنا دیا۔

دیوبند کے اکابرین میں سے مولانا سید اصغر علی صاحب ایک معروف بزرگ اور عالم تھے ان کی اولاد تقسیم ہند کے بعد پاکستان منتقل ہو کر آباد ہوئی سید رشید احمد صاحب اسلامیہ ہائی سکول جھنگ میں عرصہ دراز تک عربی ٹیچر رہے اپنے زمانہ طالب علمی 1960-1963 تک ان سے عربی پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ بعد میں سید صاحب نقل مکانی کر کے ہمارے محلہ میں ہی آ کر آباد ہو گئے تھے۔ انہوں نے ایک دن ریشمی رومال تحریک کے دوران اس تحریر کی تفصیلات بتائیں تھیں۔

وہ تحریر ایسی تھی جیسے انگریزی میں بڑے حروف (CAPITAL LETTER) میں کوئی عبارت الگ الگ حروف میں لکھی جاتی ہے پہلے ایک کھڑی لکیر اردو لفظ 'الف' کی طرح لگائی جاتی تھی پھر دائیں طرف کھجور کی شاخ کی طرح لکریں لگا کر ا ب ج د، ہوز، حطی، کلمن، سعفس، قرشت، نخذ، ضظغ کے الفاظ کو ظاہر کیا جاتا تھا پھر بائیں طرف اسی طرح کی ترچھی لکیروں سے 'کلمن' لفظ میں سے 'اگر' کو ظاہر کرنا ہے تو تین لکیریں لگادی جاتی تھیں اس

طرح سارے الفاظ لکھ کر پوری عبارت رومال پر منتقل کر دی جاتی تھی اور یہ رومال کارکن ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتے رہتے تھے۔ ریشمی رومال تحریک سے وابستہ حضرات کڑھائی کا یہ کام اپنے گھر کی خواتین سے لیتے تھے گویا خواتین بھی اس تحریک آزادی میں برابر کی شریک تھیں مثال کے طور پر نام 'محمد علی' کے لئے اشارات یوں لکھے جاتے ہیں:



م ح م د ع ل ی = (محمد علی)

اسی طرح حروف ابجد کی گنتی ہے اعداد کو ظاہر کرنے کے لئے ان حروف کی عددی قیمت لکھ کر رقمیں بھی لکھی جاتی تھیں۔ حیرت کی بات ہے کہ رواج کے طور پر آج کے رومالوں پر ابھی تک اس ڈیزائن کے نشانات بنائے جاتے ہیں اگرچہ اب ان میں کوئی معنوی حقیقت نہیں ہے۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی علمی برتری بھی مسلم تھی۔ برطانوی ہند میں مسلمانوں کے درمیان دینی علم کے بے شمار مراکز اور خانقاہیں تھیں جس میں دہلی کے آس پاس کا علاقہ نمایاں تھا اس کے علاوہ بریلی، بدایوں، فرنگی محل، اجمیر شریف وغیرہ بھی بہت اہمیت کے حامل تھے۔ حضرت شیخ الہند پورے ہند میں تمام مسالک کے علماء کے متفقہ سرخیل تھے۔ اس وقت پورے برطانوی ہند میں مسلمانوں کا ایک ہی مذہبی پلیٹ فارم تھا جمعیت علماء ہند اور آپ اس کے صدر تھے۔ اس جمعیت میں علماء اہلحدیث، علماء احناف اور شیعہ مسالک کے علماء بھی جمع تھے۔ دیوبندی بریلوی علماء کی بھی تقسیم ابھی اتنی گہری نہیں تھی جتنی آج ہے۔ بریلوی علماء میں مولانا احمد رضا خان صاحب کے علاوہ سب اس جمعیت میں موجود تھے بلکہ بریلوی علماء میں بھی علمائے اجمیر شریف مولانا معین الدین اجمیری کے علاوہ مولانا احمد رضا خان صاحب کے داماد مولانا شاہ عبدالعلیم میرٹھی بھی اس میں شامل تھے (آپ پاکستان کے مشہور عالم دین مولانا شاہ احمد نورانی کے والد اور مولانا انس نورانی کے دادا تھے)۔ یوں سیاسی اعتبار سے بھی، جہاد حریت اور آزادی وطن کی جدوجہد کے اعتبار سے بھی اور رسوخ فی العلم کے اعتبار سے بھی آپ کا مقام بہت بلند تھا۔

آپ نے 1916ء سے جون 1920ء تک مالٹا میں جیل کاٹی واپسی پر آپ کا ممبئی سے

دیوبند تک ہر جگہ شاندار استقبال ہوا۔ دیوبند میں ایک استقبالیہ جلسہ منعقد ہوا جس میں آپ کے شاگردوں اور عقیدت مندوں نے ہزاروں کی تعداد میں شرکت کی۔ اس میں آپ نے بڑے درد بھرے لہجے میں فرمایا: (یہ روایت مفتی محمد شفیع صاحب کی ہے جو اس جلسہ میں موجود تھے)

”میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں، تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے: ایک ان کا قرآن چھوڑ دینا دوسرے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی۔ اس لئے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کردوں کہ قرآن کریم کو لفظاً اور معنماً عام کیا جائے بچوں کے لئے لفظی تعلیم کے مکاتب ہر بستی بستی میں قائم کیے جائیں، بڑوں کو عوامی درس قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لئے آمادہ کیا جائے اور مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔“

(اقتباس از ”وحدت امت“ تالیف مفتی اعظم پاکستان مولانا محمد شفیع صاحب)

وطن واپسی پر آپ کو جہاد حریت کے لئے کئی اقدام کرنے کا موقع ملا جن میں ایک اہم بات یہ تھی کہ مولانا ابوالکلام آزاد جو مدارس سے فارغ التحصیل تو نہ تھے مگر 1912-1916 تک اپنے جریدوں البلاغ اور الہلال کے ذریعے حکومت الہیہ کے قیام کی بھرپور دعوت پورے ملک میں بڑے زوردار انداز میں عام کر چکے تھے۔ آپ نے ابوالکلام آزاد کی پہلے بھی تصویب فرمائی تھی تاہم واپسی پر ان کے تبصرے اور حالات حاضرہ پر گہری نظر کی وجہ سے مسلمانوں میں نصب امام کے لئے امام الہند بنانے کی کوششیں فرمائیں جو جو جوہ کامیاب نہ ہو سکیں۔

دوسری اہم بات یہ تھی کہ آپ نے مسلمانوں میں علی گڑھ اور دیوبند کے جدار استوں کو مسلمانوں کی قوت کی کمزوری پر قیاس کرتے ہوئے علی گڑھ (جدید علوم کی درس گاہوں) سے رشتہ الفت و محبت جوڑنے کی سعی بلیغ فرمائی۔ آپ نے پیرانہ سالی کے باوجود علی گڑھ کا دورہ فرمایا اور

وہاں طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

”میں نے اس پیرانہ سالی اور علالت و نقاہت کی حالت میں آپ کی اس دعوت پر اس لئے لبیک کہا کہ میں اپنی گم شدہ متاع کو یہاں پانے کا اُمیدوار ہوں۔ بہت سے نیک بندے ہیں جن کے چہروں پر نماز کا نور اور ذکر الہی کی روشنی جھلک رہی ہے۔ اے نونہالانِ وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غم خوار جس میں میری ہڈیاں پگھلی جا رہی ہیں، مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور سکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی جانب بڑھایا اور اس طرح ہم نے دو تاریخی مقاموں دیوبند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا۔“

(خودنوشت سوانح حیات مولانا حسین احمد مدنی، بحوالہ بیس بڑے مسلمان)

مسلمانوں کے اندر علم کے دو جُداد ہارے (علی گڑھ اور دیوبند و دیگر دینی مدارس) نئی نسل میں فکری انتشار کا باعث بن رہے تھے اور یہ خلیجِ وقت کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی۔ اس خلیج کو پُر کرنے یا کم کرنے کے لئے اصحابِ علم و دانش نے کئی کوششیں فرمائیں جیسے ندوۃ العلماء لکھنؤ کا قیام وغیرہ تاہم یہ خلیج کم نہ ہو سکی۔ اسی سلسلے میں ایک کوشش حضرت شیخ الہند نے فرمائی۔ دہلی میں اپنے معتقدین اور متوسلین کے ذریعے جامعہ ملیہ کا قیام عمل میں لائے اس ادارے نے گزشتہ ایک صدی میں گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔

مسلمانوں کی بہتری کے لئے ایک تیسرا کام آپ نے یہ کیا۔۔۔ جیسا کہ آپ نے خطبہ استقبالیہ میں فرمایا مسلمانوں نے قرآن مجید سے دوری اختیار کر لی ہے اس کے لئے قرآن مجید کے علوم کو عوامی سطح پر لانا چاہیے اور عام کرنا چاہیے۔ یہ سوچ آپ کی پہلے سے تھی ایامِ اسیری میں جتنا غور فرمایا یہ سوچ اور پختہ ہو گئی۔ اسی سوچ کے تحت آپ نے قرآن کا ترجمہ کیا اور سلیس زبان میں حواشی لکھنے کا آغاز کیا جسے بعد میں آپ کے ہونہار اور لائق شاگرد حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب (شیخ الاسلام پاکستان) نے مکمل فرمایا اور تفسیر عثمانی کے نام سے مطبوعہ موجود ہیں۔ یہ

حواشی مختصر ہونے کے باوجود آج بھی نہایت مستند سمجھے جاتے ہیں۔ اس کے دیپاچے میں آپ نے علماء کو توجہ دلاتے ہوئے فرمایا:

”حضرات علمائے کرام نے عوام کی بہبودی کی غرض سے جیسے سہل اور آسان متعدد ترجمے شائع فرمادیے ہیں ایسے ہی اس کی بھی حاجت ہے کہ علی العموم مسلمانوں کو ان ترجموں کے سیکھنے اور ان کے سمجھنے کی طرف رغبت بھی دلائی جائے۔ علمائے کرام اہل اسلام کو خاص طور سے ترجموں کے سمجھنے اور پڑھنے کی ضرورت اور اس کی منفعت دلنشین کرنے میں کوتاہی نہ فرمائیں بلکہ ترجمہ کی تعلیم کے لئے ایسے سلسلے بھی قائم فرمادیں کہ جو چاہے اسے بسہولت اپنی حالت کے مناسب اور فرصت کے موافق حاصل کر سکے۔ واللہ الموفق والمعين“

قرآن مجید کے علوم کو عوامی سطح پر عام کرنے کی ضرورت کا احساس جتنا حضرت شیخ الہند کو 1920ء میں تھا اس سے کہیں زیادہ آج بانوے سال بعد 2013ء میں بھی اس کی ضرورت ہے۔ ’عوامی درس قرآن‘ کا لفظ حیرت ہے حضرت شیخ الہند نے 1920ء کے لگ بھگ ارشاد فرمایا حالانکہ پاکستان میں عوام کی زبان پر ’عوامی‘ کا لفظ وزیراعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں آیا۔ کاش آج بھی اس طرف توجہ مبذول ہو اور اختلافات کو بھلا کر قرآن مجید کو حقیقتاً عام کرنے کا بیڑا اٹھایا جائے اور گلی گلی کوچے کوچے اس کو عوامی بیداری کا ذریعہ اور اساس بنایا جائے تو کچھ بعید نہیں کہ ایک طرف ہمارے درمیاں اتحاد و یگانگت پیدا ہو جائے اس لیے کہ آج بھی قرآن مجید کا متن متفق علیہ ہے اور امت کے اتحاد کا واحد ذریعہ اور اساس بن سکتا ہے اور دوسری طرف ایک شعوری انقلاب برپا ہو کر مسلمانوں کو امریکی غلامی سے نکلنے پر آمادہ کر دے۔

حضرت شیخ الہند کی ذات ستودہ صفات کی رحلت کے بعد برطانوی ہند کے مسلمانوں کی قسمت میں ایسا انقلاب آیا کہ اس کے بعد علمائے دین (چاہے مسلم لیگ کے ساتھ تھے اور پاکستان کی جدوجہد کر کے پاکستان میں ہیں یا بھارت میں ہیں) مسلمانوں کی قیادت کے منصب سے محروم ہو گئے۔ یہاں مسلم لیگ یا پیپلز پارٹی کے ساتھ شامل ہو کر وزارت مذہبی امور یا

امور کشمیر لے کر مطمئن ہو جاتے ہیں یا اسلامی نظریاتی کونسل اور رویت ہلال کمیٹی کی صدارت حاصل کر لیتے ہیں۔ اصل اقتدار کسی اور کے پاس ہوتا ہے۔ پاکستان کے مسلمان ہوں یا بھارت کے، ان کی قیادت علماء کے ہاتھ سے نکل کر جدید تعلیم یافتہ افراد کے ہاتھ میں آگئی تھی اور گزشتہ پوں صدی سے حالات کا رخ یہی ہے نہ معلوم یہ صورت حال کب تک جاری رہے گی یا علمائے دین جدید علوم سیکھ کر حالات حاضرہ اور ریاستی معاملات کی باریکیوں کو سمجھنے لگیں گے اور قیادت کے منصب پر فائز ہوں گے یا جدید تعلیم یافتہ حضرات علم دین سے بہرہ ور ہو کر اسلام کے تقاضوں کے مطابق خلافت قائم کر دیں گے۔

شیخ الہند کی تصنیفات کم ہیں آپ نے اپنے شاگردوں کی شکل میں سیرت و کردار کے پیکر تصنیف فرمائے جو دعوت و تبلیغ، اصلاح اُمت، علم و تحقیق، جہادِ آزادی اور حفاظتِ دین کے میدان کے شہسوار بنے اور آپ کے لیے توشہِ آخرت۔

حضرت شیخ الہند نے نومبر 1920ء میں وفات پائی اور ہزاروں شاگردوں اور لاکھوں ابنائے وطن کو سوگوار چھوڑ کر دیوبند میں مدفون ہوئے۔

ع آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے!



مہمانِ عزیز

پُر ہے افکار سے ان مدرسہ والوں کا ضمیر

خوب و ناخوب کی اس دور میں ہے کس کو تمیز!

چاہیے خانہ دل کی کوئی منزل خالی

شاید آجائے کہیں سے کوئی مہمانِ عزیز

علامہ اقبال

ایک اہم اقتباس

شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ
کے ترجمۃ القرآن کے مقدمے سے

حضرات علماء نے عوام کی بہبودی کی غرض سے جیسے سہل اور آسان متن درجہ شائع فرماتے ہیں ایسے ہی اس کی بھی حاجت ہے کہ علی العموم مسلمانوں کو ان ترجموں کے سیکھنے اور
ان کے سمجھنے کی طرف رغبت بھی دلائی جائے۔ علماء کے ارازم اہل اسلام کو خاص طور سے ترجموں کے سمجھنے اور پڑھنے کی ضرورت اور اس کی منفعت دل نشین کرنے میں کوتاہی
نہ فرمائیں۔ بلکہ ترجمہ کی تعلیم کے لئے ایسے سہلے بھی قائم فرمادیں کہ جو چاہے بہ سہولت اپنی حالت کے مناسب اور فرصت کے موافق حاصل کر سکے۔ واللہ الموفق والمعين۔

19

مجدد تبلیغ

حضرت مولانا

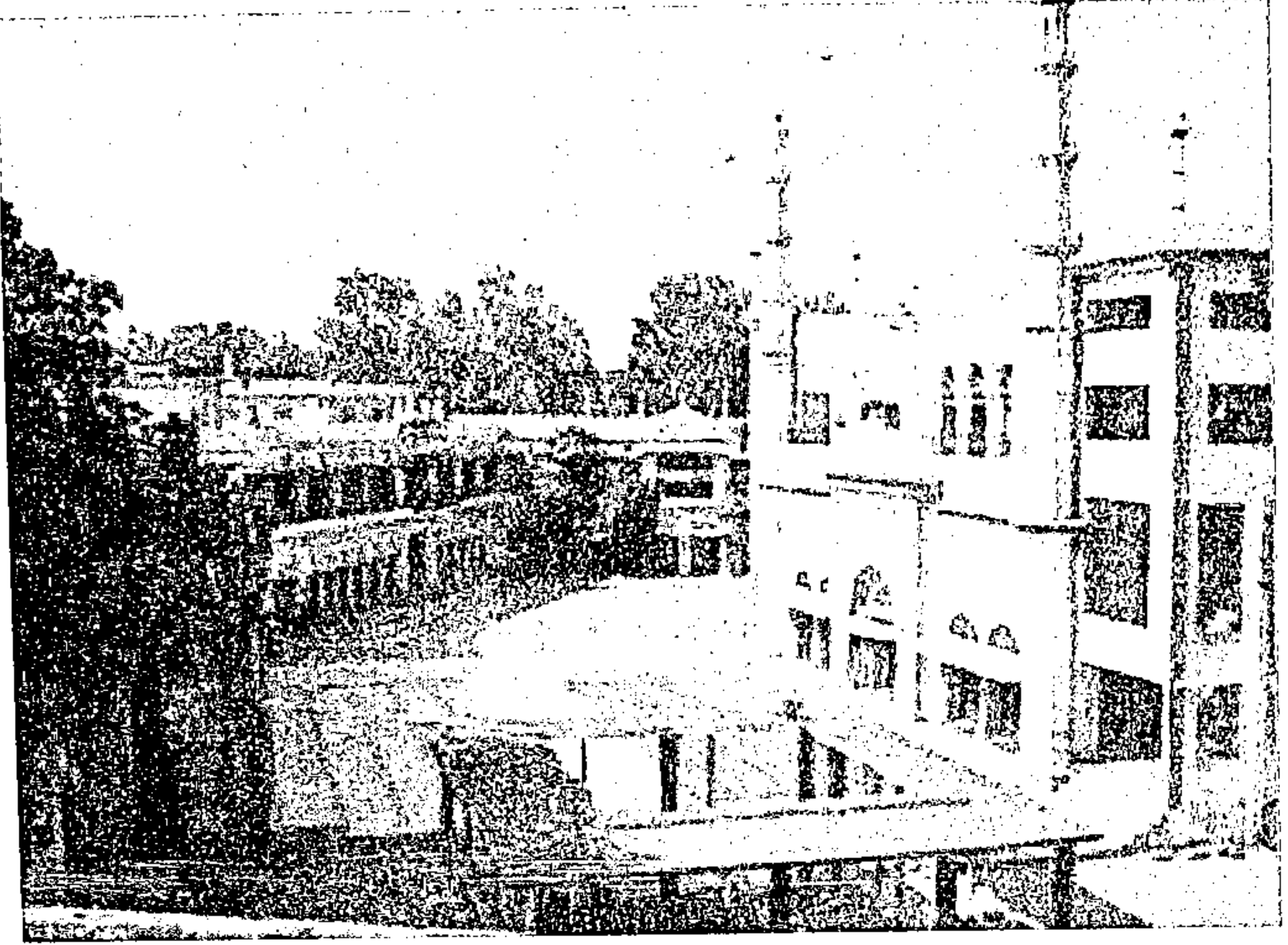
محمد الیاس کاندھلوی

رحمۃ اللہ علیہ

ولادت: 1303ھ / 1886ء

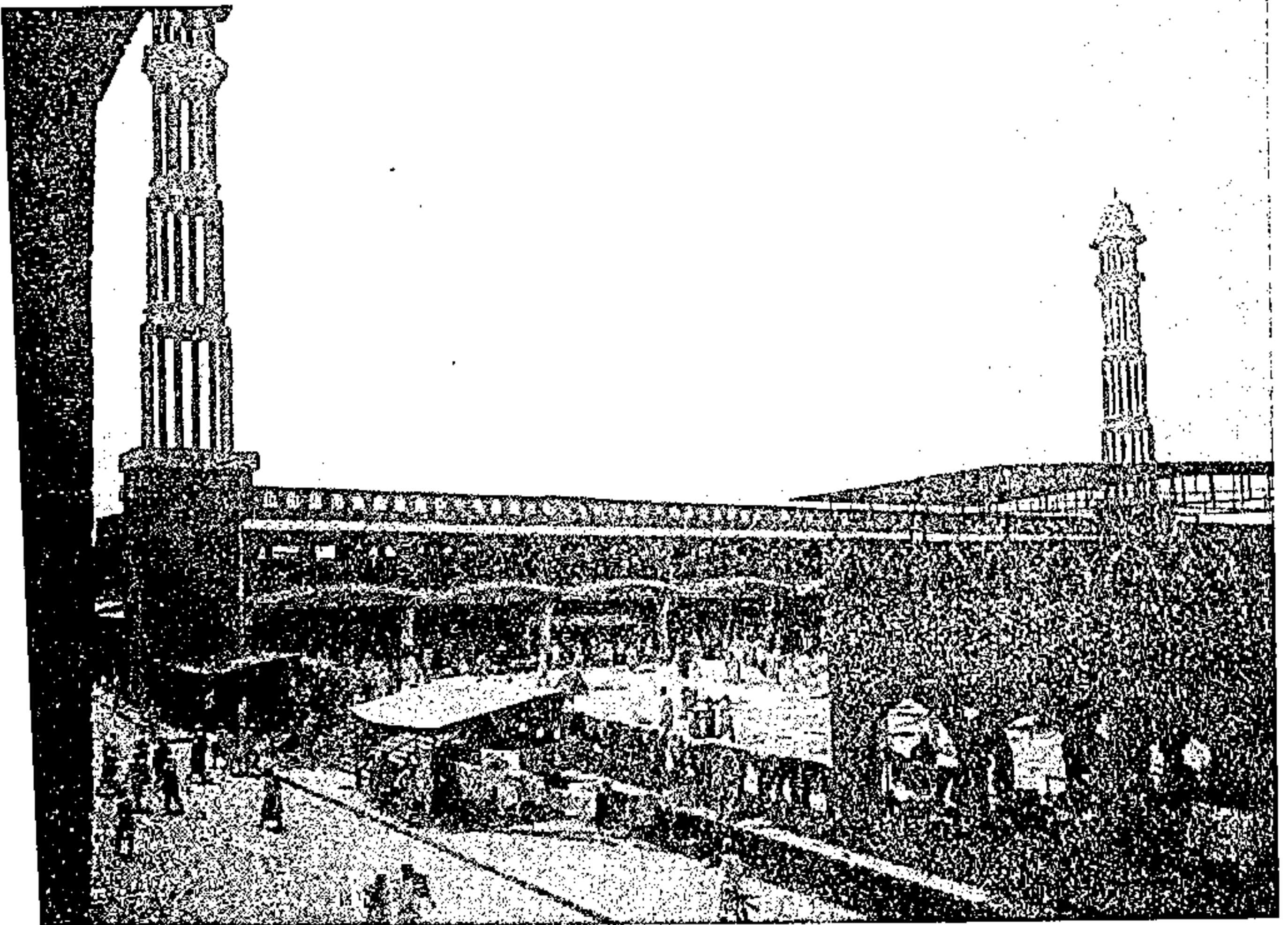
1911ء میں مظاہر العلوم سہانپور میں مدرس مقرر ہوئے۔ پھر دہلی میں والد ماجد کے قائم کردہ مدرسہ کا انتظام سنبھالا اور میوات کے علاقے میں پہلے تعلیمی مکاتب قائم کیے اور پھر 1926ء میں حج سے واپسی کے بعد عوامی سطح پر احیائے اسلام کے لیے جدوجہد کا آغاز کیا اور اسلام کے عالمی غلبہ کے ابتدائی درجہ کے طور پر عوام کو دعوت دی کہ وہ بھی اپنے گھروں اور کاروبار سے نکل کر دین سیکھیں اور اس کو پھیلانے کی جدوجہد کریں۔

وفات: 1363ھ / 1944ء



▲ (مدرسہ بانغوں والی، جہاں سے مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تبلیغی جدوجہد کا آغاز کیا۔ انڈیا)

▼ (مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی قائم کردہ تبلیغی جماعت کا موجودہ عالمی مرکز۔ رائیونڈ، پاکستان)



حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ دہلی میں مولانا محمد اسماعیل رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں 1886ء (1303ھ) میں پیدا ہوئے، ان دنوں آپ کے بڑے بھائی مولانا محمد یحییٰ گنگوہ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ آپ کے والد گرامی نے 1898ء (1315ھ) میں وفات پائی تو بھائی ان کو اپنے ساتھ گنگوہ لے گئے اور ابتدائی تعلیم بڑے بھائی سے ہی حاصل کی۔ گنگوہ ان دنوں اکابر علماء اور مجاہدین کا گہوارہ تھا۔ آپ نے اس ماحول میں تربیت پائی اور دین کے کام کی تڑپ، جدوجہد اور احیائے اسلام کی لگن جیسے جذبات سے خوب حصہ پایا۔ آپ نے مولانا رشید احمد گنگوہی سے بچپن میں ہی بیعت کر لی تھی۔ آپ نے دیوبند میں حضرت شیخ الہند محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ سے بھی تحصیل علم کیا۔ پہلے مظاہر العلوم سہارن پور میں تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے، پھر 1911ء میں بڑے بھائی مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی کی وفات کے بعد دہلی منتقل ہو کر والد گرامی کی مسند سنبھال لی۔ آپ کے آباء و اجداد جھنجھانہ سے تعلق رکھتے تھے والد گرامی کاندھلہ میں شادی کی بنا پر کاندھلوی مشہور ہوئے اور آپ دہلی میں تبلیغی سرگرمیوں کی بنا پر محمد الیاس دہلوی کہلائے۔ آپ کی وفات جولائی 1944ء (1363ھ) میں ہوئی۔

دہلی صدیوں سے حکمرانوں کا مسکن اور اہل علم و فن کا گہوارہ رہا ہے۔ مسلمان حکمرانوں نے بھی اسے اپنا دارالسلطنت بنائے رکھا ہے۔ یہاں علم کے سینکڑوں مراکز، بے شمار علماء، فضلاء اور صوفیاء پیدا ہوئے اور اپنی بساط کے مطابق اشاعت علم دین میں وقت گزارا۔ تاہم نیرنگی افلاک دیکھئے کہ دہلی اور اس کے آس پاس کا دیہاتی علاقہ (بے شمار دوسرے علاقوں کی طرح) کے عوام ماضی میں کلمہ اسلام پڑھ کر دائرہ اسلام میں آ جانے کے باوجود اسلام کی ابدی تعلیمات سے بے بہرہ رہے۔ کئی نسلوں سے علم دین سے محرومی کی بنا پر ان علاقوں کے لوگوں کی کثیر تعداد مسلمان

کہلانے کے باوجود کلمہ اسلام بھی صحیح طریقے پر نہیں پڑھ سکتے تھے۔

مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے والد گرامی نے (1860ء کے بعد) بستی نظام الدین میں رہائش کر کے مسجد تعمیر کی تو نمازیوں کو تلاش کرنا پڑا یہیں سے تبلیغ دین کا جذبہ پیدا ہوا۔ مدارس کا قیام اور علوم دینیہ کی تعلیم و تدریس ایک اور شعبہ ہے، علماء دین کی کھیپ تیار کر دینا بالکل دوسری بات ہے اور عوام میں اسلامی تعلیمات کو عام کرنا ایک بالکل علیحدہ شعبہ ہے۔ آپ کے والد گرامی نے عوامی سطح پر میوات کے مسلمانوں کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرانے کا بڑا کام کیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کے ثمرات بھی عطا فرمائے۔

یہی دور — وہ دور ہے جب 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد مسلمان اگلے مرحلہ کی تیاری کر رہے تھے جبکہ ہندو برطانوی استعمار سے ٹکرانے کی پالیسی کی بجائے ابتداء ہی سے منہاہمت کی پالیسی اختیار کیے ہوئے تھا۔ اس طرح ہندو نووارد حکمرانوں کو سہارا دے کر ان سے مراعات بھی حاصل کرتا رہا۔ برطانوی سامراج نے مسلمانوں سے حکومت چھینی تھی؛ لہذا مسلمانوں اور سات سمندر پار کے غاصب حکمرانوں میں اختلافات کی خلیج حائل تھی اور تصادم کا معاملہ تھا جو 1857ء کے بعد بظاہر دب گیا تھا مگر مع ”آگ دہی ہوئی سمجھ، بجھی ہوئی نہ جان“ کے مصداق وہ جذبہ ختم نہیں ہوا تھا۔ ہندو مرہٹہ قوت میں مسلم دشمنی کے انتقامی جذبات بھی پروان چڑھ رہے تھے اور انگریز کے زیر سایہ برطانوی ہند میں اندلس (سپین) کی طرح مسلمانوں کی بیخ کنی کا منصوبہ آگے بڑھا رہے تھے۔ برہمن سماج کی تحریک تو تھی ہی، شدھی اور سنگٹھن کی تحریکیں شروع ہوئیں کہ ہند میں آباد مسلمانوں کی اکثریت مقامی قبائل سے مسلمان ہوئے ہیں لہذا انہیں واپس ہندو بنا لینا چاہیے۔ یہ بڑی خوفناک تحریکیں تھیں اگر دست قضا مسلمانوں میں بعض اہم شخصیات کے ذریعے شجر اسلام کی آبیاری کا کام نہ لے لیتا تو یہ اسلام کا شجر سوکھ چکا ہوتا انہیں شخصیات میں اہم نام مولانا محمد الیاس دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔

آپ نے نام کے مسلمانوں کو حقیقی مسلمان بنانے کا عزم کیا اور ان میں دین کی عظمت، اسلامی تعلیمات اور فرائض کا علم اور دین کے لئے جان و مال سے محنت (جہاد) کا جذبہ پیدا کر دیا اور تبلیغ کے نام سے ایسی جدوجہد کی کہ نصف صدی بعد وہ تحریک ایک تن آور درخت بن

کر عالمی تحریک بن گئی۔

اس تبلیغی کام کی ابتدائی اٹھان اسلام کے ابدی اور آفاقی اصولوں پر ہوئی تھی۔ مسلمانوں کو بیدار کرو۔ قرآن مجید کی تعلیمات عام کرو۔ جذبہ جہاد پیدا کرو۔ آگے بڑھ کر اسلام کو غالب کر کے ایک اسلامی خلافت کی بنیاد رکھ دو۔ اس لئے کہ خلافت کے قیام کے بغیر اور ایک علاقہ فتح کر کے اس میں اسلامی تعلیمات کو رائج کیے بغیر مسلمان پورے دین پر کبھی عمل نہیں کر سکتے۔

مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی سوچ ان کے خطابات سے واضح ہے اور ان کی تبلیغی مساعی اور کاموں سے ظاہر ہے ان کا ایک خطبہ جو بجمہ اللہ مطبوعہ موجود ہے اور پہلے تبلیغی نصاب کے ساتھ چھاپا جاتا تھا ہماری مراد ”مسلمانوں کی موجودہ پستی کا واحد علاج“ نامی تحریر ہے جو مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی ایک تقریر کو نقل کر کے انہیں کے ایک عزیز اور عقیدت مند مولانا احتشام الحسن کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے شائع کرائی تھی۔ اس تقریر میں آپ نے اپنے تبلیغی کام کا سارا صغریٰ کبریٰ اور اپنی مساعی کا ابتدائی مرحلہ، آگے کے مراحل اور آخری مراحل کا بھی اشارہ دیا ہے۔ اس تحریر کا مطالعہ کر کے مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی تبلیغی مساعی کے ساتھ ان کے اعلیٰ فکر اور غلبہ اسلام کی تڑپ کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

● آج کی تبلیغی جماعت کے اکابرین و اصاغرین اسلام کے غلبہ کو اس اہمیت سے بیان نہیں کرتے جس کا یہ متقاضی ہے یہ اشارہ ہے جماعت کے اہداف میں تبدیلی کا۔ اللہ کرے ایسا نہ ہو اور ہمارا مشاہدہ صحیح نہ ہو اور جماعت تبلیغ کے اکابرین اور اصاغرین سب اسلام کے غلبہ کو اپنا مطمح نظر سمجھتے ہوں اور قیام خلافت کے ذریعے ایسا ماحول پیدا کرنے کو بھی اپنا فریضہ سمجھتے ہوں جس کا تذکرہ سورہ نور کی آیات 57 میں آیا ہے اور جس کے بغیر مسلمان پورے دین پر عمل پیرا بھی نہیں ہو سکتے اور نہ عوام کو اسلامی تعلیمات کی برکات مل سکتی ہیں۔

مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی اسی انقلابی سوچ کے بارے میں سید قاسم محمود صاحب اسلامی انسائیکلو پیڈیا میں رقم طراز ہیں:

”مولانا کا اس کام کے بارے میں نقطہ نظر بہت بلند تھا، ان کے سامنے صرف اتنی

بات نہ تھی کہ عوام الناس نماز، روزہ سیکھ جائیں اور ذکر و اذکار کے پابند ہو جائیں بلکہ مولانا پوری ملت اسلامیہ کو بیدار کر کے انفرادی زندگی سے لے کر اجتماعی زندگی تک کو اسلامی بنانے کی فکر رکھتے تھے۔ خود مولانا کے الفاظ ہیں:

”ہماری اس تحریک کا اصل مقصد یہ ہے: اسلام کے پورے علمی و عملی نظام سے اُمت کو وابستہ کر دینا۔ رہی قافلوں کی یہ چلت پھرت اور تبلیغی گشت، سو یہ اس مقصد کے لئے ابتدائی ذریعہ ہے اور کلمہ و نماز کی تلقین و تعلیم گویا ہمارے پورے نصاب کی اب، ت ہے۔“

جناب سید قاسم محمود صاحب مزید رقم طراز ہیں:

”مولانا نے 1330ھ / 1916ء میں نکاح کیا تھا۔ اولاد میں ایک صاحبزادہ مولانا محمد یوسف اور ایک دختر تھی جو مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ سے بیاہی گئیں۔ مولانا پست قد تھے، گندمی رنگ اور دبلا جسم تھا، داڑھی گھنی تھی، زبان میں قدرے لکنت، آواز پر جوش، طاقتور اور عالی ہمت کہ تبلیغ کے سلسلے میں پہاڑیوں پر چڑھتے، تیز دھوپ اور گرم لُو برداشت کرتے، مٹی جون کی گرمی میں میوات کا دورہ کرتے، سخت سردیوں میں شہر شہر اور گاؤں گاؤں پھرتے۔“

مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ نے تبلیغ کے اس کام میں مجددانہ اصلاحات فرمائیں روایتی مذہبی تبلیغ، تبلیغی کانفرنسیں عام طور پر اختلافی مسائل پر اپنے ہم خیال عوام کے سامنے علماء کا اپنے نظریات کا دوبارہ اظہار کرنا ہوتا ہے اور علماء کرام اس کام کے لئے بھاری بھاری معاوضے وصول کرتے ہیں۔ مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ نے تبلیغ دین کے لئے پیغمبرانہ شان کے ساتھ کام کیا اور اس کو عام کرنے کی کوشش فرمائی کہ تبلیغ دین کے لئے اپنی جیب سے خرچ کرو، اپنا بستر خود اٹھاؤ اور اپنے کام خود کرو اور عوام تک جا کر دین پہنچاؤ۔ اس کام کی یہ شان تھی کہ انہیں تبلیغ کے شعبہ کا مجدد کہا جانا ان ہی کے شایانِ شان ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو انہیں جیسا جذبہ نہ سہی ان کے جذبہ کا کوئی حصہ ہی عطا فرمادے۔ (آمین)



20

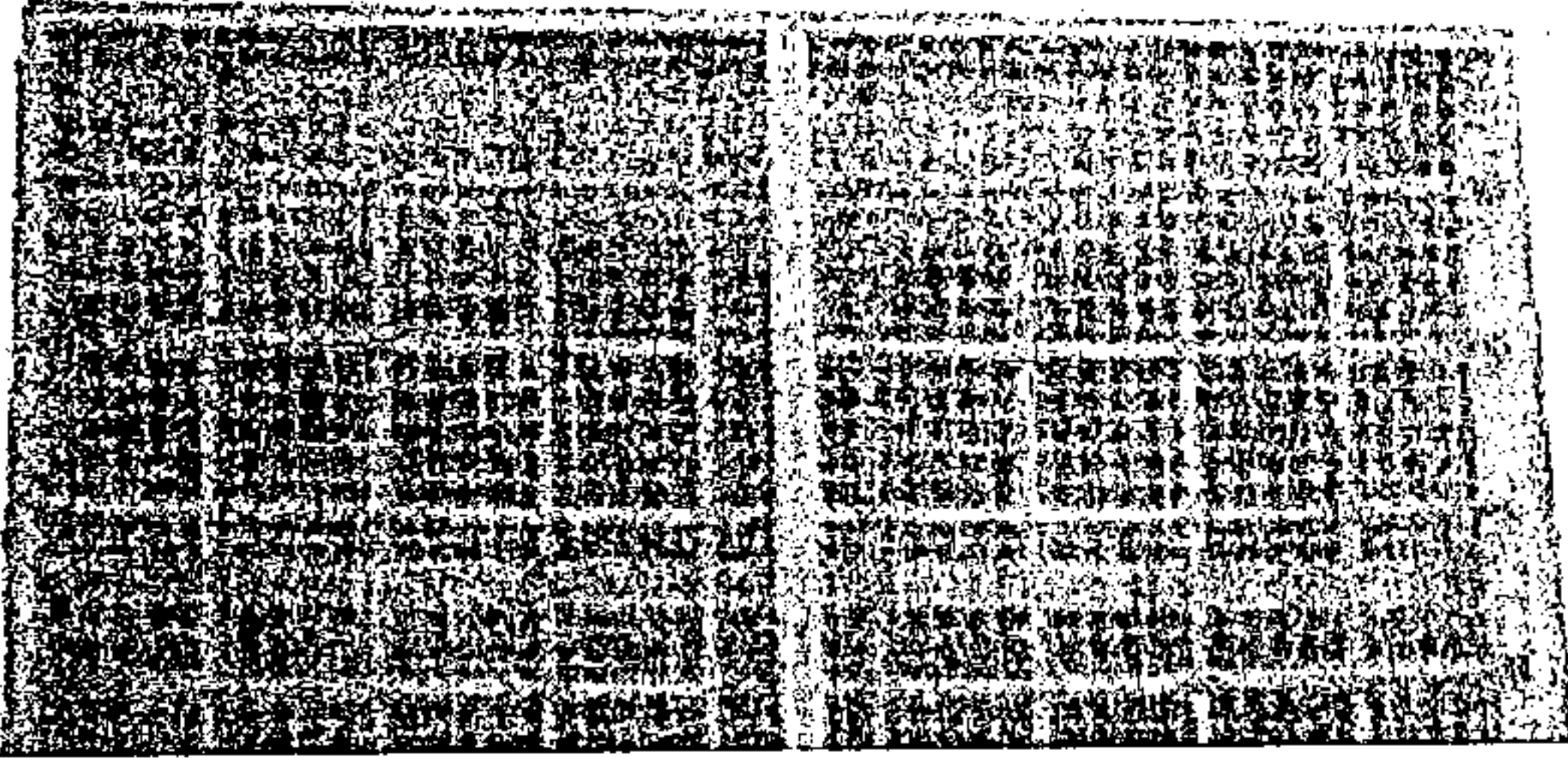
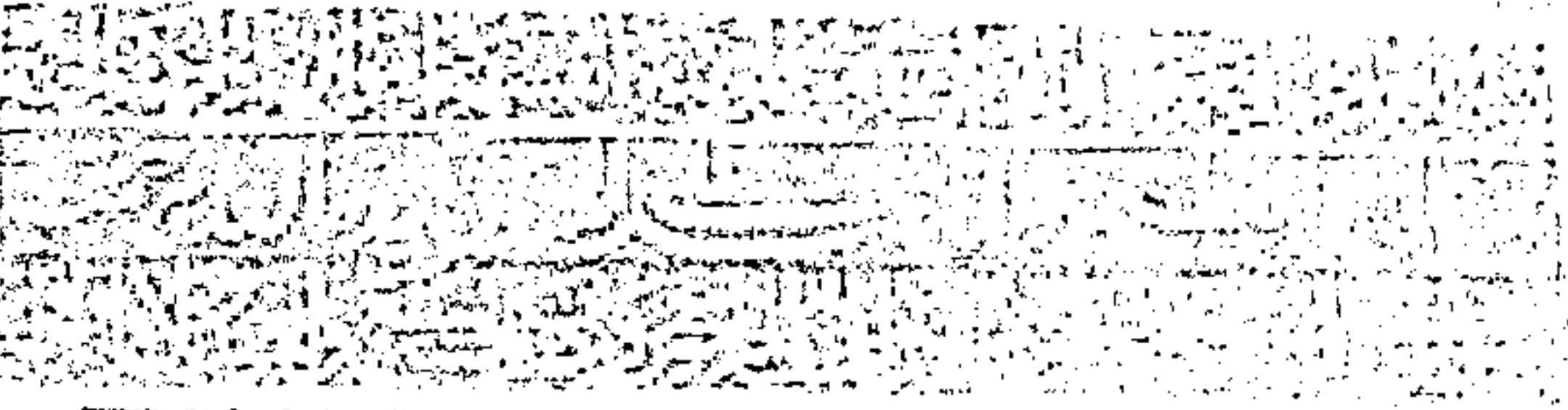
رئیس الاحرار، بے مثال خطیب،
بحالی خلافت اسلامیہ کے نقیب حضرت مولانا

محمد علی جوہر

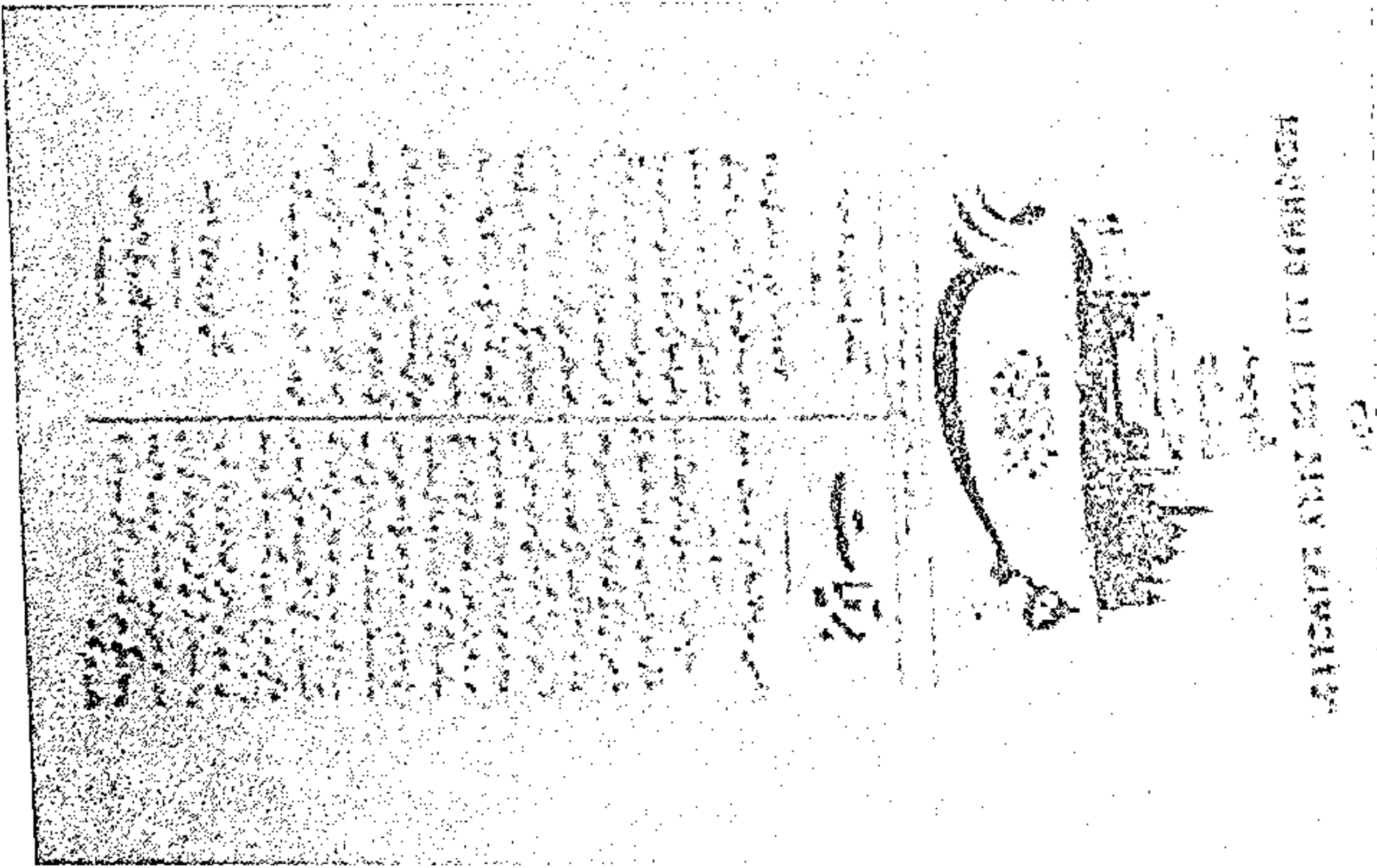
رحمۃ اللہ علیہ

ولادت: 1297ھ / 1878ء رام پور
1918ء میں سقوطِ خلافت عثمانیہ کے بعد احیائے خلافت کے لیے ایسی
جدوجہد کی کہ پورے ہندوستان میں ہنگامہ برپا کر دیا۔ 1920ء میں
جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی۔ 1931ء میں ہندوستان کی آزادی کے
لیے انگلستان میں منعقدہ گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے۔

وفات: 1350ھ / 1931ء لندن، مدفن: بیت المقدس



(آخری آرامگاہ: مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ، بیت المقدس)



(مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ کے جاری کردہ روزنامہ اخبار ”ہمرد“ کے صفحے کا عکس)

مولانا محمد علی جوہر 10 دسمبر 1878ء کو رامپور میں پیدا ہوئے تو سقوطِ دہلی کو 21 برس گزر چکے تھے اور سرسید کی 'اسبابِ بغاوتِ ہند' بھی منظر عام پر آچکی تھی، علی گڑھ کے مدرسہ کا بھی باقاعدہ آغاز ہو چکا تھا۔ دو سال کی عمر میں ہی والد (بم 30-32 سال) انتقال کر گئے۔ والدہ نے بیوگی میں ہی بچوں کی پرورش کی اور ناخواندہ ہونے کے باوجود بچوں میں اسلامی جذبہٴ حریت بھردیا، گھریلو ماحول اچھا میسر آیا۔ برطانوی استعمار کی چیرہ دستیوں اور مسلمانوں پر بے پناہ مظالم نے اس عشرے میں پیدا ہونے والے دیگر مسلم زعماء کی طرح محمد علی کے دل میں بھی مغرب اور مغربی استعمار کے خلاف نفرت کو بھڑکا دیا تھا۔ آپ کی شخصیت سازی میں آپ کی والدہ کا بہت حصہ ہے۔ آپ نے علی گڑھ سے بی اے کیا، آکسفورڈ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے 1902ء میں واپس آئے۔ تیس سال کی عملی زندگی گزار کر 4 جنوری 1931ء کو لندن میں وفات پائی اور بیت المقدس میں مدفون ہوئے۔ انہوں نے زندگی بھی بڑے سلیقے کی گزاری اور انہیں مرنا بھی خوب سلیقہ کا نصیب ہوا۔ ع سوئے گردوں رفت زان را ہے کہ پیغمبرؐ کی گزشت

مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ نے جس زمانے اور ماحول میں شعور کی آنکھ کھولی اور پرورش پائی وہ 1857ء کی جنگِ آزادی میں مسلمانوں کی ناکامی کے بعد انگریزی مظالم کی طویل تاریک رات کا زمانہ تھا جس میں آزادی کے متوالوں بالخصوص مسلمان زعماء اور ان کے متوسلین و معتقدین کو چن چن کر تختہ دار پر لٹکا دیا گیا تھا اور بالغ نظر اور MATURE قیادت کا خاتمہ کر دیا گیا تھا۔ 1860ء اور 1870ء کے عشرے کے دوران برطانوی استعمار کے منحوس سائے میں جنوبی ایشیا میں قبرستان کی سی خاموشی چھائی رہی۔ جبر اور گھٹن کے اس ماحول میں وہ شخصیات پیدا ہوئیں جو

آگے چل کر مسلمانوں کے لئے آزادی کی پیامبر اور اُمتِ مسلمہ کی بیداری اور دکھوں کے مداوا کے لئے مسیحا ثابت ہوئیں۔ محمد علی جناح (قائد اعظم) ولادت 1876ء ٹھٹھہ (سندھ)، محمد اقبال (علامہ) ولادت 1877ء سیالکوٹ، محمد علی جوہر ولادت دسمبر 1878ء راجپور۔ برطانوی غلامی سے آزادی کے مجاہدین میں سے چند نمایاں نام ہیں۔

مولانا محمد علی جوہر نے ابتداء میں بروڈہ کی سول سروس میں ملازمت اختیار کی، اس عرصے میں وہ سیاسی طور پر بیدار ہو چکے تھے۔ 1906ء میں مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی تو اس کے قواعد و ضوابط کی تیاری کا کام آپ نے سرانجام دیا تھا۔ اس وقت کے کثیر الاشاعت اخبار 'ٹائمز آف انڈیا' میں قومی مسائل پر آپ کے مضامین شائع ہوتے تھے، آپ نے شاعری کا لب و لہجہ بھی اختیار کیا تاہم ساری سرگرمیوں کا حاصل برطانوی استعمار اور اس کے پس پردہ یہودی صہیونی ذہن سے نجات حاصل کرنا اور عالم اسلام میں نئی روح پھونکنے کا عزم تھا اسی لئے وہ صحافت و سیاست سے وابستہ تھے آپ کی حق گوئی اور بے باکی کی بلند آواز برطانوی ایوانوں میں بھی لرزہ طاری کرتی تھی اور ملک کے طول و عرض میں لوگوں کو میدانِ عمل میں لے آتی تھی۔ برطانوی ہند کے طول و عرض میں حالتِ محکومی میں ایک عوامی تحریک برپا کر دینا ان کی خداداد صلاحیتوں کا بین ثبوت ہے۔

تحریک بحالیِ خلافت یا تحریکِ خلافت 1919ء۔ 1924ء بر عظیمِ پاک و ہند کے طول و عرض میں اُبھرنے والے مسلم جذبے کی ترجمان تھی اور اتنی زور دار تحریک تھی کہ ایک طرف ہندو اس تحریک میں شامل ہو کر اپنا تشخص برقرار رکھنے پر مجبور ہوا اور دوسری طرف برطانوی سامراج کا تخت ڈول گیا۔ ہندو کو خوف پیدا ہوا کہ اگر یہ تحریک کامیاب ہوگئی تو مسلمان مستقبل کے حکمران ہوں گے لہذا گاندھی اور نہرو بھی بحالیِ خلافت کی تحریک میں شامل ہو گئے۔ کہاں ہندو اپنی سرزمین پر مسلمانوں کو علیحدہ وطن دینے پر آمادہ نہیں تھا اور انتقامی جذبات رکھتا تھا اور کہاں مسلمانوں کی مرکزیت اور بحالیِ خلافت کی تحریک میں شمولیت۔

یہ تحریک خلافت کیوں برپا ہوئی اور اس کے مقاصد کیا تھے؟ آئیے ذرا اس کی تفصیل

میں جاتے ہیں:

مسلمانوں کی تاریخ میں خلافت راشدہ کے بعد مسلمانوں کا پہلا عروج عربوں کی زیر قیادت ہوا تھا۔ دور بنو امیہ 661ء-752ء (40ھ تا 132ھ) اور دور بنو عباس 752ء-1258ء (132ھ-656ھ) چھ صدیوں پر محیط ہے۔ سقوط بغداد تا تاریخوں کے ہاتھوں ہوا۔ ہلاکو خان، چنگیز خان، منگولیا (چین) سے آئے تھے مگر دو صدیوں کے اندر ہی جنہوں نے مسلمانوں کو فتح کیا تھا انہیں اسلام کی حقانیت نے فتح کر لیا اور ایک ہی وقت میں ہند میں مغلیہ سلطنت، ایران میں صفوی سلطنت اور ترکی میں عثمانی سلطنت قائم ہوئی۔ یہ تینوں انہی قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں سے عثمانی حکومت سطوت و عظمت اور مرکزیت کے لحاظ سے بہت آگے تھی۔ سلطان محمد فاتح نے 1453ء میں قسطنطنیہ فتح کر کے عیسائیت اور قیصر روم کی باقیات کا غرور خاک میں ملا دیا، جس سے مشرقی یورپ کی طرف اسلام کا دروازہ کھل گیا۔ (یاد رہے کہ مغربی یورپ میں اسلام 711ء (93ھ) میں طارق بن زیاد رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں پہلے ہی آچکا تھا۔ 1492ء تک مسلمان حکمران رہے۔ اسپین اور مغربی یورپ ترقی، تعلیم اور سائنسی ایجادات میں عربوں کے زیر احسان ہیں)

1452ء کے بعد مسلمان مشرق سے یورپ میں داخل ہوئے تو ظالم حکمرانوں کے چنگل میں پھنسے اور رومی جبر و ظلم کے مارے یورپی عوام کو سکھ کا سانس لینے کا موقع ملا اور دیکھتے ہی دیکھتے روسی ترکستان اور سارا مشرقی یورپ عثمانی سلطنت کے زیر نگیں آ گیا اور مسلمان افواج فرانس کے دل پیرس کے پاس پہنچ گئیں۔

عثمانی سلطنت کی حدود مشرق وسطیٰ کے ساتھ ساتھ شمالی اور وسطی افریقہ کے سارے آباد علاقوں تک وسیع تھیں جنوبی افریقہ اس وقت تک ویسے ہی بے آباد تھا۔ 1750ء کے عشرے تک امریکہ جانے والے لوگ مراکش کے ساحل پر عثمانی سلطنت کو ٹیکس دیتے تھے اور یورپی ماہی گیر عثمانی سلطنت کی اجازت کے بغیر امریکہ سفر نہیں کر سکتے تھے۔

عثمانی سلطنت مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی نقیب اور مسلم تہذیب و ثقافت کی آئینہ دار تھی ساری دنیا کے علاقائی مسلمان حکمران سلطنت عثمانیہ کا اجازت نامہ حاصل کرتے تھے حتیٰ کہ مغلیہ خاندان کے حکمران بھی عثمانی خلافت کے تابع تھے اور اسی میں اپنی سعادت سمجھتے تھے۔

عثمانی سلطنت کی عظمت کا یہ عالم تھا کہ 1750ء کے لگ بھگ فرانس کے شہر پیرس میں پہلا نائٹ کلب (بے حیائی کا اڈہ) قائم ہوا اور اس کی اطلاع عثمانی خلیفہ کو ہوئی تو اس کو علماء نے مشورہ دیا کہ اس 'برائی' کو 'نہی عن المنکر' کے تحت روکنا ضروری ہے ورنہ یہ 'برائی' مسلم علاقوں میں بھی پھیل جائے گی۔ عثمانی حکمران نے فرانس کی حکومت کو خط لکھا کہ ہم نے سنا ہے کہ تمہارے ملک میں ایک 'نائٹ کلب' کھلا ہے اس کو بند کر دو ورنہ ہم تمہارے ملک پر حملہ کر دیں گے۔ قارئین حیران ہوں گے کہ وہ نائٹ کلب بند کر دیا گیا۔

یورپی استعمار ————— صنعتی ترقی اور سائنسی ایجادات کے ساتھ اٹھا، مشینوں کی ایجاد سے کارخانوں میں پیداوار بڑھی تو تیار کردہ مال کے لئے منڈیوں کی تلاش کا مرحلہ آیا۔ تاہم برطانیہ، فرانس، سپین، پرتگال، جرمنی، بلجیم، اٹلی سب کو احساس تھا کہ مشرق میں اور جنوب میں پورا افریقہ عثمانی سلطنت ہے لہذا انہوں نے مغرب میں امریکہ اور بڑی کوشش سے راس امید (جنوبی افریقہ) سے ہو کر ہندوستان اور مشرق بعید کے ممالک کو اپنی کاروائیوں کا نشانہ بنایا اور قبضہ کر کے اپنا اقتدار قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔

یورپی ممالک بالخصوص برطانیہ نے عثمانی سلطنت سے مقابلہ کی طاقت نہ پا کر سازشوں، بدعہدیوں، غداروں اور مسلمانوں کے اندر گھس کر (نام نہاد مسلمان بن کر) کام کیا ہے۔ "ہمفرے کے اعترافات" نامی کتاب میں درج تفصیلات سے برطانوی کارپردازوں کے ابلیسی ذہن، اخلاق و کردار سے حد درجہ گری ہوئی حرکات، بے حیائی کے فروغ اور بے اصولی کے پرلے درجے کے واقعات پر روشنی پڑتی ہے اور سلطنت عثمانیہ کو کمزور کرنے کی صدیوں پر پھیلی ہوئی شیطانی کوششوں کا سراغ ملتا ہے۔

'ہرکمالے رازوال' کے مصداق یہ سلطنت عثمانیہ بھی اُنیسویں صدی کے آخر میں آ کر کمزور پڑ گئی اور بیسویں صدی کے آغاز میں تو ڈگمگانے لگی۔ علامہ اقبال نے اسے 'مرد بیمار' کہا تھا۔ پہلی جنگ 1914ء-1918ء میں ترکی نے جرمنی اور آسٹریا کا ساتھ دیا۔ چنانچہ جرمنی کی شکست کے بعد ترکی کو بھی اس کے نتائج بھگتنا پڑے۔ اس جنگ میں برطانیہ نے مشرق وسطیٰ کے علاقے میں اسرائیل کے قیام کی راہ ہموار کر دی۔ 1917ء میں برطانوی وزیر خارجہ بالفور نے

ایک ڈکلیئریشن کے ذریعے یہودیوں کو فلسطین میں آباد ہونے اور جائیداد خریدنے کی اجازت دے دی۔ پہلے انہیں اس کی اجازت نہیں تھی۔

1919ء میں جنگ کے خاتمے پر ایک کانفرنس میں عثمانی حکومت کو تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا گیا جس سے برطانوی ہند کے مسلمانوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ خلافت بھی عملاً ختم کر دی گئی، مصطفیٰ کمال اتاترک کو صدر بنا دیا گیا اور ترکی کے نام سے ایک ملک باقی رہ گیا، ساری عثمانی سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے گئے، مشرقی یورپ کی ساری ریاستیں آزاد ہو گئیں، مشرق وسطیٰ میں کئی آزاد ممالک بنا دیے گئے جو برطانیہ کے زیر اثر رہے۔ سلطنت عثمانیہ کے زوال کا برطانیہ کے محکوم مسلمانوں نے بہت اثر لیا اور ملک گیر احتجاج کا پروگرام بنا کہ برطانوی حکومت یہ فیصلہ واپس لے، 'تحریک خلافت' کے نام سے تحریک جاری ہوئی جس کا آغاز اجتماعی جلسوں سے ہوا۔ 27 اکتوبر 1919ء کو یوم خلافت منایا گیا اور ملک بھر میں کاروبار بند رہے، مسلمانوں نے برطانوی حکومت کے ہفتہ تقریبات امن کا بھی بائیکاٹ کیا۔

آل انڈیا سنٹرل خلافت کمیٹی کا پہلا اجلاس 24 نومبر 1919ء کو مسٹر فضل الحق کی زیر صدارت دہلی میں ہوا۔ اس میں مسٹر گاندھی، مسٹر نہرو اور پنڈت موہن مدن دہلوی بھی شریک ہوئے، مسٹر گاندھی نے مسلمانوں کو ہندوؤں کی بھرپور حمایت کا یقین دلایا۔ 1920ء میں خلافت کمیٹی کا اجلاس بمبئی میں ہوا۔ ایک وفد یورپی ممالک اور مسلم ممالک میں بھیجنے کا فیصلہ ہوا تاکہ ان ممالک کی حمایت حاصل کی جاسکے۔ دوسری طرف برطانیہ اور یہودی ذہن ترکی کی خلافت پر پروپیگنڈا کر رہا تھا تاکہ خلافت کے خاتمے کے لئے فضا ہموار ہو۔ وفد مشرق وسطیٰ سے ہو کر لندن گیا۔ وزیراعظم وغیرہ سے ملاقاتیں بھی ہوئیں مگر بے سود۔ اس لئے کہ جنگ کے بعد کے اقدام یہودی کانگریس کے 1897ء کے خصوصی اجلاس کے فیصلوں کے مطابق پہلے ہی طے شدہ تھے اور 'فرنگ کی رگ جان پنچہ یہود میں ہے' کے مصداق مسلمانوں کی اجتماعیت کے خلاف یہ فیصلے ہر طرف سے ایک ہی مشن کے لئے مدد و معاون تھے کہ کسی طرح مسلمانوں کی مرکزیت ختم ہو اور اسرائیل کا قیام عمل میں آئے۔ یہ وفد یورپ کے دیگر ممالک اٹلی فرانس سے ہوتا ہوا واپس پہنچا۔ ستمبر 1920ء میں یہ طے پایا تھا کہ عدم تعاون کی ملک گیر تحریک چلائی جائے۔ اس پروگرام کی

کانگریس، جمعیت علمائے ہند اور خلافت کمیٹی نے بھرپور حمایت کردی۔ اس کے لئے تعاون کی عملی اپیل ہوئی تو اس کا بھرپور مثبت عوامی رد عمل سامنے آیا۔ دراصل ہندو چاہتا تھا کہ مسلم قیادت ہجرت کر کے ہندوستان سے چلی جائے جس کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں سے نمٹنا آسان ہو جائے گا۔

کامیاب تحریک چلی ہزاروں لوگ گرفتار ہوئے۔ مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا حسین احمد مدنی، ڈاکٹر سیف الدین، پیر غلام مجدد وغیرہم کو دو دو سال کے لئے قید کر دیا گیا جس سے تحریک کو زبردست دھچکا بھی لگا اور قیادت کے خلا سے تحریک شدت پسند ہو گئی اور متعدد تشدد کے واقعات رونما ہو گئے جس سے حکومت نے اس تحریک کو سختی سے کچل دیا۔ اس تحریک کے لیے سب سے زیادہ نقصان دہ واقعہ برطانیہ کے سازشی ذہن کی پیداوار مصطفیٰ کمال اتاترک کا اقتدار تھا جو منصوبہ سے حکمران بنا اور بالآخر مارچ 1924ء میں مسلمانوں کا نظامِ خلافت ختم کر کے اسلامی شریعت کے قوانین منسوخ کر دیے اور اس کی جگہ رومن لا اور مغربی جمہوری نظام نافذ کر دیا۔

چاک کر دی ترکِ ناداں نے خلافت کی قبا

سادگی مسلم کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

تاہم اس موقع پر گاندھی نے جس طرح آخری دنوں میں اسی تحریک کا اختتام کیا اس سے مسلمانوں کے بارے میں ہندو ذہن سامنے آ گیا اور مسلمانوں کے دلوں میں بظاہر ہندو دوستی کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا ہو گئے۔ تحریکِ خلافت بظاہر بے نتیجہ رہی۔ تحریکِ خلافت کی ناکامی کے باوجود اس پانچ سالہ جدوجہد نے ملک کے طول و عرض اور عالمی سطح پر بھی مسلمانوں کی عمومی بیداری میں بڑا کلیدی کردار ادا کیا۔

مسلم اکابر پر مقدمات کا سلسلہ چلا اور غدار یوں کے مقدمات میں سزائیں بھی ہوئیں تاہم برطانوی ہند میں جہاں 1857ء کے بعد مسلمان اُمت میں خوف اور بے بسی پھیلی ہوئی تھی اس تحریک کے نتیجے میں اس خوف میں شدید کمی آئی اور مسلمان بھی آزادی کے لئے جاری جدوجہد کے دھارے میں شامل ہو گئے۔ اس عمومی مسلم بیداری و شاندار تحریک اور ملک گیر

حرکت نے جو اُمید کی ایک کرن پیدا کر دی تھی اس کے پیچھے علامہ اقبال کی اُمید افزا شاعری کو بھی بہت زیادہ دخل تھا۔ علامہ اقبال 1911ء میں لاہور میں شکوہ اور 1913ء میں جو اب شکوہ مسلمانوں کو سنا چکے تھے اور اس کی داد بھی پا چکے تھے۔ اس شکوہ رجو اب شکوہ کا شہرہ ملک گیر تھا اور عوام و خواص سبھی اس سے متاثر ہوئے تھے۔ پھر علامہ اقبال اپنی شاعری میں اسلام کے شاندار مستقبل سے پردہ اٹھا کر مسلمان اُمت کے دلوں کو گرمارہے تھے۔ اسی دوران میں یہ تحریک برپا ہوئی اور شاندار انداز میں ملک گیر سطح پر بیداری کی لہر آئی اور علامہ اقبال بھی اس سے مسلمانوں کے بارے میں مایوسی کی فضا میں مثبت اور اُمید افزا تاثر لیے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ طلوع اسلام نظم میں اسلام کے شاندار مستقبل کے بارے میں مسلمانوں کے حالات پر گفتگو کرتے ہیں۔ اس نظم کے چند منتخب اشعار درج ذیل ہیں:

دلیل صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابلی
عروقِ مُردہ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
مسلمانوں کو مسلمان کر دیا طوفانِ مغرب نے
عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
کتابِ ملتِ بیضاء کی پھر شیرازہ بندی ہے
اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
حنا بندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا
یہ نکتہ سرگزشتِ ملتِ بیضا سے ہے پیدا
سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
بتانِ رنگ و خون کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا

اُفق سے آفتاب اُبھرا، گیا دورِ گراں خوابی!
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی!
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی
شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نُطقِ اعرابی
خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا!
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا!
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا!
یقین پیدا کر لے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
تری نسبت برا ہی ہے معمارِ جہاں تو ہے!
کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا
نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی، نہ افغانی

ہوئے احرارِ ملت جادہ پیماس تجمل سے
 غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں، نہ تدبیریں
 کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا؟
 ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہانگیری،
 براہی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
 یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
 چہ باید مرد را طبع بلندے، مشربِ نابے
 نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
 پھر اٹھی اشیا کے دل سے چنگاری محبت کی

تماشائی شگافِ در سے ہیں صدیوں کے زندانی!
 جو ہر ذوقِ یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
 نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہے تقدیریں!
 یہ سب کیا ہے؟ فقط اک نکتہ ایمان کی تفسیریں!
 ہوں چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں!
 جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں
 دلِ گرے، نگاہِ پاکِ بینے، جانِ بے تابے!
 یہ صنّاعی مگر جھوٹے ٹنگوں کی ریزہ کاری ہے!
 زمیں جو لانگہِ اطلس قبایانِ تباری ہے!

علامہ اقبال کی اس نظم سے مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کی عظمتِ رفتہ کی بازیافت اور مستقبل میں اس کی نشاۃِ ثانیہ کا جذبہ انگڑائیاں لینے لگا اور مسلمانوں میں برطانوی غلامی سے آزادی کے لئے جدوجہد کا جذبہ پہلے سے کہیں زیادہ زور آور ہو گیا۔

1920ء کی دہائی علی برادران کے ملک گیر سطح پر عروج کا دور ہے جس میں محمد علی جوہر نمایاں تھے دیگر رہنمایاں جو سیاسی سطح پر سرگرم تھے وہ اور تھے۔ اس تحریک سے مسلمانوں میں عمومی بیداری کی لہر اٹھی اور ملک کے طول و عرض میں کئی انجمنیں اور سوسائٹیاں وجود میں آگئیں اور اپنی اپنی سطح پر علاقائی بنیادوں پر سرگرم عمل ہوئیں۔ مدراس کی مچڈن سوسائٹی کے تحت مولانا سید سلیمان ندوی کے ”خطباتِ مدراس“ اور علامہ اقبال کے

RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM

اسی دور کے ہیں حتیٰ کہ مسلمان رہنماؤں نے جن کا ہاتھ حالات کی نبض پر تھا، دسمبر 1930ء میں آلہ آباد میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس طے کیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ موقع خاص طور پر پیدا فرمایا تھا محمد علی جناح برطانوی ہند میں ہندوہٹ دھرمی سے مایوس ہو کر لندن چلے گئے تھے۔ مسلم لیگ کے روایتی صدر آغا خان جو اس تحریکِ خلافت کے دوران بھی انگریز کے اشاروں پر ہی عمل پیرا

رہے، صدارت سے علیحدہ ہو کر ملکہ برطانیہ کے قدموں میں پر یوی کونسل کے ممبر کی حیثیت سے جا بیٹھے تھے۔ ان حالات میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس عام کے لئے نگاہیں کسی شخصیت کی تلاش میں تھیں کہ دسمبر 1930ء میں ہی برطانیہ میں پہلی گول میز کانفرنس کا انعقاد طے پایا جس میں چوٹی کے مسلم زعماء کو بھی جانا پڑا اور مولانا محمد علی جوہر اس وفد میں شریک تھے لہذا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے لئے صدارت کا قرعہ فال رب ذوالجلال کی طرف سے علامہ اقبال کے نام نکلا جو قدرت کے طے شدہ پروگرام کے مطابق یقیناً حکیمانہ فیصلہ تھا اور آنے والے دور کا نقطہ آغاز بن گیا اسی سالانہ اجلاس کی صدارت کے موقع پر علامہ اقبال نے صدارتی خطبہ میں ہی دو قومی نظریہ اور مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ وطن کا نقشہ سامنے رکھا تھا جس سے ملک کے طول و عرض میں جاری مسلمانوں کی آزادی کی جدوجہد اور بیداری کو ایک نصب العین اور منزل مل گئی اور پاکستان کے قیام کی راہ ہموار ہو گئی۔

لندن میں گول میز کانفرنس کے موقع پر مولانا محمد علی جوہر اور دیگر زعمائے ملت نے مسلمانوں کے جذبات کی بھرپور نمائندگی کی اور آزادی پر زور دیا۔ حتیٰ کہ مولانا محمد علی جوہر نے فرمایا کہ تم مجھے آزادی دو ورنہ قبر کے لئے جگہ دو میں ایک غلام ملک میں نہیں مرنا چاہتا اور نہ غلام ملک میں دفن ہونا چاہتا ہوں۔ اللہ نے اس مطالبے میں جان ڈال دی اور مولانا جوہر بیمار ہو کر 4 جنوری 1931ء کو ہی برطانیہ میں انتقال کر گئے۔ اس صورت حال سے برطانیہ کو بڑی پریشانی ہوئی اور مولانا محمد علی جوہر کی میت کو ہندوستان لانا ممکن نہیں رہا جبکہ برطانیہ میں دفن کرنے کا انتظام کرنا بھی ہند کی آزادی کے پروانے پر دستخط کرنے والی بات تھی۔ لہذا بڑی کوشش اور مذاکرات کے بعد مولانا کو فلسطین لے جا کر بیت المقدس کے قریب دفن کیا گیا۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں سے حضرت محمد ﷺ معراج کی شب مکہ سے زمینی سفر کے بعد پہنچے تھے اور یہاں سے آسمانی سفر شروع ہوا تھا اور واپسی بھی یہیں ہوئی تھی۔ شاعر نے اسی لئے مولانا محمد علی جوہر کی وفات اور تدفین پر کہا کہ

ع سوئے گردوں رفت ز آں را ہے کہ پیغمبر ﷺ گزشت

مولانا محمد علی جوہر بیک وقت افسانہ نگار، شاعر، صحافی، اعلیٰ مقرر، مؤرخ، زبردست

انشاء پرداز اور بہت بڑے لیڈر بھی تھے۔ تحریک خلافت میں ان کی فدائیت اور جانثاری کا جذبہ دیدنی تھا۔ اسی موقع پر ان کی والدہ نے کہا تھا کہ 'جان بیٹا خلافت پہ دے دو'۔ انہوں نے اس کو نظم کر دیا اور یہ نظم پورے ملک میں پھیل گئی اور زبان زد عوام و خواص ہو گئی۔ تحریک خلافت کے دوران یہی نعرہ زبانوں تھا:

بولی اماں محمد علی کی جان بیٹا خلافت پہ دے دو

خدا رحمت فرمائے مولانا محمد علی جوہر پر..... خوب آدمی تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور کروٹ کروٹ آرام بخشے۔ آمین



مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ کی ایک خوبصورت نعت

تہنائی کے سب دن ہیں تہنائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں ان سے حنوت میں ملاقاتیں
ہر لحظہ تشفی ہے ہر آن تسلی ہے
ہر وقت ہے دلجوئی ہر دم ہے مداراتیں
کوثر کے تقاضے ہیں تسنیم کے دعوے ہیں
ہر روز یہی چہرے ہر رات یہی باتیں
معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت
اک فناسق و فاحبر میں، اور ایسی کراماتیں!
بے ماسیہ سہی لیکن شاید وہ بلا بھیجیں
بھیجی ہیں درودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں

21

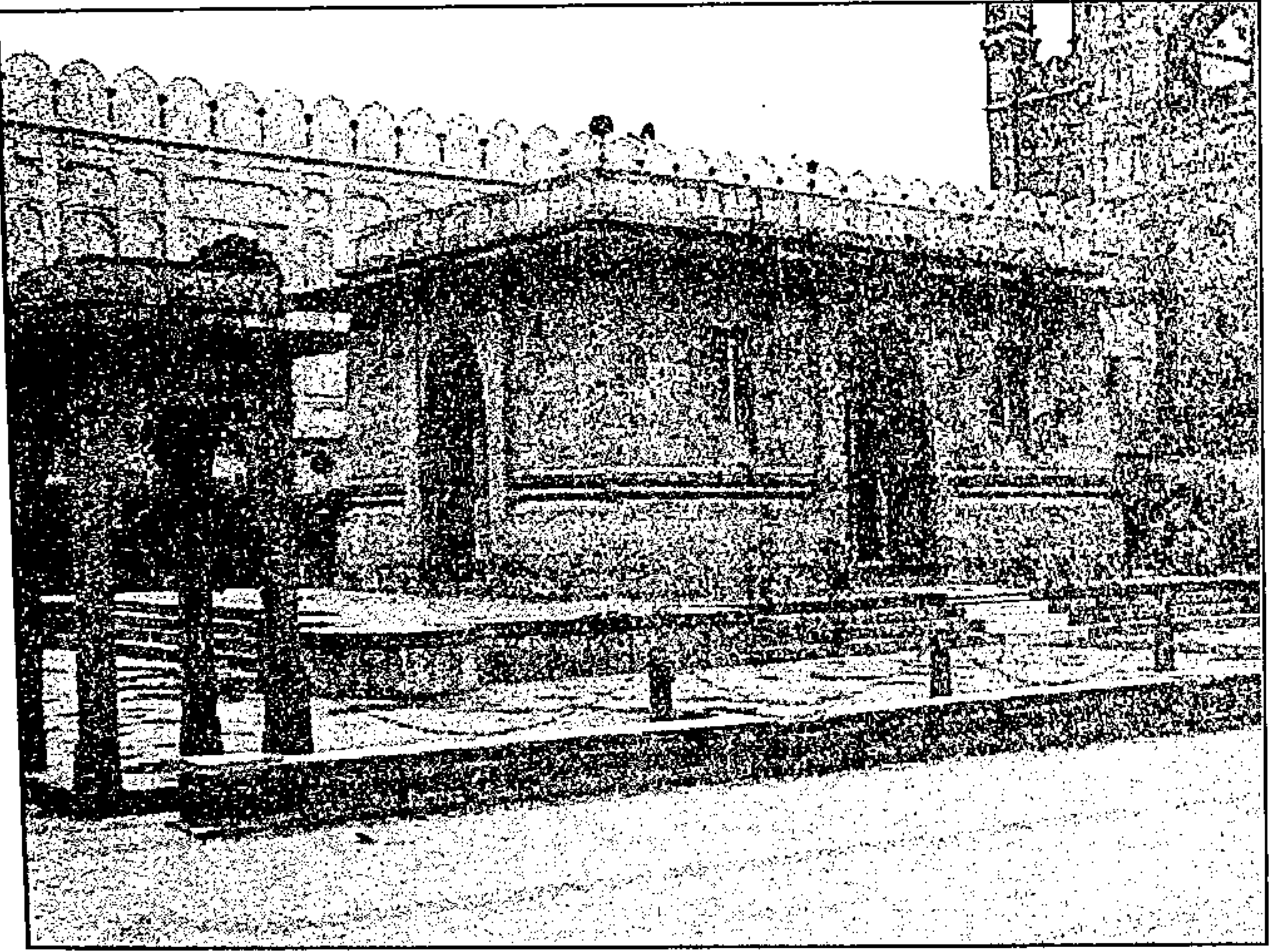
حکیم الامت، مبشر پاکستان، داعی انقلاب،
احیائے خلافت اسلامیہ کا نقیب
حضرت علامہ

ڈاکٹر محمد اقبال

رحمۃ اللہ

ولادت: 1294ھ / 1877ء سیالکوٹ
1907ء میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے وطن واپس آئے تو وکالت کے
ساتھ ساتھ اپنی شاعری، تقاریر اور تصانیف کے ذریعے امت مسلمہ کو
بیدار کیا، مسلمانان ہند کے تشخص کے تحفظ کے لیے گرانقدر کام کیا اور ان
میں آزاد وطن (پاکستان) کے حصول کا جذبہ پیدا کیا۔

وفات: 1357ھ / 1938ء لاہور



آخری آرام گاہ: حضرت علامہ اقبالؒ (بیرون شاہی مسجد) لاہور

مثل ایوانِ سحر مرقدِ فروزاں ہوترا!
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہوترا!

حضرت علامہ محمد اقبال 9 نومبر 1877ء کو سیالکوٹ کے ایک مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ مقامی تعلیم سیالکوٹ میں ہی حاصل کی۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے فلسفہ اور ایم اے عربی کی تعلیم حاصل کی، پھر یہیں تعلیم کے شعبہ سے وابستہ رہے۔ 1905ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان (برطانیہ) تشریف لے گئے، وہاں وکالت کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی، جرمنی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، یورپی درسگاہوں میں وقت گزارنے سے وہاں کے کلچر اور فکری رجحانات سے شناسائی حاصل ہوئی، 1907ء میں واپس تشریف لائے، وکالت کے شعبہ میں کام کرتے رہے لیکن اُن کا اصل شعبہ جس میں اُنہوں نے کام کیا اور عزت پائی وہ سوئی ہوئی مسلمان اُمت کو بیدار کرنا تھا۔ آپ نے اُمت کو بیدار کیا، راستہ بھی دکھایا، نشانِ منزل بھی دیا اور قوم کو قرآن مجید کے ساتھ جوڑ دیا۔ پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کی محبت اور عشق سے خود بھی وافر حصہ پایا تھا اور قوم کو بھی اس جذبے سے سرشار کرنے کا کام کیا۔ قائد اعظم محمد علی جناح جیسا رہنما ڈھونڈ کر قوم کو دیا اور پاکستان کے قیام کی نظریاتی اور عملی راہ ہموار کی۔ دو قومی نظریہ کی آبیاری کی اور مسلمانانِ ہند کے تشخص کا تحفظ اور اُمت مسلمہ کی بقا کا گراں قدر کام کیا اور حکیم الامت کہلائے۔

21 اپریل 1938ء کو وفات پائی اور بادشاہی مسجد کے باہر آسودہ خاک ہیں۔

ع آسماں تیری لحد پر شبِ نیم افشانی کرے!

علامہ اقبال کا کام بہت وسیع الاطراف ہے اُن کے کارنامے کثیر الحجّت ہیں اور اُن کی خدماتِ جلیلہ مسلمانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے مختلف شعبہ جات سے متعلق ہیں۔ ان کے ہم عصروں اور بعد والوں میں کسی ایک انسان کے لئے (جو ان سے مقام و مرتبہ میں فروتر بھی ہو) اُن کے کارناموں کا احصاء اور توصیف ممکن نہیں ہے۔ اُن کے شارحین کی تعداد لاکھوں میں نہیں تو

ہزاروں میں ضرور ہے۔ مجموعی طور پر وہی بات حق ہے جو ایران کے ملک الشعراء ملک بہار نے فرمائی تھی

عصر حاضر خاصہ اقبال گشت
واحدے کز صد ہزاراں برگزشت

عصر حاضر (گزشتہ 1900ء سے لے کر آج تک) دراصل عصر اقبال ہے وہ تنہا لاکھوں پر سبقت لے گئے۔ اُن کے فکر کے بحرِ خار سے، ہر ساعی و متلاشی اپنی بساط کے مطابق لعل ہیرے اور موتی نکال نکال کر لارہا ہے اور۔۔۔ ان کا کلام۔۔۔ علم و معنی کا بحرِ خار کیوں نہ ہو کہ وہ مردِ قلندر۔۔۔ علامہ اقبال۔۔۔ فکری طور پر خود قرآن میں ڈوبا ہوا ہے۔

ع قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلمان
قرآن مجید میں اسی ”غوطہ زنی“ کا ”مان“ ہے جو خود انہیں بھی تھا اور وہ اس کے حقدار تھے اور اہل بھی۔ اُن کا مان بجا تھا چنانچہ وہ اپنے اشعار، جو ”عرض بحضور رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم“ کے عنوان سے ہیں، میں خود فرماتے ہیں:

گر دلم آئینہ بے جوہر است و بحرِ غیر قرآن مضمحل است
پردہ ناموسِ فکرم چاک کن ایں خیاباں را ز خارم پاک کن
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا بے نصیب از بوسہ پا کن مرا
گر دُرِ اسرارِ قرآن سفته ام با مسلماناں اگر حق گفته ام
اے کہ از احسانِ تو ناکس کس است یک دعایت مزد گفتارم بس است

علامہ اقبال کے گونا گوں کارناموں میں سے ان سطور میں ہم علامہ اقبال کے صرف دو کارناموں کا ہی تذکرہ کریں گے:

● ایک ان کا اس وقت کی عالمی مغربی تہذیب یعنی صہیونی یورپی

برطانوی سامراج کی برتری کا تجزیہ، تشخیص اور صائب مشورے دینا۔

● دوسرا سوئی ہوئی، کمزور، غلام مسلمان اُمت کے زوال کے اسباب،

علاج، راہ عمل اور نشان منزل کا شعور واضح کرنا۔

اسلامی انقلابی شخصیات پر سیمیناروں کے سلسلے کا THEME اور مقصد ہی یہ تھا کہ ایسی شخصیات کا نئی مسلمان نسل سے تعارف کرایا جائے جنہوں نے ماضی میں انفرادی و اجتماعی، اصلاحی، انقلابی، خانقاہی اور میدان جنگ کی سرگرمیوں میں حصہ لیا ہے یا اس کا درس دیا ہے۔ حضرت علامہ اقبال کی شخصیت اس سلسلہٴ رشد و ہدایت اور سیمیناروں کی آخری کڑی ہے۔ جس نے دور غلامی میں آنکھ کھولی اور مغرب کی گود میں پرورش پائی اور آپ کا انقلابی فکر اسی تہذیب کے لئے حیا لیوا، ثابِت ہوا۔

فکرِ مغرب کی اٹھان

علامہ اقبال نے شعوری زندگی کا جو زمانہ پایا (1895ء-1938ء) وہ بجا طور پر یورپی طاقتوں کی صنعتی، معاشی اور نظریاتی بالادستی کا دور تھا۔ یہ یورپی طاقتیں استعماری طاقتیں تھیں اور غریب پس ماندہ اور غیر ترقی یافتہ اقوام کو زیر کرنے، اس کے معاشی و معیشتی وسائل کو لوٹنے اور اس علاقے کو اپنی صنعتی پیداوار کی کھپت کے لئے ایک منڈی بنانے سے زیادہ سوچ نہیں رکھتی تھیں، اس کام کے لئے انہوں نے جبر و استبداد کا ہر ہتھکنڈا استعمال کیا سوائے ایک یورپی طاقت جرمنی کے۔ فرانس، اٹلی، پرتگال، برطانیہ سب کے سب ہمیشہ اپنے مفتوحہ اور مقبوضہ علاقوں میں غاصب ہی سمجھے گئے اور ان کے ملکوں کے عوام جتنا عرصہ بھی ان یورپی طاقتوں کے غلام رہے کبھی استعماری طاقتوں کے اقتدار پر خوشی اور اطمینان کا اظہار نہیں کیا۔

ان یورپی طاقتوں کے مقاصد کیا تھے؟ نظریات کیا تھے؟ اور وہ کس مشن پر ان دور دراز علاقوں میں پہنچ کر قابض ہو گئے تھے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن پر غور کرنے سے فکرِ مغرب کی حقیقت سامنے آجائے گی۔

سچی یورپ جب دورِ جہالت و ظلمت (DARK AGES) سے بیدار ہوا تو اس بیداری میں سپین میں مسلم عرب اقتدار (711ء سے 1492ء تک) کی شاندار روایات، مذہبی رواداری، بے نظیر کائناتی تصورات و نظریات (ایمان باللہ، ایمان بالآخرہ و ایمان بالرسالت) اور علم و ہمتی کے ساتھ بے پناہ سائنسی اور فنی ترقی شامل تھی۔ فرانس، برطانیہ اور اٹلی کے نوجوان یہیں سے علم سیکھ کر جاتے تھے اور دوسرے ہم وطنوں کے لئے مشعل راہ بنتے رہے تھے۔

سپین سے مسلمانوں کے خاتمہ اور یورپ کی بیداری سے مسیحی یورپ ایک عجیب کشمکش سے دوچار ہو گیا۔ مسیحیت جو تثلیث کے نظریات لے کر چل رہی تھی اور مذہب کو عقل پر پرکھنے کو جرم سمجھا جاتا تھا اس سائنسی ترقی اور کائنات پر غور و فکر کے راستے میں رکاوٹ ثابت ہونے لگی تو کسی ”دستِ غیب“ (صہیونیت) نے کیتھولک مسیحی مذہب سے پروٹسٹنٹ خیالات کے مسیحی لوگوں کو الگ کر دیا۔ اب پروٹسٹنٹس بائبل پر ایمان لائے بغیر مسیحی کہلاتے تھے اور حضرت مسیح علیہ السلام کے حکموں کو مانے بغیر ان کے پیروکار۔ یہ ”دستِ غیب“ یا خفیہ طاقت سائنسی ترقی کو مسیحیت سے ٹکراؤ کے انداز میں لے کر چلتی رہی ہے اس طاقت نے کوشش کر کے پروٹسٹنٹس کو سود پر آمادہ کیا اور سترھویں صدی میں بنک آف انگلینڈ قائم ہو گیا۔ یہ منصوبہ یہودی سوچ اور پروٹسٹنٹ فرقہ کے اہل کاروں کے ذریعہ بروئے کار لایا گیا۔ اس سودی نظام سے صنعتی ترقی کو بھی مدد ملی اور سرمائے کی ضرورتیں بھی پوری ہوئیں۔ مزید برآں سود کی مد میں بے پناہ وسائل ہاتھ آئے تو سائنسی ترقی کو آگے بڑھانے کے لئے اسی سرمائے کو مزید استعمال کیا گیا۔

صنعتی ترقی کے ساتھ سیاسی طاقت کا توازن بھی اسی دستِ غیب یعنی یہود اور بظاہر پروٹسٹنٹ فرقہ کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ سترھویں صدی کے آخری عشروں اور اٹھارھویں صدی کے آغاز تک یورپ میں یہود اور پروٹسٹنٹ فرقہ کو آگے بڑھانے کے لئے مذہب اور سیاست یا چرچ اور سیاست کو الگ کر دیا گیا۔ اس اہم واقعہ سے ایک خلا پیدا ہو گیا۔ چنانچہ سیاسی حکمرانوں کے پاس اب اخلاقیات کے میدان میں کوئی ضابطہ اخلاق یا صحیفہ یاریفرنس ہی نہ رہا اور نہ حکومت کو چلانے کے لئے قانون (LAW) اور عدالتوں کا نظام۔ نیز مسیحیت کے پاس (یورپ میں) اس ضمن میں آسمانی ہدایت کے تحت کسی قانونی نظام کی روایات موجود نہ تھیں جس پر مستقبل کے ریاستی نظام کی بنیاد رکھی جاسکتی۔

اس خلا کو محسوس کر کے صہیونیت (یا یہود) جو درپردہ اس ساری کارروائی کو چلا (HANDLE) رہی تھی نے دو اقدامات کیے۔ ان اقدامات کے پیچھے چرچ اور سیاست کی جدائی کو بنیاد کا پتھر کہا جاسکتا ہے (یاد رہے کہ کیتھولک مسیحیوں کے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور سے لے کر 1998ء تک یہی رائے مستحکم رہی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دلوانے میں یہود کا

ہاتھ تھا اس لیے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قاتل ہیں لہذا ان سے دوستی نہیں ہو سکتی۔

○ پہلا قدم یہ اٹھایا گیا کہ ملک کو مذہب سے آزاد سیکولر انداز میں چلانے کے لئے (جس میں دراصل یہود ہی کو فائدہ تھا) یونانی فلسفہ کو بطور ”مذہب“ یا کائنات کی تشریح کرنے کے TOOL کے طور پر اختیار کر لیا گیا اور دو ہزار سال بعد یونانی فلاسفہ کو نئی زندگی دے کر ان کے نظریات کو سرکاری سطح پر رائج کر دیا گیا۔

○ دوسرا کام یہ ہوا جس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ملک کے لئے قانونی نظام تو مذہب دے سکتا ہے جبکہ مذہب سے انکار ہو چکا اب اس خلاء کو پر کرنے کے لئے بہترین نظام سپین کا نظام حکومت تھا مگر درمیان میں مذہب دوبارہ آتا تھا اور دوسرے یہود کے منصوبوں میں چونکہ اسلام دشمنی ایک بنیادی پتھر ہے لہذا رومیوں کے ظالمانہ، بے رحمانہ اور مشرکانہ عقائد کی بنیاد پر تعمیر کردہ قانونی نظام کو اپنالیا گیا اور رائج کر دیا گیا۔ اس موقع پر یہود حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کا قانون حکمرانی نافذ کر سکتے تھے مگر مصلحتاً اس سے باز رہے کہ ان کے ابلیسی مقاصد اس طرح حاصل نہیں ہو سکتے تھے۔

یونانی فلسفہ اور رومی نظام قانون (ROMAN LAW) دو ایسے اہم ستون ہیں جن پر مغربی فکر و فلسفہ اور استعمار کی ساری عمارت کھڑی ہے اور اسی ظالمانہ نظام قانون سے ہی یورپی استعماری طاقتیں دنیا بھر کے علاقوں پر قابض ہو گئیں۔ اس لئے کہ ان کے دامن میں نہ کوئی اخلاق تھا نہ رحمہلی، نہ انسانی ہمدردی نہ نوع انسانی کے لئے کوئی فلاحی مقاصد۔ چنانچہ دور حاضر کی مشہور کتاب ”تہذیبوں کا تصادم“ (CLASH OF CIVILISATIONS) کا مصنف (P. HUNGTINGTON) لکھتا ہے:

”..... 1500ء سے 1750ء کے درمیانی عرصے میں پہلی عالمی سلطنت کو قائم

کرنے میں مغرب والوں کی کامیابی کا دار و مدار ان کی جنگی استعداد میں اضافہ تھا۔

جس کو فوجی انقلاب کا نام دیا گیا ہے۔ مغرب نے دنیا کو اپنے نظریات یا اقتدار یا

مذہب کی وجہ سے فتح نہیں کیا تھا بلکہ اس وجہ سے فتح کیا کہ منظم تشدد کرنے میں اس کو

برتری حاصل تھی۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کو مغرب کے لوگ تو بھول جاتے ہیں لیکن

غیر مغربی لوگ فراموش نہیں کر سکتے.....“

یہی وجہ تھی کہ یورپی استعمار، استعمار ہی رہا اور مقبوضہ علاقوں میں کوئی مثبت روایات نہ چھوڑ سکا۔ اس مغربی فکر نے صنعتی ترقی کے ساتھ پروان چڑھ کر مزید کئی گل کھلائے ہیں اور اس کے پیچھے بھی یہی دستِ غیبِ یہودی ذہن، فری میسن تحریک اور صہیونی عزائم ہی کارفرما نظر آتے ہیں۔

اجتماعی سطح پر برطانیہ، فرانس اور دوسرے یورپی ممالک (اور بعد ازاں امریکہ) جدھر جا رہے تھے اس میں یہی درپردہ قوتیں سیکولرازم کو کا زہر گھول رہی ہیں۔ یہ ان کی بڑی دور رس منصوبہ بندی تھی اور اسی میں ان درپردہ قوتوں کو آزادانہ کام کرنے کا موقع مل سکتا تھا۔ اس سیکولرازم کی سوچ میں بظاہر بڑی معصوم اصطلاحات اور عنوانات ہیں جنہیں غلط استعمال کر کے غلط فلسفہ ہائے زندگی بنا دیا گیا۔ انسانی حقوق، ہر انسان کو زندہ رہنے کا حق، مذہبی آزادی، رائے کی آزادی ایسی اصلاحات ہیں جن کی آڑ میں یہ فری میسن تحریک اور صہیونیت پل کر جوان ہوئی ہے۔ اسی سوچ نے جمہوریت کی بنیاد رکھی مگر یہ خیر بھی اس گروہ نے سرمایہ دارانہ جمہوریت میں بدل کر انسانیت کے لئے شتر بنا دیا۔

یورپی معاشرہ پہلے پہل ایسا برا نہیں تھا وہاں بھی اہل حق اور باضمیر لوگوں نے سیکولرازم کو اس خلافِ فطرت سوچ اور معاشرے کی بنیادی اقدار کو مسخ ہوتے دیکھا تو اس کو روکنے کی سر توڑ کوششیں کی ہیں۔ بہت سے حق پرست اور باضمیر حکماء نے اس سلسلے میں ساری ساری زندگیاں لگا دیں جیسے جرمنی کے کانٹ (1722ء-1804ء) اور گوٹے۔ گوٹے نے یورپی اقوام میں انسانی اعلیٰ اخلاق اور بنیادی انسانی اقدار کو یوں فنا ہوتے اور صنعتی ترقی کے سامنے دم توڑتے دیکھا تو تحریک مشرقی شروع کی (جرمن قوم باقی یورپی اقوام سے تاریخی جغرافیائی، تہذیبی اور ثقافتی طور پر قدرے مختلف ہے) تاکہ مذہب اور انسانی اقدار کا تحفظ ہو سکے مگر صہیونی عزائم اور صنعتی ترقی کے ریلے میں بدلتی معاشرتی اقدار اور دنیا پرستی و عیاشی کے رجحانات کے سامنے یہ تحریک دب کر رہ گئی۔

آزادگی رائے کے عنوان سے اور پروٹسٹنٹ کے مزاحمتی اور CHALLENGING انداز کے فروغ سے نئے نئے فلسفے اور ماضی کی انسانی روایات کی بلاوجہ دھجیاں بکھیرنے والی سوچ آگے بڑھی ماحول نے اس کی حوصلہ افزائی کی اور یوں مختلف پست انسانی روئے فلسفوں کی شکل میں سامنے آتے چلے گئے۔

اس سارے عمل میں بہت ساری تحقیق، انکشافات اور کائناتی تسخیر کے نتیجے میں مثبت چیزیں بھی سامنے آئیں اور سابقہ انسانی اوہام، فرسودہ خیالات اور بے بنیاد اعتقادات کی بنیادیں یکسر منہدم ہو گئیں مگر نتیجے کے طور پر مغربی تہذیب اور معاشرہ جدھر چل نکلے تھے اس میں 'شر' اور ابلیسی رویے ہی زیادہ نمایاں ہوتے چلے گئے۔

مشہور نظریات جن کو درپردہ صہیونی قوتوں نے جان بوجھ کر ابھارا یونیورسٹیوں میں جگہ دی اس کے حامیوں کو اعلیٰ اعزازات، منصب اور نوبل پرائز دیے وہ سب کے سب انسان کو اعلیٰ اخلاق سے دھکیل کر حیوانیت اور بھیمت (BEASTALITY) کی طرف دھکیلتے چلے گئے۔ میکڈوگل، ڈارون، ایڈلر مارکس، فرائڈ وغیرہم اس ضمن میں اپنے نقطہ نظر کے سرخیل تھے ان کے ساتھ ہزاروں دیگر افراد تھے جو ان کے ہم خیال بن گئے انسان میں پابندیوں سے گریز کا مادہ تو ہے ہی، مذہبی احکام اور آسمانی ہدایت کی پابندیوں کا مذاق اڑایا گیا اور ترقی یافتہ ممالک بظاہر ترقی کی طرف گامزن تھے مگر دراصل حیوانیت کے قعر ندلت میں گرتے چلے گئے۔

علامہ اقبال نے اسی مغربی فکر اور اس کے سب اجزائے ترکیبی پر سخت تنقیدیں کی ہیں ان کی اردو اور فارسی شاعری میں یہ رچا بسا ہے۔ بانگ درا اگرچہ بہت بعد میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی مگر اس میں شامل کلام علامہ اقبال کے طویل عرصے کی سوچ اور اظہار مافی الضمیر کا عکس ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکان نہیں ہے

کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ زر کم عیار ہو گا

مغربی تہذیب کے بارے میں فرماتے ہیں:

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب

کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عقیف!

رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید

ضمیرِ پاک و خیالِ بلند و ذوقِ لطیف!

سیکولرازم اور مادر پدر آزادی کے بارے میں فرماتے ہیں:

آزادی افکار سے ہے ان کی تباہی
 رکھتے نہیں جو فکر و تدبیر کا سلیقہ
 ہو فکر اگر خام تو آزادی افکار
 انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ!
 عصر حاضر کے بارے میں فرماتے ہیں:

مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر
 چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام!
 مردہ لادینی افکار سے افرنگ میں عشق
 عقل بے ربطی افکار سے مشرق میں غلام!

(لادینی افکار سے مراد سیکولر ازم ہی ہو سکتا ہے اور عشق سے مراد خدا شناسی اور دینی اقدار ہیں)
 مغربی تہذیب میں STATUS رکھ رکھاؤ اور بہترین دنیاوی زندگی، بہترین
 آسائشیں (MODERN COMFORTS) ہی اصل مقصود اور نظریہ حیات قرار پایا ہے۔

عصر حاضر ملک الموت ہے تیرا، جس نے
 قبض کی روح تری دے کے تجھے فکرِ معاش!
 اور اس چکاچوند ترقی سے انسان فطرت شناس نہ رہا بلکہ بطن و فرج کا غلام ہو گیا
 مدرسے نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو
 خلوتِ کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش!
 سوالیہ انداز میں بے برگ و بار مغربی ترقی کے بارے میں فرماتے ہیں:

کوئی پوچھے حکیم یورپ سے
 ہند و چیناں ہیں جس کے حلقہ بگوش!
 کیا یہی ہے معاشرت کا کمال؟
 مرد بے کار و زن تہی آغوش!

مغربی افکار میں 'آزادی' (مادر پدر آزادی اور عورتوں کی آزادی) کے بارے میں حد سے زیادہ

زور ہے اور آزادی نسواں کے نام پر بے حیائی اور بدتمیزی کا طوفان برپا کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

اس بحث کا کچھ فیصلہ میں کر نہیں سکتا
گو خوب سمجھتا ہوں کہ یہ زہر ہے، وہ قند
کیا فائدہ کچھ کہہ کے بنوں اور بھی معتوب
پہلے ہی خفا مجھ سے ہیں تہذیب کے فرزند
اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش
مجبور ہیں، معذور ہیں، مردانِ خرد مند
کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ
آزادی نسواں کہ زمرد کا گلوبند؟

تہذیب مغرب نے فرصت کے لمحات کے لئے جو فنون لطیفہ بنائے اس میں رقص،

بے لباسی، عریانی، شراب، حیوانیت بنیادی تصورات ہیں۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں:

چھوڑ یورپ کے لیے رقصِ بدن کے خم و پیچ
روح کے رقص میں ہے ضربِ کلیمِ اللہی!
صلہ اس رقص کا ہے تشنگیِ کام و دہن
صلہ اس رقص کا درویشی و شاہنشاہی!

اہل مغرب کو فکر مغرب کی ناپختگی سے متنبہ بھی فرمایا:

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی

جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہوگا

یورپی ترقی سے دراصل یہودی و صہیونی عزائم کی تکمیل ہی مقصود ہے۔ فرماتے ہیں:

یہ عیشِ فراواں، یہ حکومت، یہ تجارت

دل سینہ بے نور میں محرومِ تسلی!

تاریک ہے افرنگِ مشینوں کے دھوئیں سے

یہ واوی ایمن نہیں شایانِ تجلی!

ہے نزع کی حالت میں یہ تہذیبِ جوانمرگ

شاید ہوں کہ کلیسا کے یہودی متولی!

مغربی تہذیب کے ابلسی عزائم کے بارے میں فرماتے ہیں:

تری حریف ہے یارب سیاست افرنگ

مگر ہیں اس کے پجاری فقط امیر و رئیس

بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے

بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس

فکر مغرب کی معراجِ جمہوریت کے بارے میں فرماتے ہیں:

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں

بندوں کو گنا کرتے ہیں تو لا نہیں کرتے

دیو استبدادِ جمہوری قبا میں پائے کوب

تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

جمہوریت کی آڑ میں ابلسی عزائم کی تکمیل پر تبصرہ کرتے ہوئے ”ابلیس کی مجلس شوریٰ“

میں ارشاد ہے:

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام؟

چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر!

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس

جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر

علامہ اقبال کے بارے میں دوسرا پہلو جس کا اوپر تذکرہ ہوا تھا وہ ان کے کلام میں

امتِ مسلمہ سے خطاب ہے اور اس سوئی ہوئی قوم کو جگانے کا عظیم کام ہے اور علامہ اقبال کا اصل

کارنامہ ہی یہی ہے۔ مغرب پر تنقید دراصل مسلم نوجوانوں اور آسودہ حال، مغرب پرست اور

مغرب زدہ طبقات کو مغرب کی تہذیب کی حقیقت دکھانا مقصود تھا تا کہ وہ بھی ان کی طرح اسلام

کے دامن میں آجائیں اور حضرت محمد ﷺ کے قدموں تلے گوشہ عاقبت تلاش کر لیں۔

اس نقطہ نظر سے ان کی شاعری پر نگاہ ڈالی جائے تو نظر آتا ہے کہ یہی ایک مقصد تھا جو ان کے پیش نظر تھا اور جس کے ابلاغ کا حق ادا کرنے کے لئے انہوں نے اظہارِ مافی الضمیر کے مختلف پیرائے استعمال فرمائے۔

اردو دان طبقے کے لئے اردو میں، وسیع تر حلقے اور اعلیٰ علمی ذوق رکھنے والوں کے لئے فارسی میں (اس وقت فارسی کا اعلیٰ علمی ذوق موجود تھا جو آج ناپید ہے) اور عالمی سطح پر اونچے طبقات میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور اپنی بات کے ابلاغ کے لئے انگریزی زبان میں اپنے خیالات و افکار دنیا کے سامنے پیش فرمائے۔ خود فرماتے ہیں دنیا مجھے شاعر کی حیثیت سے جانتی ہے حالانکہ میں (محض) شاعر نہیں ہوں مع میری نواؤں میں ہے میرے جگر کا لہو

اور ے جوانوں کو مری آہ سحر دے

پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے

خدایا آرزو میری یہی ہے

مرا نور بصیرت عام کر دے

یا فارسی زبان میں ارشاد ہے مع مرا یاراں غزل خوانے شمرند

اور ے نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست

سوئے قطار می کشم ناقہ بے زمام را

علامہ اقبال کے سینہ میں یہی جذبہ موجزن تھا جس نے 1911ء میں انجمن حمایت

اسلام کے سالانہ جلسہ میں 'شکوہ' کی صورت اختیار کر لی۔

اس وقت مسلمانوں کی بے چارگی، اقتصادی بد حالی، تعلیمی پسماندگی، قیادت کا

فقدان، غلامی کا شکنجہ، جبر و استبداد، دین سے بے اعتنائی اور تاریک مستقبل کا خوف ایسے منحوس

عوامل تھے جس سے برطانوی ہند کے مسلمان دوچار تھے اگرچہ مولانا الطاف حسین حالی نے پہلے

'مسدس حالی' لکھی تھی اور مسلمانوں کو جگانے کی کوشش کی تھی تاہم علامہ اقبال کی نظم 'شکوہ' نے

پورے ہند کے مسلمانوں کو گرمادیا اور باشعور طبقے کی آنکھیں کھل گئیں۔

یہ 'شکوہ' کیا تھا مسلمانوں کو اپنا عظیم ماضی یاد دلا کر دوبارہ اللہ تعالیٰ اور اس کے

رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹنے کا احساس دلانا تھا۔ سوالیہ انداز میں مسلمان عوام و خواص کو سوچنے پر مجبور کرنا تھا کہ کبھی مسلمان کیا تھے؟ اور آج کیا ہیں؟

ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کا منظر کہیں مسجود تھے پتھر، کہیں معبود شجر
خوگر پیکر محسوس تھی انساں کی نظر مانتا پھر کوئی ان دیکھے خدا کو کیونکر؟
تجھ کو معلوم ہے لیتا تھا کوئی نام ترا؟

قوت بازوئے مسلم نے کیا کام ترا!

ٹل نہ سکتے تھے اگر جنگ میں اڑ جاتے تھے پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اکھڑ جاتے تھے
تجھ سے سرکش ہوا کوئی، تو بگڑ جاتے تھے تیغ کیا چیز ہے؟ ہم توپ سے لڑ جاتے تھے
نقش توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے

زیر خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے

تو ہی کہہ دے کہ اکھاڑا درخیر کس نے؟ شہر قیصر کا جو تھا اس کو کیا سر کس نے؟
توڑے مخلوق خداوندوں کے پیکر کس نے؟ کاٹ کر رکھ دیے کفار کے لشکر کس نے؟

کس نے ٹھنڈا کیا آتش کدہ ایراں کو؟

کس نے پھر زندہ کیا تذکرہ یزداں کو؟

آگیا عین لڑائی میں اگر وقت نماز قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قوم حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے!

تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے!

صفحہ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے نوع انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے
تیرے کعبے کو جبینوں سے بسایا ہم نے تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے

پھر بھی ہم سے یہ گلا کہ وفادار نہیں

ہم وفادار نہیں، تو بھی تو دلدار نہیں!

آخر میں التجا کے انداز میں اللہ تعالیٰ سے دعا کی ہے:

مشکلیں اُمتِ مرحوم کی آساں کر دے مورِ بے مایہ کو ہمدوشِ سلیمان کر دے
 جنسِ نایابِ محبت کو پھر ارزاں کر دے ہند کے دیر نشینوں کو مسلمان کر دے
 جوئےِ خونِ می چکد از حسرتِ دیرینہ ما
 می تپد نالہ بہ نشترِ کدہٗ سینہٗ ما!
 اپنے بارے میں انہیں احساس تھا کہ ان کا مشن کیا ہے؟ تاہم لوگ ان کا ساتھ نہیں
 دے رہے اور بات نہیں سنتے۔

ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنم اب تک
 اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک
 مسلمانوں کی حالت زار پر خون کے آنسو بہائے ہیں اور فرمایا:

لطف مرنے میں ہے باقی نہ مزا جینے میں کچھ مزا ہے تو یہی خونِ جگر پینے میں!
 کتنے بیتاب ہیں جو ہر مرے آئینے میں کس قدر جلوے تڑپتے ہیں مرے سینے میں!
 اس گلستاں میں مگر دیکھنے والے ہی نہیں
 داغ جو سینے میں رکھتے ہوں وہ لالے ہی نہیں

اس مضمون کو فارسی میں یوں ادا کر کے قوم کے اہل علم دانشور طبقے کو احساس دلایا ہے۔

غمِ پنہاں کہ بے گفتنِ عیان است
 چو آید بر زبان یک داستان است
 رہے پُر پیچ و راہی خستہ و زار
 چراغش مُردہ و شب درمیان است

”ایک اندرونی غم کہ اس کے اثرات بغیر بتائے ظاہر ہوں اگر اسے زبان پر لایا جائے

تو ایک (طویل) داستان ہے (ان حالات میں) راستہ پیچیدہ اور مسافر خستہ حال اور

پریشان ہے۔ چراغ بجھا ہوا اور (شام کا وقت کہ) ایک (طویل) شب سامنے ہے۔“

اپنے کلام اور اس کے مضامین کی پاکیزگی اور احیائے اُمت کے مشن کے بارے میں

ان کے باطنی احساسات یہ تھے:

عجمی خم ہے تو کیا مے تو حجازی ہے مری

نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے مری

دو سال بعد 1913ء میں اسی جگہ 'جوابِ شکوہ' نظم پڑھ کر سنائی یہ 'جواب' دراصل کچھ اہل علم کی طرف سے نظم شکوہ کے بعض الفاظ سے اللہ تعالیٰ کے لئے سوئے ادب کے پہلو نکلنے پر لکھا گیا تھا۔ اس میں شاعرانہ تخیل بہت بلند ہے اور کلام اللہ و فرامین نبوی ﷺ سے ہی اُمت کی ذمہ داریاں، اللہ تعالیٰ سے محبت اور رسول ﷺ کی محبت کے تقاضے، سچا اُمتی ہونے کا مطلب، بندگی رب اور عشق رسول کے دعوے کا مطلب ہی مسلمانوں کو سمجھایا گیا ہے۔ شکوہ سے قوم میں اللہ کی خاص اُمت ہونے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے نسبت، اولیاء اللہ سے نسبت، مسلمانوں کے شاندار ماضی کا احساس پیدا ہوا تو جوابِ شکوہ سے اُن کی ذمہ داریاں اور مستقبل میں اسلام کے غلبے اور عالمی خلافت کے قیام پر بات ختم ہوئی۔ فرماتے ہیں:

عشق تھا فتنہ گر و سرکش و چالاک مرا

آسماں چیر گیا نالہ بے باک مرا

اس طرح علامہ اقبال نے انسان کو وقتی طور پر اللہ تعالیٰ سے ہم کلام کر دیا۔

شکر شکوے کو کیا حسنِ ادا سے تو نے

ہم سخن کر دیا بندوں کو خدا نے تو نے

جوابِ شکوہ میں علامہ نے جو سخت تنقید اُمت کے حالات زار، علماء و صوفیاء اصحاب

ثروت، اُمت کے رہنماؤں پر کی ہے وہ اپنی جگہ ایک اہم کارنامہ ہے

کس قدر تم پہ گراں صبح کی بیداری ہے! ہم سے کب پیار ہے؟ ہاں نیند تمہیں پیاری ہے

طبع آزاد پہ قیدِ رمضاں بھاری ہے تمہیں کہہ دو یہی آئینِ وفا داری ہے؟

قوم مذہب سے ہے، مذہب جو نہیں تم بھی نہیں

جذبِ باہم جو نہیں، محفلِ انجم بھی نہیں

جن کو آتا نہیں دنیا میں کوئی فن، تم ہو نہیں جس قوم کو پروائے نشیمن، تم ہو

بجلیاں جس میں ہوں آسودہ وہ خرمن، تم ہو بیچ کھاتے ہیں جو اسلاف کے مدفن، تم ہو

ہو نکو نام جو قبروں کی تجارت کر کے

کیا نہ بچو گے جو مل جائیں صنم پتھر کے؟

منفعت ایک ہے اس قوم کی، نقصان بھی ایک ایک ہی سب کا نبیؐ، دین بھی، ایمان بھی ایک

حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک؟

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں!

کیا زمانے میں پینے کی یہی باتیں ہیں؟

جا کے ہوتے ہیں مساجد میں صف آرا، تو غریب زحمتِ روزہ جو کرتے ہیں گوارا، تو غریب

نام لیتا ہے اگر کوئی ہمارا، تو غریب پردہ رکھتا ہے اگر کوئی تمہارا، تو غریب

امراءِ نشہ دولت میں ہیں غافل ہم سے

زندہ ہے ملتِ بیضا غربا کے دم سے

واعظِ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی برقِ طبعی نہ رہی، شعلہِ مقالی نہ رہی

رہ گئی رسمِ ازاں، روحِ بلالی نہ رہی فلسفہ رہ گیا، تلقینِ غزالی نہ رہی

مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے

یعنی وہ صاحبِ اوصافِ حجازی نہ رہے

شور ہے، ہو گئے دنیا سے مسلمان نابود ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مسلم موجود؟

وضع میں تم ہو نصاریٰ، تو تمدن میں ہنود یہ مسلمان ہیں! جنہیں دیکھ کر شرمائیں یہود!

یوں تو سید بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو

تم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

ہر کوئی مست مئے ذوقِ تن آسانی ہے تم مسلمان ہو؟ یہ اندازِ مسلمانی ہے؟

حیدری فقر ہے، نے دولتِ عثمانی ہے تم کو اسلاف سے کیا نسبتِ روحانی ہے؟

وہ زمانے میں معزز تھے مسلمان ہو کر

اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآن ہو کر

مغربی سامراج اور یورپی استعمار کی چیرہ دستیوں، ظلم و استبداد اور مسلمانوں سے

بالخصوص ظالمانہ سلوک کے بارے میں فرمایا:

عہدِ نو برق ہے، آتشِ زینِ ہر خرمن ہے ایمن اس سے کوئی صحرا، نہ کوئی گلشن ہے
اس نئی آگ کا اقوامِ کہن ایندھن ہے ملتِ ختمِ رُسلِ شعلہ بہ پیراہن ہے
آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

مغربی صنعتی ترقی کے بعد مغربی تہذیب کا جو سیلاب آرہا تھا وہ خدا شناسی اور اخلاقی
سے متعلق سب کچھ بہا کر لے جا رہا تھا دوسری قوم کو تو اس نئی تہذیب کو اختیار کرنے میں وقتی
طور پر کوئی عار تھا بھی تو ہو جلد کا فور ہو گیا مگر امتِ مسلمہ تو..... وارثتِ انبیاء کی نقیب ہے۔
چنانچہ طلوعِ اسلامِ نظم میں فرماتے ہیں:

خداے لم یزل کا دستِ قدرت تو، زباں تو ہے

یقین پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

مشرق کی اندھیری رات میں دھندلا سا ستارہ تو ہے

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا

لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

شب گریزاں ہوگی آخر جلوہ خورشید سے

یہ چمن معمور ہوگا نغمہ توحید سے

جوابِ شکوہ بھی اسلام کے شاندار مستقبل، عالمی غلبے اور احیائے خلافت کی نوید پر ختم ہوتی ہے۔

عقل ہے تیری سپر عشق ہے شمشیر تری

مرے درویشِ خلافت ہے جہانگیر تری

اور مسلمان کا فرض کیا ہے اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے وفاداری ہے۔

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں

یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

امتِ مسلمہ کی بیداری کے مقصد کو علامہ اقبال نے ہر ممکن پیرائے میں بیان کیا ہے اور

ابلاغ کا حق ادا کرنے کی سعی مشکور کی ہے۔ اُردو میں بچوں، جوانوں، بوڑھوں سب کے لئے پیغام ہے۔ فارسی میں علماء، صوفیاء اور دانشور طبقہ کے لئے، انگریزی میں جدید تعلیم یافتہ مغربی تہذیب کے دلدادہ حضرات کے لئے آساں پیرائے میں بھی اور فلسفیانہ انداز میں بھی آساں نثر میں اور فلسفہ کی زبان میں اپنا مدعا بیان کیا ہے۔

اسلام کی نشاۃ ثانیہ — نظام خلافت

نظام خلافت انسانی زندگی کے انفرادی کے ساتھ اجتماعی پہلوؤں کو بھی اپنے محیط میں لے لیتا ہے؛ اس لئے کہ اسلام پوری زندگی کا دین ہے اور دین کا تقاضا ہے کہ اس میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ (سورۃ البقرۃ - 208)۔ اجتماعی زندگی کے گوشوں میں دین کا غلبہ دورِ غلامی میں ایک خواب و خیال بن گیا تھا علامہ اقبال نے اسلامی شریعت کے نفاذ کے ساتھ سماجی میدان، معاشی میدان اور سیاسی میدان میں بھی اسلام کی تعلیمات پر عمل درآمد کو واضح فرمایا۔

دین کا تقاضا ہے کہ نماز کی طرح سماجی سطح پر بھی مسلمان مساوات کا مظہر ہوں۔

ع بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے

یا ع ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز

معاشی سطح پر نقد روپے کا منافع سود ہے اور اسلام میں حرام ہے جبکہ آج ساری معیشت

سود اور جواء (CHANCE MONEY) پر قائم ہے۔ سود کی برائی کو واضح فرمایا

س از ربا آخر چه می زاید؟ فتن

کس نداند لذتِ قرضِ حسن

ایک اور جگہ فرمایا کہ سود خور انسان درندہ بن جاتا ہے (انسانی خون چوستا ہے) بغیر

دانتوں اور درندوں والی آواز کے۔ اسی طرح زمین کا معاملہ ہے جاگیرداری (FEUDALISM)

ایک لعنت ہے اور اسلام سے پہلے بھی اور آج بھی دنیا پر مسلط ہے۔ جبکہ خلافت راشدہ میں اسے

ختم کر دیا گیا تھا اور عرصے تک مسلمان حکمرانوں کے ہاں نہیں تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں

عراق فتح ہوا تو اس کی زمینوں کے بارے میں یہی فیصلہ ہوا کہ یہ 'خراجی' زمینیں ہیں اور اجتماعی

ملکیت (STATE LANDS) ہیں کسی کی ذاتی ملکیت نہیں۔ چنانچہ فرمایا:

رزق خود از زمین بردن روا است

ایں متاع بندہ و ملک خدا است

یا منفی انداز گفتگو میں ابلیس کی زبان سے کہلوایا ہے کہ اسلام کے نظام خلافت کا مطلب جاگیرداری اور بادشاہت کا خاتمہ ہے۔

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب

پادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمین

اور تمام انسان اللہ کی مخلوق ہیں لہذا زمین سے ہر انسان کو رزق حاصل کرنے کا برابر کا حق حاصل ہے۔

سیاسی سطح پر کامل مساوات کا نظارہ دنیا اس طرح دیکھے کہ انسانوں پر انسان حاکم نہ بن بیٹھیں بلکہ اللہ کی حاکمیت کا تصور نظام خلافت کی روح رواں ہے۔ اللہ کے احکام اور اس کے پیغمبر حضرت محمد ﷺ کی تشریحات ہی قانون اسلامی کا منبع (SOURCE OF LAW) ہے۔ چنانچہ فرمایا:

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہتما کو ہے

حکمران ہے اک وہی باقی بتانِ آزری

اور سیاسی سطح پر ”لا الہ الا اللہ“ کا مطلب ”لا مملک الا اللہ“ فرماتے ہیں جب اللہ کے قانون پر عمل ہوگا تو اسی سے عدل و انصاف کا دور دورہ ہوگا۔ سماجی، معاشی اور سیاسی سطح پر یہ تصورات کسی معاشرے میں نمایاں ہوں اور انفرادی زندگی میں بھی لوگ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی فرماں برداری کر رہے ہوں تو..... یہ نظام خلافت ہے۔

اس نظام خلافت کے نفاذ کے لئے ایک ملک درکار ہے اور علاقہ ضروری ہے لہذا علامہ نے مسلمانوں کے لئے علیحدہ ملک پاکستان کا نظریہ پیش کیا۔ اس کے لئے قائد اعظم محمد علی جناح کو لندن سے بلا کر مسلمانان ہند کی قیادت کے لئے آمادہ کیا۔ ملک پاکستان صرف ایک زمین کا ٹکڑا نہیں (PIECE OF LAND) بلکہ اس ملک خداداد کو نظام خلافت کا گہوارہ بنانا ضروری ہے اور یہی علامہ اقبال کا مدعا تھا۔

اس ملک میں نظام خلافت کے لئے ایک انقلاب (بنیادی تبدیلی) کی ضرورت ہے
 سود کا خاتمہ ہو جائے، جاگیرداری کو جڑ سے اکھاڑ دیا جائے، انسانوں کے درمیان اونچ نیچ
 (ذات، برادری، نسل، پیشہ، حیثیت وغیرہ کی بنیاد) ختم کر دی جائے، یہ چیزیں صرف پہچان کے
 لئے باقی رہ جائیں..... حاکمیت اللہ کی ہو جائے اور انسانوں کے بنائے ہوئے قانون نہیں اللہ کا
 قانون نافذ ہو..... اس کے لئے بادشاہوں اور خدائی کے دعویداروں اور دوسرے نظاموں سے
 گلو خلاصی ضروری ہے۔ اس کام کے لئے سخت جدوجہد کی ضرورت ہے۔ ایسے مردان کار کی ضرورت
 ہے جو اس کو اپنی زندگی کا مشن بنائیں اللہ کی رضا کے لئے نکلیں اور دنیا سے ظلم نا انصافی کے خاتمے
 کے لئے اللہ کے بھیجے ہوئے نظام کو عام کریں۔ لوگوں میں شعور پیدا کریں لوگوں کو جمع کریں ان
 کی تربیت کریں ان کو باطل سے نکلوا دیں اور انقلاب برپا کر دیں اس سارے معاملے میں حضرت
 محمد ﷺ کی سیرت اور زندگی ہمارے لئے نمونہ ہے اور سخت مشقت اور محنت طلب کام ہے۔

بانشہ درویشی در ساز و دمام زن

چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن

یا جیسے اردو کا ایک اور شعر ہے

تو خاک میں مل اور آگ میں جل جب خشت بنے تب کام چلے

ان خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر

اس انقلاب اور اللہ کی حاکمیت کے لئے علامہ اقبال نے قرآن مجید پڑھنے اور عشق رسول ﷺ کا

درس دیا

وہ زمانے میں معزز تھے مسلمان ہو کر

اور تم خوار ہوئے تارک قرآن ہو کر

گر تو می خواہی مسلمان زیستن

نیست ممکن جز بقراں زیستن

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں

یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

اس انقلاب کے لئے مسلم نوجوان کو مخاطب کیا ہے۔

محبت مجھے ان نوجوانوں سے ہے

ستاروں پر جو ڈالتے ہیں کند

مسلمان بچوں کو فرماتے ہیں

نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر

تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

لب پہ آتی ہے دُعا بن کے تمنا میری

زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری!

میرے اللہ! برائی سے بچانا مجھ کو

نیک جو راہ ہو اُس راہ پہ چلانا مجھ کو

مسلمانوں کو مایوسی سے نکالا ہے اُمید اور حوصلہ دیا ہے اور اسلام کے غلبہ کی نوید سنائی ہے

آسماں ہوگا سحر کے نُور سے آئینہ پوش

اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغام سجود

پھر جبیں خاک حرم سے آشنا ہو جائے گی

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں

محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے

یہ چمن معمور ہوگا نغمہ توحید سے

نغمہ توحید ہی کے عام ہونے سے دنیا میں سماجی سطح پر مساواتِ انسانی کو فروغ ملے گا

معاشی سطح پر سود، جاگیر داری، جوا، سٹہ وغیرہ سے نجات اور سیاسی سطح پر ظلم و نا انصافی سے گلو خلاصی

حاصل ہو سکے گی۔

یہی علامہ اقبال کا پیغام ہے اور اسی کو عام کرنے کی ضرورت ہے دنیا اس وقت ظلم اور

نا انصافی سے بھرگئی ہے بے حیائی، بے راہ روی، سیکولرازم نے شرف انسانی کی جگہ حیوانیت کو عام کر دیا ہے۔ معاشی بد حالی، بے روزگاری اور محرومیاں دنیا کی کثیر آبادی کا مقدر ہیں۔ امن و آشتی، عدل و انصاف، کفالت عامہ کا تصور صرف خالق ارض و سماء کے قانون میں ہے اور اسی کی حاکمیت کے تحت ہی ممکن ہے۔

جوانوں کو مری آہ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
میرا نور بصیرت عام کر دے

علامہ اقبال کا ہم پر فرض یہی ہے کہ قرآن مجید کو اُمت کے موجودہ مسائل کا حل سمجھتے ہوئے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف رجوع کریں قرآن مجید کا پڑھنا پڑھانا عام کر دیں اور اس قرآن مجید کے دیے ہوئے نظام..... نظام خلافت کی جدوجہد میں اپنا تن من دھن لگا دیں تاکہ ایک طرف ہمارا رب اور اس کا رسول ﷺ ہم سے راضی ہو جائیں تو دوسری طرف دنیا خلافت راشدہ کے دور کی طرح امن و سکون کا گہوارہ بن جائے تاکہ ساری نسل انسانی اپنے رب کی بندگی کے دامن میں آسکے۔

علامہ اقبال کی تصنیفات

علم الاقتصاد (اُردو) نایاب ہے۔ فلسفہ ایران (انگریزی)۔ اسرارِ خودی (فارسی)۔
رموز بے خودی (فارسی)۔ پیامِ مشرق (فارسی)۔ زبورِ عجم (فارسی)۔ لیکچرز مدراس (انگریزی)۔
جاوید نامہ (فارسی)۔ بانگِ درا (اُردو)۔ بالِ جبریل (اُردو)۔ ضربِ کلیم (اُردو)۔ مسافر
(فارسی)۔ ”پس چہ باید کرو“ (فارسی)۔ ارمغانِ حجاز (فارسی و اُردو)۔



مصادر و مراجع

- قرآن مجید
- تفسیر عثمانی
- شاہکار اسلامی انسائیکلو پیڈیا مولفہ: سید قاسم محمود
- اردو معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور
- ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ مولفہ: ثروت صولت
- عظیم شخصیات کے آخری لمحات مولفہ: خواجہ طاہر محمود کوریجہ
- تاریخ المشاہیر مولفہ: قاضی محمد سلیمان منصور پوری
- جہانگیر سیریز انسائیکلو پیڈیا جنرل نانج عالمی معلومات۔ مولفہ: زاہد حسین
- انسائیکلو پیڈیا پاکستانیکا مولفہ: سید قاسم محمود
- منصب امامت مولفہ: شاہ اسماعیل
- شاہ اسماعیل شہید مولفہ: ڈاکٹر علامہ خالد محمود
- باغی ہندوستان مولفہ: مولوی فضل خیر آبادی
- غزوة الہند اور سلطان جہاں مولفہ: صدیق صادق
- مولانا محمد علی جوہر (حیات و خدمات) مولفہ: صابر ارشاد عثمانی
- شیخ الہند اور تنظیم اسلامی مولفہ: ڈاکٹر اسرار احمد
- وحدت امت مولفہ: مولانا محمد شفیع
- خودنوشت سوانح حیات مولانا حسین احمد مدنی
- بیس بڑے مسلمان مولفہ: عبدالرشید ارشد
- یاد رفتگان مولفہ: سید سلیمان ندوی
- مسلمانوں کی موجودہ پستی کا واحد علاج

امامت

تو نے پوچھی ہے امامت کی حقیقت مجھ سے
حق تجھے میری طرح صاحبِ امر کر کے
ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزاد کرے
موت کے آتنے میں تجھ کو دکھا کر سُخ دوست
زندگی تیرے لیے اور بھی دشوار کرے
دے کے احساسِ زبیاں تیرا لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے
فِتْنَةُ مَلْتِ بیضا ہے امامت اس کی
جو مسلمانوں کو سلاطین کا پرستار کرے
علامہ اقبال

الْحَمْدُ لِلَّهِ

مکتبہ قرآن اکیڈمی جھنگ
کی مطبوعات

● خیریتِ تعلّم و تعلیم قرآن مجید

16/- اور ہماری ذمہ داریاں

● جنوبی ایشیا میں مسلم بیداری کے سو سال

300/- (1910ء-2010ء)

● یا جوج ماجوج؟

220/-

● 21 اسلامی انقلابی شخصیات (حصہ اول)

120/-

● 21 اسلامی انقلابی شخصیات (حصہ دوم)

130/-

● 21 اسلامی انقلابی شخصیات (حصہ سوم)

120/-

● 21 اسلامی انقلابی شخصیات (مکمل)

370/-

● صہیونیت کیا ہے؟ (قرآن مجید کی روشنی میں) زیر طبع

جھنگ

قرآن اکیڈمی

مکتبہ

047-7630861
047-7630863

لالہ زار کالونی نمبر 2، ٹوبہ روڈ، جھنگ

انجمن خدام القرآن مجھنگ
کی سرگرمیاں اور منصوبہ جات

ماہنامہ
حکمتِ بالغہ

جدید تعلیم یافتہ حضرات میں علوم قرآنی کے فروغ کا قیام

آستانِ عربی کلاسیں
(12 صفحے کا کورس)

کل وقتی

25

پھر سوئے حرم لے چل

ہر سال تین کورسز مئی، جون، جولائی کے مہینے میں منعقد ہوتے ہیں

ہر سال رمضان المبارک میں
تراویح کے ساتھ مکمل قرآن مجید کا ترجمہ
پوسٹ گریجویٹ طلباء کے لئے فری ہوٹل

عمر بن عبدالعزیز الامام الوحیفہ امام احمد بن حنبل امام غزالی شیخ عبدالقادر جیلانی صلاح الدین ایوبی

بعد اور قیامِ پاکستان سے پہلے کی

اسلامی انقلابی شخصیات

21

تعارف، کارنامے، ملی خدمات

مکتبہ

انجینئر مختار فاروقی

جھنگ

قرآن اکیڈمی

مکتبہ

علامہ محمد اقبال مولانا محمد علی جوہر مولانا محمد الیاس